سلسلہ مطبوعات انجمن ترقی اردو ہند نمبر ۲۲۷

اند پارسا

از

جناب رئیس احمد جعفری صاحب ندوی

ایڈیٹر روزنامہ ہندوستان بمبئی

سلسلۂ مطبوعات انجمنِ ترقیٔ اُردو (ہند) نمبر ۱۲۰

رِندِ پارسا

از

جناب رئیس احمد صاحب جعفری (ندوی)
ایڈیٹر روزنامہ "ہندستان" بمبئی

شائع کردہ

انجمنِ ترقیٔ اُردو (ہند)، دہلی

۱۹۴۵ء

طبع اوّل

قیمت مجلد ... بلا جلد ...

عنوان

سلسلہ مطبوعات انجمن ترقی اُردو (ہند) نمبر ۲۲۰

رِندِ پارسا

حضرت ریاض خیرآبادی کے حالات، سوانح
حوادثِ زندگی اور اُن کے کردار کا ایک مجمل مرقع
نیز ان کی شاعری منظومات کی شانِ نزول
اور طرزِ کلام پر ایک مختصر تبصرہ!

از

جناب رئیس احمد صاحب جعفری (ندوی)

ایڈیٹر روزنامہ "ہندوستان"، بمبئی

شائع کردہ
انجمنِ ترقیِ اُردو (ہند) دہلی

طبع اول ۱۹۴۵ء

قیمت مجلد عہ بلا جلد للعہ

فہرستِ مضامین

سخن ہائے گفتنی!

آج سے چند برس پہلے تک اقلیم شعر و سخن میں ریاض کا سکّہ چل رہا تھا، ریاض کی شوخی اور بے باکی، اندازِ بیان اور اس کا بانکپن، شاعری اور اس کا لوچ، ترکیب کی شستگی، زبان کی حلاوت، اصنافِ شاعری میں اس کی مہارت، خمریات میں اس کی ادائے خاص، یہ سب چیزیں اصولِ موضوعہ کی طرح بزم و انجمن میں، شعرا کی مجلس میں اور سخن فہموں کی محفل میں، نئی روشنی کے گروہ میں اور قدامت پرستوں کی جماعت میں، ادیبوں اور انشا پردازوں کے گوشۂ عافیت میں، نقّادوں اور فن کاروں کے حلقۂ احتساب میں، علما کے ممبروں، مشائخ کے زاویوں اور صوفیا کے حلقوں میں معروف تھیں۔

ریاض کا انتقال ہوگیا، ان کی شاعری کا وہ نقش جو ان کی زندگی میں قائم تھا اب دھندلا ہوتا جا رہا ہی، شاید وہ زمانہ جلد آجائے کہ لوگ اسی طرح اسے فراموش کر دیں جس طرح آج بہت سے وہ نغز گو اور نکتہ سنج —— جو اپنے عہد میں جانِ سخن کا درجہ رکھتے تھے آج صرف تذکروں کے اوراق اور تاریخ کے صفحات میں نظر آتے ہیں مگر ان کی شخصیت فنا ہو چکی ہی، ان کا

پیام فراموش ہو چکا ہی، ان کی رُوحِ سخن صفحۂ ادب سے حرفِ غلط کی طرح مِٹ چکی ہی۔

ذوقِ سخن کے اس انقلاب و تغیّر اور اس کے اسباب و عوامل پر سرِ دست گفتگو مقصود نہیں، لیکن ریاضؔ کی زندگی کا ایک اور رُخ بھی تھا، میری مُراد ان کی دِل رُبا شخصیت سے ہی، آج اگر ریاض الاخبار کے وہ فائل معدوم کر دیے جائیں جو ادبِ عالیہ کی رُوح ہیں، فتنہ اور عطرِ فتنہ کے وہ نسخے دریا بُرد کر دیے جائیں جو طنزِ لطیف اور سنجیدہ شوخی کے لازوال نمونے ہیں، حرم سرا اور ان کے دُوسرے اپنائے ہوئے ناول اس طرح غائب ہو جائیں کہ اُن کا سُراغ نہ لگ سکے اور جو اپنی زبان، بیان اور طرزِ ادا کے اعتبار سے ناول نویسی اور داستاں سرائی کی جان ہیں، ان کا وہ ضخیم لیکن نامکمّل دیوان جسے قاضی تلمّذ حسین نے بڑی عرق ریزی اور دیدہ کاری سے شائع کیا ہی، کسی حادثۂ ارضی یا سماوی کی وجہ سے خدانخواستہ نایاب ہو جائے جو اپنی شوخیِ گفتار، حُسنِ بیان، شگفتگیِ زبان اور مخصوص خمریات کے اعتبار سے اپنا جواب نہیں رکھتا تو بھی ریاضؔ کی شخصیت زندہ رہے گی، ان کے دیکھنے اور پہچاننے والے ان کی پرستش کرتے رہیں گے، وہ ان کا بانکپن، وہ ان کی وضع داری، وہ ان کی خودداری، وہ ان کی شوخی میں سنجیدگی اور سنجیدگی میں شوخی، وہ ان کا پاکیزہ کردار، وہ ان کی شان دار، پُرشکوہ اور جاذبِ نظر صوُرت، وہ ان کی معصوم، بے داغ اور سراپا نور سیرت، وہ ان کا باوقار بڑھاپا، وہ ان کی شان دار جوانی،

وہ زبان سے ان کا بادہ وجام سے عشق، وہ لب ودہن سے ساغرو مینا سے ان کا زاہدانہ اجتناب، ان حقائق کو اگر کوئی بھلانا بھی چاہے تو کیوں کر بھلائے؟ ؎

گرچہ تھے صفحۂ ہستی پہ ہم اک حرفِ غلط
لیک اُٹھے بھی تو اک نقش بٹھا کے اُٹھے

وہ ایک بلند پایہ انشا پرداز تھے، ایک زندۂ جاوید شاعر تھے، ایک بہترین طنز نگار تھے، یہ ممتاز اور نمایاں حیثیتیں ان کی شخصیت کے آگے ماند پڑ جاتی ہیں، وہ بہ حیثیت شخص کے، بہ حیثیت انسان کے، بہ حیثیت فرد کے بھی بہت کچھ تھے، ایسے کچھ تھے جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

دنیا نے ریاض کی قدر جہاں تک داد وتحسین کا تعلق ہے، خوب کی، جب انھوں نے ریاض الاخبار نکالا تو آسمانِ صحافت پر وہ آفتاب بن کر چمکے، جب انھوں نے پوری فتنہ سامانیوں کے ساتھ فتنہ نکالا تو دنیا ان کے اچھوتے طرزِ بیان، ان کی شوخ زبان اور میٹھی چٹکیوں پر عش عش کر اٹھی، جب انھوں نے شاعری کے میدان میں قدم رکھا تو اسیر اور امیر داغ اور جلال کا طوطی بول رہا تھا، لیکن بہت جلد وہ اس منزل پر پہنچ گئے جو اس کش مکش کی دنیا میں کم خوش بختوں کو حاصل ہوتی ہے، وہ حاسد نہیں تھے لیکن محسود بن گئے۔ رفتہ رفتہ وہ ایک طرزِ خاص کے موجد تسلیم کر لیے گئے۔ وہ طرزِ خاص جس کے موجد بھی وہی تھے۔ اور خاتم وہی رہی ؎

ہندوستاں میں دھوم ہے کس کی زبان کی
وہ کون ہے ریاضؔ کو جو جانتا نہیں؟

اُن کے اِن خصائص سے دُنیا اس لیے واقف ہوئی کہ ان کی طبع موزوں اور فکرِ بہار آفریں کے مرقعے اور نمونے پبلک کے سامنے آتے رہتے تھے۔

لیکن وہ بزم و انجمن کے آدمی نہیں تھے، انھیں گوشۂ تنہائی مرغوب تھا، امرا کی حویلیوں، بادشاہوں کے درباروں، زرداروں کی کوٹھیوں اور اربابِ جاہ و ثروت کے دولت کدوں کا طواف کرتے وہ کبھی نہیں دیکھے گئے۔ وہ دیر آشنا بھی تھے، گھُل مل کر کم لوگوں سے ملتے تھے، ان کی شخصیت کا اصل جلوہ گھر ہی میں دیکھا جا سکتا تھا، ان سطروں کا لکھنے والا اس سعادت سے بہرہ ور ہے، اسی لیے وہ اس کی جُرأت کر رہا ہے، وہ ان کی زندگی کا وہی رُخ پیش کرنا چاہتا ہے جو نگاہِ عام سے مخفی تھا!

ریاضؔ نے جس فضا میں آنکھیں کھولیں، پروان چڑھے اور زندگی کی بہار دیکھی، وہ آج کی فضا سے بہت مختلف تھی۔ ۱۸۵۷ء کے غدر نے ہماری حکومت اور دبدبے کا تختہ اُلٹ دیا تھا، لیکن وہ ہماری اس ثقافت، اس تہذیب اور اس آن بان کو نہ مٹا سکا جو صدیوں میں منجھ منجھا کے بنی تھی، جس کی تشریح لفظ و عبارت کی مدد سے نہیں کی جا سکتی، ہاں اس کا مرقع کھینچا جا سکتا ہے، بعض مسائل ایسے ہوتے ہیں جن کی تشریح تقریروں اور پُرزور تحریروں سے نہیں ہو سکتی، ان کی بہترین

تشریح "میجک لینٹرن" سے کی جا سکتی ہے۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ یہ مختصر سی کتاب اس دَورِ بہار کی "میجک لینٹرن" بن جائے۔

عہدِ ریاض کی تہذیب، تمدن، ثقافت، معاشرت، آن بان، سج دھج اور بانکپن کا یہ مرقع نا تمام رہے گا، اگر ضمناً ان شخصیتوں اور ہستیوں پر گفتگو کر کے ان کا بھی ایک مختصر سا خاکہ نہ پیش کیا جائے جن کا اس سلسلے میں ذکر ناگزیر ہے۔ اسی طرح ان کے عہد کے ادبی ارتقا کا تذکرہ نامکمل رہے گا، اگر ان اخبارات و رسائل کا ذکر نسبتاً وضاحت سے نہ کیا جائے جو ان کے زمانے میں خاص منزلت رکھتے تھے، لیکن اب جنھیں کوئی جانتا بھی نہیں، یہ چیزیں شاید کسی کو موضوع سے غیر متعلق نظر آئیں، اسی لیے پیش بندی کے طور پر یہ توجیہ عرض کر دی گئی۔

یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ انسان نام ور، معزز اور بڑے لوگوں کے حالات کا جویا رہتا ہے، بلکہ سچ پوچھیے تو انسانی فطرت بھی ہے کہ وہ اپنی برادری کے حالات و وقائع کا شائق رہتا ہے۔ ناول اور افسانے کی مقبولیت کا راز یہی ہے، بہت سے واقعات ہم پر گزرتے ہیں، ہمارے سامنے پیش آتے ہیں، ہم معلوم کرنا چاہتے ہیں یہ کیفیت اگر دوسروں پر طاری ہوئی ہوتی تو وہ کیا کرتے؟ جن پر طاری ہوئی، انھوں نے کیا کیا؟ واقعہ ایک ہوتا ہے، اس کے اثرات، نتائج اور تعبیریں مختلف ہوتی ہیں، یہ شوق بڑے آدمیوں، ادیبوں، انشا پردازوں اور شاعروں کے باب میں خاص طور پر بڑھ جاتا ہے، وہ گھر میں کس طرح رہتے تھے؟ بیوی سے کس طرح

پیش آتے تھے؟ بچوں سے ان کا کیا سلوک تھا؟ معاصرین کے سامنے وہ کس طرح آئے تھے؟ دوستوں سے ان کا برتاؤ کیا تھا؟ ہمسایوں سے وہ کس طرح نباہ کرتے تھے؟ دشمنوں کا مقابلہ کس طرح کرتے تھے؟ کامیابیوں پر اظہارِ مسرت کس طرح کرتے تھے؟ ناکامیوں پر رنج دغم کا مظاہرہ کس طرح کرتے تھے؟ ہنسنے اور رونے میں ان کی ادائے خاص کیا تھی؟ ہجومِ افکار میں، طعنِ اغیار میں، مخالفوں کی یلغار میں ان کی وضع قطع کیا ہوتی تھی؟ بے تکلف مجلسوں اور باوقار درباروں، نجی صحبتوں اور خاص محفلوں میں ان کا کیا رنگ نظر آتا تھا؟ ملازموں سے ان کا معاملہ کیا تھا؟ انھوں نے کبھی عشق کیا یا نہیں؟ اگر کیا تو ہجر کی راتیں کس طرح کاٹیں؟ وصل کے دن کیوں کر گزارے؟ تاک جھانک کی یا نہیں؟ رمز و کنایے سے کام لیا یا نہیں؟ قاصد درمیان میں آیا یا نہیں؟ اور اگر عشق، عشقِ ناکام رہا، تو یہ صدمہ سہا کس طرح؟ یہ اور اسی طرح کے بہت سے سوالات ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں۔ طبیعت ان سے جواب باصواب کی متلاشی رہتی ہے، اسے کرید رہتی ہے کہ یہ رازِ نہاں موضوعِ انجمن بنے!

ریاض کی زندگی میں یہ سب سوالات پیش آئے اور انھوں نے اپنے مخصوص کردار کے ساتھ ان کا جواب بھی دیا، میں اس کا قائل نہیں کہ کچھ کہا جائے اور کچھ نہ کہا جائے، کچھ باتیں صاف صاف کہی جائیں اور کچھ چھپا چھپا کر، میں تو

اس کا قائل ہوں کہ ہیرو کی زندگی کا ہر ورق سامنے رکھ دیا جائے، عیب اور ہنر بھی، صواب بھی اور خطا بھی، بہترین بھی اور بدتر بھی۔ انھوں نے عشق بھی کیا، جرأتِ رندانہ سے بھی کام لیا، بے حد حسین تھے، چاہے بھی گئے ؎

چھیڑ کیسی، بات کہتے رُوٹھ جاتے ہیں ریاضؔ
اک حسیں ہر وقت ہو، ان کے منانے کے لیے!

ان کی رومانی زندگی بڑے دل چسپ اور عبرت انگیز پہلو اپنے اندر پنہاں رکھتی ہی، کیوں نہ انھیں بھی بیان کیا جائے؟

ریاضؔ کی شاعری، انشا پردازی اور صحافت یہ تین اہم موضوع ہیں، لیکن یہ وہ عنوانات ہیں جن پر ہر وقت لکھا جا سکتا ہی، آج بھی اور دس برس بعد بھی، لیکن ریاضؔ بہ حیثیت ریاضؔ کے کیا تھے؟ ان کی شخصیت کیا تھی؟ ان کی زندگی کیا تھی؟ ان کا طرزِ ماند و بود کیا تھا؟ ان کا رکھ رکھاؤ کیسا تھا؟ ان کی گفتار کیا تھی؟ ان کا کردار کیا تھا؟ وہ گھر میں کیا تھے اور گھر سے باہر کیا تھے؟ یہ وہ عنوانات ہیں جن پر اب سے آٹھ نو سال پہلے لکھا جاتا تو اچھا ہوتا، اب بھی اگر لکھ لیا جائے تو غنیمت ہی اور اگر کچھ مدت اور بیت گئی تو اندیشہ ہی کہ مرورِ ایام اور حوادثِ دہر سے وہ نقوش مِٹ نہ جائیں جو ابھی تک صفحۂ قلب پر مرتسم ہیں، لہٰذا انتظار کیوں کیا جائے؟ جو کچھ آج ہو سکتا ہی، اسے آج ہی کیوں نہ کر ڈالا جائے؟

اس کتاب میں جن واقعات وحکایات کا تذکرہ ہی ان کا

بڑا حصّہ تو چشم دید ہی، کچھ خود ریاضؔ صاحب کی زبان سے سنا ہوا ہی، ایک حصّہ ایسا بھی ہی جسے ان کے قریب ترین دوستوں، عزیزوں، باہم نشینوں سے سنا ہی، ایسے واقعات بھی ہیں جن کا اس کتاب میں ذکر ہی لیکن جو اُس وقت پیش آئے تھے، جب ان سطروں کا راقم، عالمِ وجود میں بھی نہیں آیا تھا، یہ واقعات گھر کے بڑے بوڑھوں سے سُنے ہیں، اس لیے ان کے معتبر و مستند ہونے میں شبہ نہیں۔

ریاضؔ کی شاعری کا ایک حصّہ واقعاتی شاعری پر مشتمل ہی یہ اشعار ان مواقع پر کہے گئے ہیں جنھوں نے ان کی زندگی کے دھارے کا رُخ بدل دیا یا جو ان کی زندگی کے کسی خاص واقعے سے متعلق ہیں، ان کی تشریح کر دی گئی ہی، خاص خاص قصائد یا منظومات کی "شانِ نزول" بھی بیان کر دی گئی ہی۔ آخر میں ان کی شاعری پر تبصرہ بھی ہی، جو ان کے کلّیات کی اشاعت کے بعد دہلی کے رسالہ ساقی میں شائع ہوا تھا اور جسے ضروری حذف و اضافے کے بعد اس کتاب میں شامل کر دیا گیا ہی۔

جو واقعات سُپردِ قلم کیے گئے ہیں، ان کی تحقیق و استناد میں مورخانہ کاوش سے کام لیا گیا ہی، یعنی اپنے طور پر پورا اطمینان کر لیا گیا ہی کہ وہ غلط نہ ہوں، یا ان میں مبالغے سے کام نہ لیا گیا ہو، پھر بھی اگر کوئی غلطی رہ گئی ہو تو اسے مقتضائے بشریت سمجھا جائے۔

اپنے عزیز دوست نثار احمد صاحب عارف کا شکریہ خاص طور پر ادا کرنا ہی جنھوں نے بعض اہم تراشے فراہم کیے۔

رئیس احمد جعفری
ایڈیٹر روزنامہ "ہندوستان"
بمبئی نمبر ۸

(۱)

سنہ ۱۹۱۸ء میں میرے والد کا انتقال ہوا، میری عمر اس وقت سات آٹھ برس سے زیادہ نہ تھی، ہم لوگ سیتاپور میں رہتے تھے، تعزیت اور پُرسے کے لیے ہمارے ننھیال خیرآباد سے بہت لوگ آئے، انھی آنے والوں میں ایک صاحب درانہ گھر میں گھس آئے۔ والدہ نے انھیں دیکھا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں، یہ بھی بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہے تھے، اچھا خاصا لمبا تڑنگا قد، گورا رنگ، سفید داڑھی، ایک انگرکھا پہنے ہوئے، بڑے پائنچوں کا پاجامہ، سر پہ بید کی جالی دار ٹوپی، یہ والدہ کے اور ان کی تقلید میں ہم سب کے "بڑے بابا" تھے، ہمارے نانا سید نیاز احمد صاحب انسپکٹر حلقہ (میرٹھ) کے بڑے بھائی حضرت ریاضؔ!

والد کے انتقال کے بعد ہفتے میں کم از کم دو بار بڑے

بابا خیرآباد سے سیتاپور ضرور آتے تھے۔ والدہ ان کے کھانے کا بہت خیال رکھتی تھیں جس روز وہ آنے والے ہوتے، وقت پر کھانا تیار کر کے بڑے اہتمام سے رکھ دیا جاتا، مَیں نے حیرت سے دیکھا وہ گھی پڑی ہوئی ارہر کی دال کے ساتھ برفی بڑے شوق سے کھاتے تھے، بالخصوص ان کے کھانے میں یہ دو اجزا ضرور ہوتے تھے۔

ایک روز وہ سہ پہر کو تشریف لائے، صحن میں سایہ آ چکا تھا، وہیں چارپائی پر لیٹ گئے، پاس ایک چوکی پڑی تھی، والدہ اس پر بیٹھی ہوئی، ان سے باتیں کر رہی تھیں، مَیں بھی ان کے قریب بیٹھا تھا، بُھنے ہوئے چنے میرے ہاتھ میں تھے اور مَیں ان سے شغل کر رہا تھا، بڑے بابا نے کہا:

"ہمیں بھی کھلاؤ، یہ اکیلے اکیلے؟"

مَیں نے سن رکھا تھا، کبھی کسی سے کوئی کھانے پینے کی چیز نہ مانگنی چاہیئے، یہ بدتمیزی ہے۔ ان بڑے میاں کو چنے مانگتے جو مَیں نے دیکھا، بُرا معلوم ہُوا، سارے چنے مَیں نے ان کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ مَیں نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا "بڑے بدتمیز ہیں، چنے مانگ کر کھاتے ہیں" میرا یہ ریمارک دونوں نے سُن لیا، مَیں پٹتے پٹتے بچا، بڑے بابا نے مسکرا کر عارفانہ انداز میں گردن ہلائی، گویا وہ کہہ رہے تھے "جیت ہماری ہی رہی!"

(۲)

سیتاپور سے اس زمانے میں ایک ماہوار ادبی صحیفہ گلچیں

نکلا کرتا تھا۔ حضرت وسیم خیرآبادی ایڈیٹر تھے اور نگراں حضرت ریاض تھے، ایک چھوٹا سا دستی پریس بھی تھا، امیرالمطابع! اسی میں گلچیں چھپا کرتا تھا۔

امیرالمطابع میں وسیم صاحب تقریباً روز تشریف لاتے تھے یہ حضرت ریاض کے بہنوئی تھے، قدیم وضع و معاشرت کی جیتی جاگتی مورت، غرارے دار پاے جامہ، دوپلی ٹوپی، رنگین اچکن، کاندھے پر ایک بڑا سا رومال جس کے ایک کونے میں بٹوے کی ڈوری بندھی ہوتی، بٹوے کے اندر چھالیہ، تمباکو، الائچی اور کتھے چونے کی ایک ڈبیہ۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ بٹوہ کھولتے اور ان چیزوں سے کام و دہن کو لذت یاب کرتے، وہ ٹہلنے کے بہت عادی تھے، گھر کے اور پریس کے برآمدے میں مسلسل چہل قدمی کیا کرتے اور "تمباکو" کھایا کرتے۔

سادگی و معصومیت، قابلیت اور شرافت ان کے امتیازات خصوصی تھے۔ جب تک ریل جاری نہیں ہوئی تھی، سفر کے مرحلے بگھیوں، بیل گاڑیوں اور اونٹ گاڑیوں کے ذریعے طے ہوتے تھے۔ ایک دفعہ ریاض صاحب اور وسیم صاحب ہم سفر تھے، رات کا وقت تھا کہ چند ڈاکوؤں نے گاڑی کو گھیر لیا، مسافر اتر پڑے اور ان کی تلاشیاں ہونے لگیں۔ جو کچھ جس سے ملتا، ڈاکو اس پر قبضہ کر لیتے۔ ریاض صاحب کے پاس کچھ گنیاں تھیں جو ان کے لبادے میں سلی ہوئی تھیں، کچھ گنیاں انھوں نے اپنے جوتے کے اندر رکھ لی تھیں۔ وسیم صاحب

کے لبادے میں اشرفیاں سلی ہوتی تھیں انھوں نے اپنی جیب میں رکھ لی تھیں، ڈاکوؤں نے ان سے پوچھا مال کہاں ہے؟ انھوں نے جیب کی طرف اشارہ کر دیا۔ انھوں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور اشرفیاں نکال لیں، جلدی میں مکمل تلاشی نہ لے سکے، دو ایک باقی رہ گئیں۔ جب لوٹ لاٹ کے ڈاکو جانے لگے تو وسیم صاحب کا ہاتھ جیب میں گیا، دیکھتے کیا ہیں، دو اشرفیاں پڑی ہوتی ہیں، فوراً آگے بڑھے اور ڈاکوؤں کو یہ نذرانہ بھی پیش کر دیا۔

قدیم دولت مند گھرانے کے اِکلوتے فرزند تھے اس لیے بڑی آؤ بھگت ہوتی تھی، با اصول بھی بہت تھے۔ پہلے زمانے میں شیعوں اور سنیوں میں مخلوط شادیاں ہوا کرتی تھیں، ہمارا آدھا خاندان شیعہ تھا، آدھا سُنّی، میاں شیعہ ہے تو بیوی سُنّی، شوہر سُنّی ہے تو بیوی شیعہ، اختلافِ عقائد کے باوجود گھر جنّت کا نمونہ بنا رہتا تھا۔ وسیم صاحب کا خاندان بھی شیعہ تھا، ریاض صاحب کی والدہ شیعہ تھیں، ریاض کے والد سیّد طفیل احمد صاحب انگریزی کے حرف شناس بھی نہ تھے مگر پولیس کے بلند تر عہدوں پر فائز ہوتے۔ وہ کٹّر سنّی تھے ان شیعہ سُنّی میاں بیوی کی حکایاتِ محبّت آج تک زباں زد ہیں، حالاں کہ دونوں اپنے عقائد پر سختی سے قائم تھے ٹیں کہہ یہ رہا تھا کہ وسیم صاحب شیعہ تھے، لیکن اپنے ذاتی رُجحان کی بنا پر سُنّی ہو گئے۔ ان کی جدّۂ محترمہ زندہ تھیں.

والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔ جایداد کا بڑا حصہ غدر کے بعد سوختت ہو چکا تھا لیکن نقد، سامان، ظروفِ نقرئی وطلائی، زیورات کا بڑا ذخیرہ اب تک موجود تھا اور یہ سب ان کی جدّہ کے قبضے میں تھا۔ وہ یہ خبر سُن کر کہ "عسکری (وسیم صاحب کا نام) سنّی ہو گیا" بہت برہم ہوئیں اور محض اس جرم میں انھوں نے اپنے چہیتے نواسے کو تباہ و برباد کر دیا۔ تمام چیزیں رفتہ رفتہ غیروں اور دشمنوں کو عطا کر دیں، نائنوں، بھنگنوں اور ماماؤں کو انھوں نے اشرفیوں سے نوازا، وہ چاہتی تھیں جو کچھ گھر میں ہے، سب کچھ لُٹا دیں لیکن "وسیم" کو فائدہ نہ اُٹھانے دیں۔ بے چارے وسیم صاحب چشمِ تماشا سے یہ سب کچھ دیکھتے رہے مگر کچھ نہ بولے، ان کی حیثیت صرف ایک خاموش تماشائی کی تھی، البتہ اپنے نئے عقیدے پر وہ مضبوطی سے قائم تھے۔

آخر میں ان کی مالی حالت سقیم ہو گئی، اسی دَورِ عسرت میں انھوں نے اپنا ایک نہایت قیمتی سرمایہ "پارۂ عم" جو حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے مخطوطے کی حیثیت سے ان کے خاندان میں نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتا چلا آیا تھا، سرپرستی کی ایک امید میں گورکھپور کے رئیس مولوی سبحان اللہ خاں کو نذر کر دیا، جس سے انھوں نے اپنے کتب خانے کو زینت دی۔ یہ ہندستان کا نادر ترین کتب خانہ تھا، موصوف نے بعد میں مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کو کتابیں عطا کر دیں، اس ذخیرے میں شاید وہ

بھی ہو۔

وسیم صاحب امیرالطابع میں کام کی نگرانی کیا کرتے تھے اور ریاضؔ صاحب اپنے ساتھ اخبارات و رسائل کا ایک پلندہ لے کر ہمارے گھر آجاتے تھے۔ سب سے پہلے میری نگاہیں "زمانہ" کو دیکھتی تھیں، اس میں ایک تصویر ضرور ہوتی تھی۔ گلچیں کا تازہ پرچہ بھی وہ اپنے ساتھ لاتے تھے، اس کے سرورق پر ایک شعر درج رہتا تھا، جس کا مطلب اس زمانے میں تو بالکل سمجھ میں نہیں آتا تھا لیکن دیکھتے دیکھتے یاد ہو گیا تھا اور اب تک یاد ہے:۔

میری قسمت سے الٰہی پائیں یہ رنگِ قبول
پھول میں نے کچھ چُنے ہیں ان کے دامن کے لیے

(۳)

۱۹۱۹ء میں سید نیاز احمد صاحب کو حکومت کی ملازمت سے پنشن مل گئی اور وہ بھوپال میں سپرنٹنڈنٹ پولیس مقرر ہو گئے۔ طے ہوا کہ ہم لوگ بھی وہیں چلے جائیں۔

حسبِ معمول مجھے حافظ "کلّو" صاحب قرآن شریف پڑھا رہے تھے، ریاضؔ صاحب انھیں بہت مانتے تھے۔ جب آتے ان سے ضرور ملتے۔ کہنے لگے "رئیسؔ تو بھوپال جا رہا ہے!" حافظ جی کا چہرہ اُتر گیا، ہمارا گھر ان کی زندگی کا آخری سہارا تھا، مجھے ان کی حسرت آمیز مسکراہٹ اب تک یاد ہے، بڑے بابا بھی متاثر ہوئے، انھوں نے کہا "آپ نہ گھبرایئے میں آپ کا کوئی

نہ کوئی بندوبست کر دوں گا" ان الفاظ سے شاید وہ مطمئن تو ہو گئے، لیکن ان کی افسردگی بدستور قائم رہی!

ذرا حافظ کلّو کا تعارف بھی کرا دوں۔ یہ ہمارے مردانہ مکان میں رہتے تھے۔ نابینا اور اس وقت بہت بوڑھے تھے، غصّہ تو ناک پر رکھا رہتا تھا، رنگ اتنا سیاہ جیسے توے کی سیاہی، بالکل اسم بامسمّیٰ تھے، دل اتنا صاف جیسے چودھویں کا چاند، بڑے خوش طبع، بذلہ سنج، یار باش اور ذہین آدمی تھے، چارپائی اتنی اچھی بُنتے تھے کہ کیا کوئی ان کا مقابلہ کر سکے گا، موزوں طبع اور تعلیم یافتہ بھی تھے، چائے بہت پیتے تھے۔ مَیں نے ایک دفعہ کہا "حافظ جی! آپ اتنی چائے کیوں پیا کرتے ہیں؟" دوسرے روز کسی وجہ سے انھوں نے چائے نہیں پی۔ مَیں نے پوچھا "آج آپ نے چائے کیوں نہیں پی؟" مسکراتے ہوئے ہونٹ ہلے، پھر فرمایا:

دے دیا استعفا مَیں نے چائے سے
اے رئیس احمد تمھاری رائے سے

ہمارے پڑوس میں ایک پٹھان رہتے تھے، بڑے بھاری بھرکم، پُر رعب اور وجیہ آدمی تھے۔ لوگ انھیں "بابو جی" کہا کرتے تھے، محکمۂ کورٹ آف وارڈس میں ایک اعلا عُہدے پر ممتاز تھے۔ بہت جلد محلّے کے غریب اور جاہل طبقے پر انھوں نے اپنا رُعب قائم کر لیا۔ ایک دفعہ وہ کسی آدمی پر خفا ہو رہے تھے، حافظ جی تک اُن کی پُرجلال آواز پہنچی، انھوں

"جی ہاں!" تبسم کیا اور فرمایا ؎
نے کہا "یہ بابو جی ہیں؟" مَیں نے

چو بابو بہ یک نقطہ بابو شود
لگامش بدہ تا کہ قابو شود

تھوڑی دیر کے بعد بابو جی ہمارے کمرے میں آکر بیٹھ گئے۔ مَیں نے ان کی تواضع اسی تازہ بہ تازہ نو بہ نو شعر سے کی، کہنے لگے:

"یہ کیا بکتے ہو؟ کس گدھے کا شعر ہے؟"

"حافظ جی کا!"

"حافظ کلّو کا؟"

"جی ہاں!"

"کیوں حافظ جی؟"

حافظ جی کے چہرے کا ایک رنگ آرہا تھا ایک جا رہا تھا، وہ کچھ نہیں بولے، مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے رہے، بابو جی برہمی کے عالم میں اٹھ کر چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد، میرے اور حافظ جی کے مابین کیا گزری؟ کیا اسے بتانے کی ضرورت ہے؟

ایک دفعہ گرمی کے موسم میں وہ اِملی کے درخت کے نیچے جو ہمارے احاطے میں واقع تھا، مجھے پڑھا رہے تھے۔ پاس ایک چارپائی پڑی تھی، اس پر حافظ جی کے ایک بے تکلف دوست سو رہے تھے، حافظ جی نے ان کے متعلق مجھ سے پوچھا

"کیا وہ چلے گئے؟"
"جی نہیں سو رہے ہیں!"
"ذرا جگاؤ تو"
"رومال کھینچے لیتا ہوں جاگ جائیں گے"
"اچھا رومال بھی اوڑھے ہوتے ہیں؟"
"جی نہیں صرف منھ پر پڑا ہے!"
"اچھا یہ بات ہے:

رومال منھ پہ ڈال کے لیٹے ہیں باغ میں
تا بوئے گل چھنی ہوئی پہنچے دماغ میں

سونے دو!"

(۴)

ہم لوگ بھوپال گئے، وہاں کی آب و ہوا راس نہ آئی، چند روز کے بعد واپس آگئے، اب کی سیتاپور کے بجائے خیرآباد میں بڑے بابا کے زیرِ سایہ اقامت اختیار کر لی۔ یہاں آنے کے بعد میری تعلیم کا مسئلہ اُٹھا، والدہ چاہتی تھیں، مجھے قرآن شریف حفظ کرایا جائے۔ لکھنؤ کے حضرت مولانا عین القضاۃ کے مدرسۂ عالیہ فرقانیہ کی بڑی شہرت تھی۔ بڑے بابا نے مولانا کو خط لکھا، انھوں نے چند خصوصی مراعات کے ساتھ میرا داخلہ منظور فرما لیا، دوسرے ہی دن میں حضرت وسیم کے ساتھ لکھنؤ بھیج دیا گیا۔

نثار حسین صاحب مالک "پیامِ یار" کے صاحب زادے اکبر حسین صاحب کے ایک وسیع اور کشادہ مکان میں جو اندرونِ

چوک واقع تھا، ہمارا قیام ہوا۔

دوسرے روز وسیم صاحب مجھے لے کر مولانا عین القضاۃ کے ہاں پہنچے، وہ زائرین سے صرف مابینِ عصر و مغرب ملتے تھے، اسی وقت ہم لوگ بھی گئے، وسیم صاحب سے مولانا بڑے تپاک سے ملے، مجھ پر بھی بہت شفقت کا اظہار فرمایا۔ حضرت ریاضؔ کا ذکر دلچسپی سے کرتے رہے، کبھی کبھی تبسّم بھی فرمادیتے تھے۔ جب تو نہیں، اب مجھے حیرت ہوتی ہے کہ حضرت ریاضؔ کی شخصیت کتنی لیوب اور ان کی شاعری کتنی مرغوب تھی؟ اس کا چرچا صرف بزم و انجمن تک محدود نہ تھا بلکہ صوفیا کے ممبروں، بزرگوں کی خانقاہوں اور علما کے زاویوں تک بھی پھیلا ہوا تھا۔ مولانا کو بھلا شعروشاعری سے کیا واسطہ؟ لیکن ریاضؔ کے نام سے وہ بھی آشنا تھے، نہ صرف آشنا بلکہ اس نام میں کچھ کشش بھی دیکھتے تھے۔

مدرسہ فرقانیہ میں "خوش خطی" بھی سکھائی جاتی تھی، متعدد بلند پایہ کاتب اس خدمت پر مامور تھے، مشہورِ زمانہ خطاط منشی شمس الدین اعجاز رقم بھی اس وقت تک زندہ تھے اور محنتی لڑکوں کو کتابت سکھایا کرتے تھے۔ میں چوں کہ ایک گونہ اختصاص کے ساتھ داخل ہوا تھا، مہتمم صاحب، نائب مہتمم صاحب اور اساتذۂ کرام میرا بہت خیال فرماتے تھے لہٰذا منشی صاحب بھی شفقت کرتے تھے اور اپنے دستِ خاص سے مجھے "اصلاح" دیتے تھے۔

منشی صاحب کی عمر ۸۰ سے تجاوز کر چکی تھی، رعشے کا یہ عالم تھا کہ ہاتھ اس طرح ہلتا تھا جیسے خزاں دیدہ پتّا تیز ہوا میں لرزش کرتا ہو، لیکن مہارت کی یہ کیفیت تھی کہ اُس ہلتے ہوئے ہاتھ کے دائرے میں کیا مجال جو کہیں خم پڑ جائے۔

ایک مرتبہ صبح صبح مَیں مدرسے میں بیٹھا ہُوا اپنا سبق یاد کر رہا تھا اتنے میں مَیں نے دیکھا کہ آگے مہتمم صاحب اور پیچھے پیچھے ریاض صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ مہتمم صاحب نے انھیں مدرسے کی خوب سیر کرائی، پھر بڑے بابا مجھے چھٹی دلوا کر اپنے ساتھ لے آئے۔

قیام گاہ پر پہنچنے کے بعد انھوں نے پوچھا

"تم خوش خطی سیکھتے ہو؟"

"جی ہاں سیکھتا تو ہُوں"

"کون سکھاتا ہے؟"

"منشی شمس الدین صاحب"

"اعجاز رقم"

"جی!"

"ان کی کوئی اصلاح دکھاؤ"

مَیں کمرے سے کاپی اُٹھا لایا۔ منشی جی کی اصلاحیں انھیں دکھائیں، دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ میری کاپی پر کچھ انھوں نے بھی گُل کاری کی، مَیں نے کہا "آپ بھی خوش خطی جانتے ہیں بڑے بابا؟" انھوں نے کہا "جی جناب"! دوسرے دن ان کا لکھا

ہوا میں نے منشی جی کو دکھایا انھیں حیرت ہوتی کہ ریاض صاحب بھی اس فن سے واقف ہیں، انھوں نے یہ بھی فرمایا "خط تو خاصا پختہ ہے!"

اس وقت میں سمجھ نہیں سکتا تھا، بعد میں میں نے بھی اندازہ کیا، ان کا خط بہت پاکیزہ تھا، وہ اگر کتابت کرتے تو اُن کا خط کسی سے ہیٹا نہ رہتا۔ آخر عمر تک ان کے خط میں ایک خاص شان تھی، ان کا خط شکست بھی پاکیزہ ہوتا تھا۔ انھوں نے زندگی بھر نِب نہیں استعمال کی، ہمیشہ کلک کے قلم اور سیاہ روشنائی سے لکھتے رہے، جس قلم سے انھیں زندگی بھر واسطہ رہا، اس کا بنانا وہ نہیں جانتے تھے۔ جب تک میں گھر پر رہا۔ یہ خدمت مجھ سے لی جاتی تھی۔

(۵)

تحریکِ خلافت کا پُر آشوب زمانہ کچھ کچھ یاد ہے، ایسا جیسے کوئی بھولا بسرا خواب۔ میں مدرسۂ فرقانیہ میں پڑھتا تھا، ایک دن معلوم ہوا مولانا ظفر الملک صاحب علوی ایڈیٹر "الناظر" گرفتار کر لیے گئے۔ ہمارے مدرسے میں بھی بڑا جوش پھیلا ہوا تھا، نہ معلوم کس نے یہ جدّت کی تھی کہ لاکھوں چھوٹی چھوٹی جھنڈیاں جن میں آلپنیں لگی ہوتی تھیں، تقسیم کر دیں، ان پر باریک عربی حروف میں لکھا تھا "ہم بھی جیل جائیں گے!" مدرسے کے بڑے لوگوں نے تو یہ جھنڈیاں اپنے سینوں پر آویزاں کی ہی تھیں، ہم چھوٹے بھی ان سے پیچھے نہ رہے، مزے سے سینے

پر لگائے اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔

مَیں پڑھتا مدرسے میں تھا اور رہتا اپنے ایک عزیز کے ہاں تھا، جو راجا بازار کے قریب صحبتیا باغ میں مقیم تھے اور پولیس میں ملازم تھے۔ یاد نہیں اسی دن یا دُوسرے دن بڑے بابا تشریف لائے، ان کی اچکن میں بھی یہ جھنڈی چپکی ہوئی تھی۔ انھوں نے اس بچپن میں میری حریت آبی دیکھی، مَیں نے اس بڑھاپے میں ان کا بچپن دیکھا، مَیں مسکرا دیا۔ ایک خاص انداز سے جو صرف انھی کا حصّہ تھا، انھوں نے گردن ہلائی اور میرے تبسم میں شریک ہوئے۔

انھوں نے تحریکِ خلافت میں کوئی عملی حصّہ نہیں لیا لیکن اچھی طرح یاد ہے، ذہنی اور قلبی طور پر وہ اس تحریک سے بہت متاثر تھے۔ ہمارے گھر میں گاڑھا (کھدر نہیں) جبری طور پر رائج ہو گیا تھا اور یہ انھی کا فرمان تھا۔ انھوں نے نصف درجن کے قریب اعلا درجے کے چرخے بنوائے تھے جن کی تعمیر میں ان کی انجینرنگ کو بھی کافی دخل تھا۔ گھر کی عورتیں اور لڑکیاں لازمی طور پر چرخہ چلاتی تھیں، وہ خود بھی کبھی کبھی شغل فرمایا کرتے تھے، مَیں بھی شوقیہ تھوڑی دیر تک روز چرخہ چلاتا تھا۔ مجھے یاد ہے، اسی کھیل کود میں مَیں نہایت باریک تاگا نکالنے لگا تھا، بڑے بابا میری اس مشق کو دیکھتے تھے اور بہت خوش ہوتے تھے۔ اس دفعہ گھر بھر کے لیے جتنی رضائیاں سلوائی گئیں، لحاف بنوائے گئے، شلوکے

تیار ہوتے، وہ سب گاڑھے ہی کے تھے۔ تاکید تھی گاڑھے کے سوا ہرگز کوئی کپڑا نہ استعمال کیا جائے۔

گاڑھے سے انھیں اتنی دلچسپی ہوگئی تھی کہ کچھ عرصے کے بعد خیرآباد سے کچھ آگے ایک مقام سدھولی میں گاڑھے کی ایک "تربیت گاہ" قائم ہوئی جس میں نوجوانوں کو گاڑھا بُننے کا فن سکھایا جاتا تھا۔ انھوں نے میرے بڑے بھائی سید عقیل احمد صاحب جعفری اور حضرت وسیم کے صاحب زادے جناب شمیم خیرآبادی کو صرف اپنی صوابدید پر سدھولی بھیج دیا تاکہ اس فن میں کامل ہوکر آئیں اور خیرآباد میں یہ فنِ لطیف عام کر دیں۔ بھائی صاحب نے سدھولی کے دورانِ قیام میں ایک شعر کہا تھا جو اب تک یاد ہے:۔

سید بنیں جُلاہے کہتا ہے یہ زمانہ
لایا ہے اب سدھولی کرگھے کا کارخانہ

کچھ عرصے کے بعد حکیم اجمل خاں کی زیرِ صدارت احمدآباد میں کانگریس کا ایک ہنگامہ خیز اجلاس ہوا۔ اس میں ایک آل انڈیا مشاعرہ بھی منعقد ہوا، صدر غالباً مولانا حسرت موہانی تھے۔ مصرعۂ طرح تھا:

کچھ دنوں میں ڈوبتی ہے آب رُو سرکار کی

حضرت ریاض نے بھی اس طرح پر طبع آزمائی کی، فرمایا:۔

وعدہ کر کے لُطف دیتی ہے ادا انکار کی
بات کہتے پلٹے کھاتی ہے زباں سرکار کی

دام بردوش آئے بھی یارب کہیں صیاد جلد
آج کل بدلی ہوئی ہے ہوا گل زار کی

کھیل دیوانوں کا بن کر رہ گئی قیدِ فرنگ
آج کل زنداں کا جانا سیر ہے گلزار کی

ہوگئی باہم دگر پیوستگی سے اب فزوں
استواری رشتہ ہائے سبحہ و زنار کی

اپنی اسی غزل کے مقطع پر ریاض صاحب نے خمسہ بھی کہا تھا، وہ بھی دل چسپ ہے:-

کانگرس والوں سے کچھ آنکھیں ملاکر آئی شرم
دختِ رز کو بے تکلف ساتھ لاکر آئی شرم
وہ جگہ پاکیزہ تھی، بوتل اٹھاکر آئی شرم
اے ریاض آشرم میں گاندھی کے جاکر آئی شرم
پھینک دی دریا میں جتنی تھی سمندر پار کی

جب انگورہ فنڈ کا کام شروع ہوا تو حضرت ریاض نے پورے جوش و خروش کے ساتھ خیرآباد کے کارکنوں کا ساتھ دیا۔ وہ چاہتے تھے یہاں سے بہت زیادہ چندہ فراہم ہو، انھوں نے خود بھی اپنی استطاعت سے زیادہ نقد رقم دی۔ پھر جب خواتین کا وفد ہمارے گھر آیا تو ان کی اہلیہ نے اپنا ایک بیش قیمت طلائی زیور بے تامل دے دیا۔

مذہبی اور سیاسی معاملات میں جہاں تک نظریے کا تعلق تھا، وہ بڑے انتہا پسند تھے۔ عمل کا جہاں تک تعلق تھا، وہ

محض "شاعر" تھے اور اس جھمیلے سے دور ہی رہتے تھے۔ خوددار اور غیور بھی بہت تھے، خیرآباد کانگرس کمیٹی کا ایک سرگرم عہدے دار جوالاپرشاد گرفتار ہوا اور معافی مانگ کر رہا ہو گیا۔ حضرت ریاضؔ اس پر بہت برہم ہوئے، بے انتہا خفگی کا اظہار کیا اور فرمایا کہ "ایسے کم ہمت آدمیوں کو عملی میدان میں اُترنا ہی نہیں چاہیے!"

تحریکِ خلافت سے ان کی گہری ہم دردی اور تعلق خاطر کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہی کہ ایک دفعہ ان کی گرفتاری کی افواہ اُڑ گئی، جس سے ان کی پیرانہ سالی کے سبب ان کے دوستوں کے حلقے میں بڑی تشویش پیدا ہو گئی تھی۔

تحریک ترکِ موالات کے زمانے میں عدالتوں کا مقاطعہ بھی ایک اہم مسئلہ تھا۔ حضرت ریاضؔ اس تحریک کے بڑے حامی تھے، اپنے محلّے میں کوشش کر کے انھوں نے پنچایت قائم کرادی تھی، خود "سرپنچ" منتخب ہوئے تھے، مقصد یہ تھا کہ محلّے کے لوگوں میں اگر کوئی منافشہ ہو۔ معاملات طول پکڑ جائیں، تو بھی عدالت سے نہ رجوع کیا جائے، بلکہ آپس ہی میں پنچایت کے ذریعے طے کر لیا جائے۔

اس پنچایت کے سامنے پہلا مقدمہ جو دائر ہوا، وہ ہمارے محلّے کے دومال دار درزی خاندانوں کا تھا، ان کے معاملات عدالت تک پہنچ چکے تھے۔ ریاضؔ کی مداخلت کارگر ہوئی، عدالت سے مقدمہ واپس لے لیا گیا اور پنچایت میں پیش ہوا۔ انھوں

نے بہ حیثیت سرپنچ جو فیصلہ کیا، ہر دو فریق نے پوری اطاعت مندی کے ساتھ اسے قبول کر لیا، اس فیصلے سے فریقین اتنے خوش ہوئے کہ انھوں نے مٹھائی منگائی اور حاضرین میں بلکہ سارے محلّے میں پوری دریا دلی سے تقسیم کی!

(۶)

جلسوں اور مشاعروں میں شرکت سے حضرت ریاضؔ بہت احتراز کرتے تھے، بڑے بڑے مجمعوں میں انھیں کچھ اختلاج سا ہونے لگتا تھا۔ لوگ خوشامد کریں، دوستانہ اِصرار کریں، تعلّقات کا واسطہ دیں، امیدیں دلائیں، مگر وہ اپنی جگہ سے جنبش نہیں کرتے تھے۔ یہ کیفیت اب بڑھاپے میں تھی، ورنہ عہدِ شباب میں تو انھوں نے درباروں، جلسوں اور مشاعروں کے بڑے بڑے معرکے سر کیے۔

اس گوشہ گیری کے باوجود مخصوص احباب کے مجمع میں وہ بلبلِ ہزار داستان کی طرح چہکتے تھے۔ ان کی بذلہ سنجی، ان کی حاضر جوابی، ان کی شوخی اور شگفتگی، ان کے لطیفے اور چٹکلے، ان کے دل چسپ اور قہقہہ آور طنزیات، بجائے خود بزمِ تبسّم تھے۔ اس شوخی اور زندہ دلی کے باوجود خود اتنے سنجیدہ تھے کہ میں نے اپنے ہوش میں کبھی انھیں قہقہہ لگاتے یا بلند آواز سے ہنستے نہیں دیکھا۔ کیسی ہی خندہ آور بات یا واقعہ ہو، بہت لطف لیتے تھے تو تبسّم فرما لیتے تھے، اسے ان کی ہنسی کہہ لیجیے یا قہقہہ جو چاہے سمجھ لیجیے۔

اس سنجیدہ مزاجی کے باوجود گھر کے بچّوں کے ساتھ ان کی شفقت کا انداز بالکل جُداگانہ تھا۔ وہ کبھی کسی کو نہ ڈانٹتے تھے نہ مارتے تھے، جھڑکتے بھی نہیں تھے، مجھے نہیں یاد کہ مَیں نے کبھی انھیں کسی پر غصہ کرتے دیکھا ہو، یہی سلوک ان کا ملازمین کے ساتھ تھا۔

ان کا ایک وفادار ملازم عبداللہ تھا، انھوں نے اپنے گھر کے وسیع احاطے کے اندر ایک مختصر سا "مزرع" بنایا تھا، یہ اس کی نگرانی پر مامور تھا۔ رفتہ رفتہ یہ ان کا پرائیویٹ سکریٹری، مینجر اور آتالیق بن گیا۔ تھا بالکل ناخواندہ، کٹّر دہقانی، نہ بات کرنے کی تمیز، نہ گفتگو کرنے کا سلیقہ، لیکن اس کے باوجود ان دونوں میں بڑی دیر تک "راز ونیاز" کی باتیں ہوا کرتیں۔ ریاضؔ صاحب آرام کرسی پر دراز ہیں اور عبداللہ خاں سامنے کھڑے ہوئے اپنی تجویزیں پیش کر رہے ہیں۔ ان کی اسکیموں سے تند و ترش لب و لہجے میں شدید اختلاف کر رہے ہیں، خود ہدایتیں دے رہے ہیں اور ان کی ہدایتیں قبول کرنے سے صاف انکار کر رہے ہیں، حضرت ریاضؔ دم بخود ان کی باتیں سُن رہے ہیں، کبھی بیچ بیچ میں کچھ بول لیتے ہیں، لیکن بالعموم ہوتا وہی جو عبداللہ کی مرضی ہوتی۔ مَیں تو کبھی کبھی اسے بڑے بابا کے سامنے ڈانٹ دیتا، پھر جب مَیں نے دیکھا ان دونوں کی گفتگو نے راز ونیاز کی صورت اختیار کرلی ہے، مَیں چُپ ہو رہا، حد ہو گئی، ایک دفعہ انھوں نے بڑے

پیار سے کہا " عبداللہ!" تو کیا جواب دیتا ہے: "تم تو بکا کرت ہو، ہم کام سے جائے رہے ہیں!" ریاض صاحب بجائے خفا ہونے کے بہت محظوظ ہوئے، یہ رنگ دیکھ کر میں خاموش نہ ہو جاتا تو کیا کرتا؟

ایک دفعہ بھوپال سے سیّد نیاز احمد صاحب تشریف لائے ہوئے تھے۔ جب وہ خیرآباد آتے تو ہمارے گھر میں بڑی چہل پہل ہو جاتی، ہر وقت ایک جلسہ سا جما رہتا، ان کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا، جب دیکھیے جب دس پانچ آدمی بیٹھے ہوتے ہیں، یہ مجمع بڑا ستھرا اور پاکیزہ ہوتا تھا۔ عصر کے بعد وہ مع اپنے مخصوص احباب کے باہر احاطے میں کرسیوں پر بیٹھے تھے، بیچ میں آرام کرسی پڑی تھی، اس پر بڑے بابا لیٹے ہوئے تھے اور بحث و گفتگو میں حصّہ لے رہے تھے۔ اتنے میں کاندھے پر رومال ڈالے ہوئے عبداللہ خاں آئے۔ بڑے بابا ان سے کئی روز سے کہہ رہے تھے کہ سینچائی کے لیے ایک آدمی رکھ لیں، وہ لیت و لعل سے کام لے رہے تھے۔ آج پھر انھوں نے تاکید کی، عبداللہ خاں نے تڑسے جواب دیا "تُمرے کہے سے کا ہوت ہے؟ آدمی ابھی ہم نا ہیں رکھیا!" (تمھارے کہنے سے کیا ہونا ہے ہم آدمی ابھی نہیں رکھیں گے!") حضرت ریاض تو کچھ نہ بولے، نیاز صاحب سے ضبط نہ ہوا انھوں نے کئی چانٹے عبداللہ خاں کے جڑ دیے، اس وقت تو بڑے بابا خاموش رہے لیکن مجمع

برخاست ہونے کے بعد وہ نیاز صاحب پر بہت برہم ہوئے، انھیں مجبور کیا کہ عبداللہ سے معافی مانگیں اور اپنے طرزِ عمل کی تلافی کریں (یعنی انعام دیں!) یہ حکم دے کر برہمی کے عالم میں وہ اندر چلے گئے۔

نیاز صاحب عبداللہ کی کوٹھری میں گئے۔ اس سے معافی مانگی اور پانچ رُپے انعام دیے، تب جا کے معاملہ رفت گزشت ہوا، ورنہ ان حضرت نے تو بھائیوں بھائیوں میں مناقشہ برپا کرا دیا تھا۔

آج حضرت ریاض جنت نشیں ہیں، لیکن عبداللہ ابھی تک زندہ ہے اور اسی جاہ و تجمل کے ساتھ جو اسے ان کے زمانے میں حاصل تھا، اب نیاز صاحب مستقل طور پر خیرآباد میں مقیم ہیں اور عبداللہ کے ساتھ ان کا وہی سلوک ہے جو ان کے بڑے بھائی حضرت ریاض کا تھا۔ اب وہ انھیں بھی کبھی کبھی ڈانٹ دیتا ہے اور وہ اسی طرح اس کی ڈانٹ سن لیتے ہیں جس طرح ریاض صاحب سنا کرتے تھے۔

ان بھائیوں کو ایک دوسرے کا لحاظ کرتے جس طرح میں نے دیکھا، اس کی مثال بھی مشکل سے ملے گی۔

ریاض صاحب تین بھائی تھے، بڑے خود، منجھلے سید نیاز احمد صاحب اور سب سے چھوٹے سید فیاض احمد صاحب، ان تینوں کا آپس میں برتاؤ عجیب و غریب تھا، ریاض صاحب

کو دونوں بھائی بُت کی طرح پوجتے تھے، خود ریاض صاحب دونوں بھائیوں پر اپنی جان فدا کرتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ رکھ رکھاؤ ایسا کہ چھوٹے بھائیوں کی مجال نہیں تھی بڑے بھائی کے سامنے لب کشائی کر سکیں، ہنس بول سکیں، بے تکلف ہو سکیں، حالاں کہ تینوں بوڑھے ہو چکے تھے، پوتی پوتے والے ہو چکے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک مرتبہ فیاض احمد صاحب گولہ سے تشریف لائے، وہاں انسپکٹر پولیس تھے۔ رمضان کا مہینہ تھا، ریاض صاحب بحالت صوم گردن جھکائے قرآن شریف کی تلاوت کر رہے تھے، فیاض صاحب مؤدب جاکر ان کے پاس کھڑے ہو گئے۔ ریاض صاحب قرآن شریف پڑھتے رہے، دس پندرہ منٹ کے بعد انھوں نے گردن اُٹھائی، چھوٹے بھائی نے سلام کیا، بڑے بھائی نے سر کے اشارے سے سلام کا جواب دیا اور پھر تلاوت شروع کر دی۔ جب تک چھوٹے بھائی کا سلام نہیں قبول ہو گیا وہ گھر میں کسی سے نہ ملے، بڑے بھائی کے حق میں دونوں بھائی عملاً مکان اور ترکۂ پدری سے دست بردار ہو چکے تھے، ہر چیز پر ان کا مکمل قبضہ تھا، کسی بھائی نے نہ کہا اتنا حصّہ ہمارا ہے اتنا آپ کا ہے، یہاں ہم رہیں گے وہاں آپ!

ایک مرتبہ فیاض احمد صاحب پر مقدمہ قائم ہو گیا، وہ معطّل ہو گئے، اندیشہ تھا سزا نہ ہو جائے، وہ بڑے دین دار،

متقی اور پرہیز گار آدمی تھے۔ انھوں نے زندگی بھر ناجائز آمدنی سے اجتناب کیا، لیکن ایک سازش کے ماتحت ان پر یہ مقدمہ چل گیا تھا۔ یہ اطلاع ملتے ہی آگرہ سے ببّہ نیاز احمد صاحب جہاں وہ پولیس کے انسپکٹر حلقہ تھے اور گورکھ پور سے ریاض صاحب، جہاں سے ان کا شان دار اخبار، ریاض الاخبار نکل رہا تھا، فوراً لکھیم پور پہنچ گئے۔ خالی ہاتھ نہیں جو بڑی سے بڑی رقم ممکن ہو سکتی تھی، اس کی تھیلیاں ساتھ لے کر کہ پانی کی طرح رُپیہ بہائیں اور بھائی پر آنچ نہ آنے دیں، لیکن اس کی نوبت نہ آنے پائی، وہ بے گناہ تھے، خدا نے انھیں بچا لیا۔ پولیس کے محکمے میں ایسے نیک طبع اور نیک نہاد لوگ کم ہوں گے، جیسے سیّد فیاض احمد صاحب تھے۔ اصل میں وہ اپنے والد بزرگوار سیّد طفیل احمد صاحب سے بہت متاثر تھے۔ وہ اپنے صوبے کے پہلے ہندستانی تھے جو غدر کے بعد پولیس کے اعلا مراتب پر فائز ہوئے۔ ان کی دین داری اور بے لوثی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ فیاض احمد صاحب جب پہلے پہل پولیس میں داخل ہوئے، نوجوان تھے، بعض یاران سرپل کے بہکانے میں آگئے اور شوقیہ ایک بنیے سے دن دہاڑے اس کے گھر پر جا کر "رشوت" لے لی (یہ ان کی زندگی کی پہلی اور آخری رشوت تھی) بنیا ٹھیرا بنیا، اس نے قانونی کارروائی شروع کر دی۔ طفیل احمد صاحب کے

پیشاب میں چراغ جلتا تھا، بڑے دبدبے اور طنطنے کے آدمی تھے، سارے شہر کے حکم راں وہی تھے، لیکن جب ان کا یہ چھوٹا بیٹا رشوت کے الزام میں ماخوذ ہوا، تو نہ صرف یہ کہ انھوں نے اسے بچانے کی کوئی کوشش نہیں کی، بلکہ ایک مہینے کی چھٹی لے کر جون پور سے خیرآباد آ گئے تاکہ بیٹے کے خلاف تحقیق و تفتیش میں ان کا شخصی اثر مانع نہ ہو، گھر میں کہرام مچا ہوا تھا، سب پر خواب و خور حرام تھا، لیکن باپ بپھرے ہوئے شیر کی طرح ایسا الگ ہو بیٹھا تھا کہ کسی کی مجال نہیں تھی کہ اس کے پاس جا کر کچھ عرض معروض کرے۔

ڈپٹی عزیزالدین صاحب (جو بعد میں سر ہو گئے اور ریاست دتیا کے وزیر اعظم بھی رہے) اس زمانے میں وہیں تھے، ان پر طفیل احمد صاحب کے بہت احسانات تھے، وہ انھیں اپنے بچوں کی طرح مانتے تھے اور ان کے خیرآباد جانے کے بعد انھی ڈپٹی صاحب کی جدوجہد اور سعی و کوشش سے معاملہ دبا، ورنہ انصاف پسند باپ نے اپنے غلط رو بیٹے کو جیل بھجوانے کا پورا انتظام کر دیا تھا۔

گھر میں کبھی کبھی عورتوں کے باہمی مناقشے ہوتے تھے، اور بعض دفعہ وہ سنگین صورت بھی اختیار کر لیتے تھے، لیکن یہ سب کچھ عورتوں میں ہوتا تھا، بھائیوں بھائیوں میں تلخ کلامی تو بڑی چیز ہے، کبھی رد و رد معاملاتِ خانگی پر

گفتگو بھی نہیں ہوئی۔ اگرچہ مخدرات کی طرف سے برابر "سعیِ جمیل" جاری رہتی تھی کہ معاملہ آگے بڑھے، فیصلہ کُن صورت اختیار کرلے۔ تقسیم اور حد بندی کی نوبت آجائے، تمام معاملات میں ان کی چلتی تھی، نہ چلی۔ ریاض صاحب کے منھ سے جو نکل گیا، دونوں بھائیوں نے سرِ تسلیم خم کردیا۔ غرض اس زمانے میں لوگ والدین کا اتنا احترام نہیں کرتے جتنا یہ دونوں اپنے بڑے بھائی کا کرتے تھے۔

(۷)

اب مجھے اخبار بینی کا شوق پیدا ہو چلا تھا۔ ابھی اخبار سمجھ میں نہ آتا تھا لیکن میں پڑھتا روز تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ علی برادران پر کراچی کا مشہورِ عالم مقدمہ چل رہا تھا، عدالت کی کارروائی بڑی تفصیل سے "ہمدم" چھاپ رہا تھا۔ مجھے بھی اس مقدمے سے دل چسپی ہوگئی، میں بڑے شوق اور جوش سے یہ کارروائی پڑھتا۔ بڑے بابا اس شوق سے خوش ہوتے انھیں کیا معلوم تھا میرا یہ شوق ان کے لیے مصیبت بننے والا ہی۔

خیرآباد میں ڈاک ایک بار دس بجے صبح کو تقسیم ہوتی ہی، ڈاک آتی اور ریاض صاحب سب کام چھوڑ کر مطالعے میں مصروف ہو جاتے۔ ان کی یہ عادت تھی کہ اخبارات و رسائل اور کتبِ موصولہ کا ایک ایک حرف پڑھتے تھے۔ جب تک سب پڑھ نہیں لیتے تھے، کسی کو ہاتھ نہیں لگانے

دیتے تھے۔ جب پڑھ چکتے تو بہت سے اخبارات ورسائل اپنے بعض دوستوں کو بھجوا دیتے، بچے کھچے پرچے مجھے ملتے۔ بڑی کوفت ہوتی تھی۔

اب میں نے یہ وطیرہ اختیار کیا کہ ٹھیک ۱ بجے میں باہر چلا جاتا، احاطے کے دروازے پر ڈاکیے کا انتظار کرتا، جب وہ آتا تو ڈاک لے کر وسیم صاحب کے گھر چلا جاتا۔ وہاں اطمینان سے ساری ڈاک کا مطالعہ کرتا، پھر اخبارات ورسائل اس طرح بند کر کے کہ گویا وہ کھولے نہیں گئے ہیں، گھر لے جاتا۔ اور ریاض صاحب کے سامنے رکھ کر چلا جاتا۔ وہ مجھ سے کہتے "ڈاک اب بہت دیر میں آنے لگی ہے" میں سُنی اَن سُنی کر دیتا۔

ایک مرتبہ میں اطمینان سے بیٹھا ہوا وسیم صاحب کے ہاں ریاض صاحب کی ڈاک دیکھ بھال رہا تھا کہ کسی ضرورت سے وہ وہاں پہنچ گئے، اب کیا ہوتا؟

اور چاہوں کہ چھپا لوں تو چھپائے نہ بنے!

مجھے اس ہیئتِ گذائی میں دیکھتے ہی وہ سب کچھ سمجھ گئے۔ انھوں نے فرمایا "تم بڑے شریر ہو!" یہ کہہ کر انھوں نے ڈاک پر اس طرح جھپٹا مارا جیسے چیل گوشت پر جھپٹتی ہو۔ میں بہت نادم ہوا، میری آنکھوں میں آنسو ڈھلک آئے۔ انھوں نے دل دہی کرتے ہوئے فرمایا "اتنی جلدی بھی کیا ہے؟ میں پڑھ کر سب اخبارات تمھیں دے دوں گا پھر باہر بھیجوں گا" وہ بھی گھر چلے آئے اور میں بھی ان

کے پیچھے پیچھے چلا آیا۔

دو تین روز تک تو اس سمجھوتے پہ عمل ہوتا رہا اس کے بعد پھر وہ حسبِ سابق مجھے دکھائے بغیر اپنی ڈاک دوستوں کے ہاں بھیجنے لگے۔ بڑی کوفت ہوتی اب کیا کروں؟

اب مَیں نے دوسری ترکیب سوچی، مَیں صبح صبح ڈاک خانے چلا جاتا وہاں سے ڈاک لیتا، راستے ہی میں کہیں بیٹھ کر اسے پڑھتا اور ۹ بجے تک لا کے انھیں دے دیتا۔ اب ان کے لیے اعتراض کی کوئی گنجایش نہیں تھی، انھیں یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ مَیں ڈاک خانے سے ڈاک لا رہا ہوں، نہ ڈاکیے نے ان سے کہا اس کا تو اس میں فائدہ تھا ہمارے گھر تک کی مسافت طے کرنے سے وہ بچ جاتا تھا۔

زیادہ وقت ان کا مطالعے میں صرف ہوتا تھا، گھر پر اور ان کا کام ہی کیا تھا؟ شطرنج، چوسر، گنجفہ وغیرہ سے انھیں کوئی سروکار نہ تھا، کبھی کبھی شطرنج کھیل لیتے تھے اور بہت خوب کھیلتے تھے، تینوں بھائیوں کے کھیل جُداگانہ نوعیت کے تھے۔ ریاض صاحب کم کھیلتے تھے لیکن شطرنج خوب کھیلتے تھے۔ نیاز صاحب کو گنجفہ کا بڑا شوق تھا، فیاض احمد صاحب زیادہ تر دینی کتابوں سے "کھیلا" کرتے تھے، کبھی کبھی داستانِ امیر حمزہ سے بھی شوق کر لیتے تھے۔

ریاض صاحب پڑھنے کے بڑے شائق تھے، کوئی چیز انھیں مل جاتے، جب تک مطالعہ نہ کر لیں چھوڑتے نہیں

تھے، پڑھنے کے بعد اپنی ایک جُداگانہ رائے رکھتے تھے۔ فن پر بھی تبصرہ کرتے اور زبان پر بھی، زبان پر زیادہ، اسے وہ گوارا ہی نہیں کر سکتے تھے کہ غلط زبان استعمال ہو، جو سامنے ہوتا تھا اسے ٹوک دیتے تھے، جس کا لٹریچر پڑھتے تھے اسے نکتہ چینی سے نوازتے تھے۔

ایک بار میں برآمدے میں لیٹا ہوا تھا، رات کا وقت تھا، بڑے بابا باہر صحن میں اپنی چارپائی پر استراحت فرما رہے تھے۔ والدہ نے پوچھا "رئیس کیا سو گئے؟" میں نے کہا "نہیں تو ابھی جاگ رہا ہوں" بڑے بابا نے فوراً آواز دی "رئیس!" میں سمجھا کوئی خاص بات کہیں گے، جلدی سے میں نے جواب دیا "فرمائیے" کہنے لگے "جگنا نہیں جاگنا بولا کرو!"

مولوی نورالحسن صاحب نیّر کا لغت "نوراللغات" شاید اُردو کا سب سے زیادہ مکمل، جامع اور مستند لُغت ہی یوں تو کچھ نہ کچھ لغزشیں اس میں بھی ہیں لیکن مجموعی حیثیت سے وہ بہت غنیمت ہی اس لُغت کی ترتیب وتدوین میں انھوں نے بڑی عرق ریزی اور جاں کاہی سے کام کیا واقعہ یہ ہی کہ یہ ان کی زندگی کا قابلِ فخر کارنامہ ہی، ریاضؔ کی زبان پر انھیں بڑا اعتماد تھا، انھی کی سفارش پر انھوں نے حضرت وسیم خیرآبادی کی خدمات سے فائدہ اُٹھایا، انھوں نے بھی اس لغت کو صحیح تر اور مستند تر بنانے

میں اپنی پوری قابلیت صرف کر دی، پھر بھی جہاں اشکال پیش آتی، کوئی لفظ ایسا سامنے آتا جس کا محلِ استعمال صحیح طور پر نہ معلوم ہوتا، یا کوئی ایسا محاورہ ہوتا جسے برتنے کی صحیح صورت سامنے نہ ہوتی، تو نورالحسن صاحب نیرؔ ریاضؔ صاحب سے رُجوع کرتے۔ ریاضؔ صاحب اس لفظ یہ محاورے کے بارے میں جو رائے قائم کرتے، کسی مشہور اُستاد کا شعر تائید میں لکھ بھیجتے، کوئی شعر نہ یاد آتا، یا نہ دست یاب ہوتا تو خود فکرِ سخن کرکے، کوئی شعر کہتے جس میں اس لفظ کو صحیح طور پر استعمال کیا گیا ہوتا اور نیرؔ صاحب کو بھیج دیتے۔ بلاشبہہ نورالحسن صاحب نیرؔ نے اپنے ذاتی سرمایے اور محنت سے نوراللغات کو مکمل کیا، لیکن اس تکمیل میں جناب وسیم اور حضرت ریاضؔ کا بھی بڑا حصّہ ہے۔ وسیم صاحب کا تو نہیں لیکن ریاضؔ کا لغت کے دیباچے میں انھوں نے شکریہ بھی ادا کیا ہے، نوراللغات میں ریاضؔ صاحب کے بہ کثرت اشعار ملیں گے۔

کتابوں کا بہت بہتر، منتخب اور سُتھرا ذخیرہ ان کے پاس موجود تھا، ہر قسم کی کتابیں تھیں۔ علمی، ادبی، فنی، زیادہ تر ادبی کتابوں کے معاملے میں بہت بخیل اور بہت چوکس تھے۔ کتاب مانگیے تو صاف انکار، کتاب چُرانے کی کوشش کیجیے تو بھی ناممکن، الماریاں مقفّل رہتی تھیں، کُنجی وہ اپنے کمر بند میں باندھتے تھے۔

ایک مرتبہ مولوی سبحان اللہ خاں صاحب کی دعوت پر چند روز کے لیے وہ گورکھ پور گئے اور اتفاق سے کنجیوں کا گچھا گھر ہی چھوڑ گئے، اب مجھے موقع مل گیا کہ الماریوں کا جائزہ لوں، چناں چہ میں نے پہلی الماری پر حملہ کیا، اس میں زیادہ تر "ریاض الاخبار"، روز نامہ "صُلحِ کُل"، "فتنہ"، "عطر فتنہ"، "گُل چیں"، "دامنِ گل چیں"، "پیامِ یار"، "دل گُداز" "صلائے عام"، "مورّخ"، "نقّاد"، "ذخیرہ"، "زمانہ"، "النّاظر"، "اودھ پنچ"، "صبحِ امید"، "اودھ اخبار"، "مخزن"، "نقیب"، "معلومات"، "کہکشاں"، "ادیب"، "العصر" وغیرہ کی جلدیں تھیں، دوسری الماری میں وہ کتابیں تھیں جو تبادلے میں، تبصرے کی غرض سے، یا یوں ہی "بہ غرض شرف مطالعہ" انھیں موصول ہوتی تھیں، ان میں ایک ناوِل "خواب کلکتہ" کا ذکر میں آگے چل کر ذرا تفصیل سے کروں گا، بہ ہر حال تھا بہت ذخیرہ!

جن اخبارات و رسائل کا میں نے ذکر کیا ہو وہ اب سب کے سب "مرحوم" ہو چکے ہیں، جب میں نے ان کی جلدیں دیکھیں تب بھی اکثر مرحوم ہو چکے تھے۔ مناسب معلوم ہوتا ہو کہ ان کا مختصر تعارف کرا دیا جائے۔

ریاض الاخبار —— سہ روزہ اخبار تھا، یہ آج سے کوئی ۴۰، ۴۵ سال پہلے گورکھ پور سے شائع ہوتا تھا، حضرت ریاضؔ اس کے مالک و مدیر تھے۔ اس کی خبروں، مراسلوں اور مقالوں پر ادبی رنگ غالب رہتا تھا۔ طرزِ بیان کی شوخی سونے پر

سہاگے کا کام کرتی تھی، اس کی ترتیب وتسوید زیادہ تر حضرت ریاض کے خامہ بہار آفریں کی رہینِ منّت ہوتی تھی۔ کچھ عرصے تک سیّد جالب دہلوی نے بھی ان کے ساتھ کام کیا، حکیم برہم مرحوم بھی ان کے مستقل رفیقِ کار تھے۔ بعد میں یہ اخبار لکھنؤ منتقل ہوگیا، راجا صاحب محمود آباد سر علی محمد خاں حضرت ریاض کے خاص مربیوں میں تھے، وہی اصرار کرکے انھیں لکھنؤ لائے، اپنے رنگ کا خاص اخبار تھا۔

صُلحِ کُل ـــــ روزانہ اخبار تھا، حکیم برہم اس کے رُکن رکین تھے، حضرت ریاض نگرانِ کار۔ چند دوستوں کی ایک پرائیوٹ کمپنی تھی، جو صلح کُل کی مالک تھی، مولوی سبحان اللہ خاں مرحوم بھی اس میں شریک تھے، یہ اخبار زیادہ نہیں چلا، اپنا ایک خاص معیار رکھتا تھا۔

فتنہ اور عطر فتنہ ـــــ ہفتے وار اخبارات تھے، سنجیدہ مزاح نگاری، طنز اور شوخی کے بہترین امتزاج کا یہ دل چسپ ترین نمونہ تھا۔ جیبی سائز پر نکلتا تھا اور ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا۔ اس اخبار کے متعلق انھوں نے اپنے ایک مقطع میں اس طرح اشارہ کیا ہے:

فتنہ کو پوچھتا ہے کوئی کس ادا کے ساتھ
چھوٹا سا وہ ریاض کا اخبار کیا ہوا؟

گُل چیں اور دامن گُل چیں ـــــ ماہ وار گلدستے تھے، شروع میں ان کی اشاعت لکھنؤ سے ہوتی تھی، حضرت وسیم مدیر

تھے، گل دستے کی اصطلاح ان رسائل کے لیے استعمال ہوتی ہے جو صرف مشاعرے کے پرچے ہوں، یعنی ایک طرح دے دی جائے اور اسی پر تمام شعرا کا کلام شائع ہوا۔ اس میں منشی امیرمینائی، نواب فصیح الملک مرزا داغ، حفیظ جون پوری، جناب جلیل، حضرت ریاض اور دوسرے بلند پایہ شعرا بالالتزام شرکت کرتے تھے۔ پہلے "دامنِ گل چیں" نکلا، پھر "گل چیں"۔ دونوں اپنے رنگ کے بہت مفید اور کار آمد پرچے تھے "گل چیں" کچھ عرصے تک سیتا پور سے بھی نکلا مگر بہت جلد بند ہو گیا۔

پیامِ یار ـــــ لکھنؤ سے شائع ہوتا تھا اور گل چیں کی طرح ماہ وار گل دستہ تھا، اس کے مالک و مدیر نیاز حسین صاحب تاجرِ عطر چوک لکھنؤ تھے۔ یہ بڑے سخن فہم، نکتہ شناس اور قدردانِ ادب تھے، محض اپنی دل چسپی کے لیے انھوں نے پرچہ نکالا تھا اور اس پر کافی رقم خرچ کر ڈالتے تھے۔ نفع ہو یا نقصان انھیں اس کی پروا نہیں تھی۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے فرزندِ اکبر جناب اکبر حسین صاحب نے بھی کچھ عرصے تک اسے جاری رکھا۔

نثار حسین صاحب کا مکان یارانِ مے کدہ کی بیٹھک کا کام دیتا تھا، چوک میں ریاض صاحب کے دو مرکز تھے، پیامِ یار کا دفتر اور خواجہ عبدالرؤف عشرت کی دکان۔ شام کو ان میں سے کسی جگہ نشست ہوتی تھی، ریاض صاحب، مولانا عبدالحلیم شرر، خواجہ عشرت، جناب وسیم، امانت لکھنوی

(داغ ونخست امانت والے) کے فرزند، فصاحت صاحب اور لکھنؤ کے دوسرے ارباب زبان و ادب مجتمع ہوتے تھے، یہاں بس شعر و شاعری کا چرچا رہتا تھا۔

دل گداز ——— مولانا عبدالحلیم شررؔ کا پرچہ تھا، مولانا کی مشہور اور مایۂ ناز کتاب "ہندستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ" یا "گزشتہ لکھنؤ" اسی رسالے میں بالاقساط شائع ہوتی تھی، اس کے علاوہ ان کے ناول بھی بالعموم "دل گداز" میں پہلے بالاقساط شائع ہوتے تھے۔ علاوہ ازیں اس رسالے میں تاریخی، نیم تاریخی، تحقیقی، خالص ادبی مضامین بھی بڑے پایے کے شائع ہوتے تھے، مولانا شررؔ اپنے رنگ کے موجد تھے، اس رنگ کو چلا اسی رسالے نے دی، کبھی کبھی تنقیدی اور تعریفی مقالے بھی اس میں شائع ہوتے تھے۔

صلائے عام ——— دہلی سے نکلتا تھا، خان بہادر میر ناصر علی اس کے مدیر تھے، نثر پر خان بہادر کو اتنی قدرت تھی کہ حدِ بیان سے باہر ہو۔ ایک ہی بات کو مختلف متنوع اور دل چسپ طرز پر بار بار لکھنا اور ہر بار "اوریجنیلٹی" کا قائم رکھنا انھی کا کام تھا۔ میں نے آج تک کسی نثر نویس کو اچھے سے اچھے انشا پرداز کو اپنے مضامین و مقالات میں حسبِ موقع اشعار نگینے کی طرح جڑتے نہیں دیکھا، وہ موقع موقع سے اشعار اس طرح کھپاتے تھے کہ اگر شعر ہٹا لیجیے تو نثر میں ایک خلا سا معلوم ہوتا تھا، ایسا محسوس ہوتا تھا اس کا کوئی

اہم حصّہ رہ گیا ہی، یہ کمال میر ناصر علی ہی کا تھا کہ موقع کے اشعار کو وہ نثر کا جزو بنا دیتے تھے، افسوس کہ یہ کمال ان کے ساتھ ختم ہو گیا، مولانا شبلی سا نقاد جو کسی کو خاطر ہی میں نہیں لاتا تھا۔ میر صاحب کے اس ہنر کا قائل تھا۔

ریاضؔ صاحب سے مدیر صلائے عام کو محبّت تھی، کلامِ ریاضؔ کے وہ عاشق تھے، ریاضؔ کا کلام جس امتیاز اور خصوصیت سے وہ اپنے پرچے میں شائع کرتے تھے، وہ انھی کا حصّہ تھا۔

حضرت ریاضؔ نثر بھی بڑی شگفتہ لکھتے تھے، وہی شوخی جو ان کے اشعار کی رُوحِ رواں تھی، نثر میں بھی کارفرما نظر آتی تھی۔ ریاض الاخبار اور فتنہ کے بعد ان کی نثر کی خامہ فرسائی صلائے عام تک محدود رہ گئی تھی، وہ بھی گاہے ماہے۔ ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے صاحب زادے بشیر الدین احمد صاحب، مرزا عرفان علی بیگ صاحب ڈپٹی کلکٹر اور دُوسرے چوٹی کے لکھنے والے اس کے مخصوص مضمون نگاروں میں تھے۔ رسالے کا زیادہ حصّہ خود میر صاحب کے رشحاتِ قلم کا ممنونِ کرم ہوتا تھا۔

نقاد ـــــ یہ پرچہ آگرہ سے نکلتا تھا، سیّد نظام الدین شاہ دل گیر اکبر آبادی اس کے مدیر تھے۔ اُردو لٹریچر میں اس پرچے نے خاصا اضافہ کیا، اس کے مضامین اور اس کے مقالات نگار دونوں اپنے اندر رعنائی اور زیبائی رکھتے تھے۔ ایم مہدی حسن افادی الاقتصادی نقاد کے خاص مقالہ نگار

تھے، جناب نیاز فتح پوری بھی سب سے پہلے اسی بزم میں چمکے۔ اس پرچے کا معیارِ نظم و نثر بہت بلند تھا، یہ بھی "ریاضیات" کا مبلغ تھا، شاید ہی کوئی پرچہ ایسا ہو جس میں متعدد جگہ بہتر سے بہتر انداز میں ریاض کا ذکر نہ ہو، بعض مضامین اس میں متانت سے گرے ہوتے بھی شائع ہو جاتے تھے۔

ذخیرہ ـــــ یہ پرچہ حیدرآباد سے نکلتا تھا، سید ناظر الحسن صاحب ہوش بلگرامی (جو اب حیدرآباد میں بخشیِ افواج ہیں) اس کے ایڈیٹر تھے۔ اس میں بڑے کارآمد اور مفید مضامین شائع ہوتے تھے۔ یہ علمی و ادبی پرچہ تھا۔ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی بھی اس میں مضمون لکھا کرتے تھے۔

ادیب ـــــ الہ آباد سے نکلتا تھا، ایک ہندستانی عیسائی مسٹر پیارے لال شاکر میرٹھی اسے نکالتے تھے۔ اس کی طباعت اور کتابت بہت بہتر ہوتی تھی، ریاض کی جوانی کی تصویر میں نے اسی رسالے کی کسی پرانی جلد میں دیکھی تھی۔ بلند و بالا قد، بڑی بڑی مونچھیں، ڈاڑھی ندارد، انگرکھا پہنے ہوتے، ایک خاص انداز میں کرسی پر متمکن ہیں۔ شاید اسی زمانے میں انھوں نے کہا تھا اور غلط نہیں کہا تھا:

دنیا کی پڑ رہی ہیں نگاہیں ریاض پر
کس نوک کا جوان ہے، کس آن بان کا!

اس رسالے کے مضامین بھی معیاری ہوتے تھے۔ جے۔ آر رائے (جرنلسٹ)، منشی پریم چند، ارشد تھانوی

خاص طور پر بزمِ ادیب کے نورتن بنے ہوئے تھے۔
العصر — نہ معلوم کیوں ادیب بند ہو گیا تو اسی شان سے شاکر صاحب نے لکھنؤ سے العصر نکالا۔ ادیب کا سرورق العصر پر لگا دیجیے تو کتابت، طباعت، کاغذ، مضامین کی یکسانیت تمیز نہیں کرنے دیتی کون العصر ہے کون ادیب؟
زمانہ — ماہ وار رسالہ ہے، کم و بیش ۳۰، ۳۵ سال سے کان پور سے شائع ہو رہا ہے، خالص ادبی پرچہ ہے، منشی دیانرائن نگم اس کے ایڈیٹر تھے۔ ابھی حال میں ان کا انتقال ہوا ہے اور اب پرچے کا مستقبل خطرے میں ہے، خوب پرچہ تھا یہ! منشی پریم چند کو اسی نے پیدا کیا، عہدِ حاضر کے متعدد ادیبوں، انشا پردازوں اور شاعروں کو روشناس کرانے والا یہی پرچہ تھا، اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ رہی کہ آغاز سے انتہا تک اس نے صوری یا معنوی کوئی تبدیلی نہیں قبول کی، ایک رنگ پر نکلتا اور ایک ڈھرے پر چلتا رہا، اس میں تصاویر کا بھی انتظام تھا، ہر پرچے میں ایک فوٹو بلاک شائع ہوتا تھا۔ لالہ لاجپت رائے بھی اس پرچے میں کبھی کبھی اردو مضمون نگاری کیا کرتے تھے۔

سوامی دویکانند کو اسی نے اردو داں عوام میں خوب روشناس کرایا، یہ ایک ہندو بزرگ تھے، ہندو مت کی تبلیغ ان کا مقصدِ حیات تھا۔ امریکہ بھی گئے تھے اور وہاں بھی تبلیغی سرگرمیاں کامیابی سے جاری رکھیں، نوجوانی میں انتقال

ہو گیا۔

النّاظر ـــــ لکھنؤ سے نکلتا تھا، مولانا ظفر الملک علوی اس کے ایڈیٹر تھے۔ یہ پرچہ ایک خاص رنگ لے کر منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا تھا۔ بے لاگ تنقید، غیر جانب دارانہ تحقیق، صاف اور کھرے سیاسی، تعلیمی اور ادبی مضامین اس کی خصوصیاتِ خاصّہ تھے۔ "نظر سے خوش گزرے" کے عنوان سے مولانا ظفر الملک صاحب اپنے قلم سے سیاسیاتِ حاضرہ اور واقعات وحوادث پر اظہار رائے کیا کرتے تھے، اور حق یہ ہے کہ خوب لکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی تیغِ قلم کا وار مولانا شبلی، مولانا ظفر علی خاں، ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، خواجہ حسن نظامی، سر اکبر حیدری، راجا صاحب محمود آباد، مولانا عبد الباری فرنگی محلی، سب ہی پر کیا، کم از کم ان کی نیت کی دیانت ہمیشہ غیر مشکوک رہی۔

مولانا عبد الماجد دریابادی کی انشا پردازی کا آغاز اسی پرچے سے ہوا۔ مولانا شبلی کی "الکلام" پر جس "ایک طالبِ علم" نے گولہ باری کی تھی، وہ یہی بزرگ تھے۔ تحریکِ خلافت کے زوال کے بعد ایک عرصۂ دراز تک "فیہ ما فیہ" کے عنوان سے مولانا ہر مہینے النّاظر میں واقعاتِ حاضرہ پر خامہ فرسائی فرمایا کرتے تھے، جس سے کچھ لوگ خوش ہوتے تھے کچھ خفا، لیکن زبان کا لطف موافق اور مخالف سب لیتے تھے۔ میر محفوظ علی صاحب بدایونی بھی کبھی کبھی اس پرچے میں اپنے

مقالات عالیہ زیادہ تر پسِ پردہ رہ کر شائع فرماتے تھے۔
اودھ پنچ ـــــــ لکھنؤ سے شائع ہوتا تھا، ہفتے وار اخبار تھا، منشی سجّاد حسین صاحب اس کے ایڈیٹر تھے۔

ہندستان میں منشی سجّاد حسین مرحوم اپنے رنگ کے واحد لکھنے والے تھے، وہ چٹکیاں لیتے تھے، چوٹ کرتے تھے، طنز وطعن کے جوہر دکھاتے تھے اور کبھی کبھی پھکڑ بازی پر بھی اُتر آتے تھے، زبان پر انھیں غیر معمولی قدرت تھی، بے بات کی بات پیدا کرتے تھے، روتوں کو ہنساتے تھے، ہنستوں کو رُلاتے تھے۔

یہاں پگڑی اُچھلتی ہے اِسے میخانہ کہتے ہیں

یہ بزم اودھ پنچ کا دستور تھا، وہ جس کے پیچھے پڑے، پنجے جھاڑ کے پڑے، نکتہ چینی میں بڑے بے باک تھے، کسی کے ساتھ رعایت کرنا جانتے ہی نہ تھے، اس زمانے میں جب صوبے کے حاکمِ اعلا سے زیادہ ایک سپاہی کا رُعب ہوتا تھا، حکومت پر نکتہ چینی کرنا بڑے دل گُردے کا کام تھا، لیکن وہ حکومت کو بھی نہیں چھوڑتے تھے، اکبر الہ آبادی بھی اودھ پنچ کے خاص مضمون نگاروں میں تھے۔

مولانا حالی نے مسدّس مدّوجزرِ اسلام لکھا، جو اُردو زبان میں اپنے رنگ کی پہلی اور شاید آخری چیز بھی ہے، یہ مسدّس بچّے بچّے کی زبان پر چڑھ گیا، اس کی معنویت، اس کی اثر آفرینی، اس کے جوشِ بیان کا یہ عالم تھا کہ جو پڑھتا تھا، متاثر ہوتا

تھا۔ سر سید تو کہا کرتے تھے خدا نے اگر مجھ سے پوچھا تم دنیا سے کیا توشہ لائے ہو تو میں مسدس پیش کروں گا۔ وہ ہو بھی ایسی ہی چیز، لیکن منشی سجاد حسین کو اس میں زبان و بیان کی خامیاں نظر آئیں اور انھوں نے اس پر گولہ باری شروع کر دی۔

ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے

یہ مصرعہ ہر مضمون کا طرازِ عنوان ہوتا تھا۔

مثنوی گلزارِ نسیم کے سلسلے میں مولانا عبدالحلیم شررؔ کی بھی شامت آئی، ان پر اودھ پنچ نے ایسی ایسی چوٹیں کیں کہ بے چارے رو رو دیے ہوں گے، انھیں کرسی کا احمق ثابت کیا، ان کی انشا پردازی، ناول نویسی، تاریخ دانی اور شاعری کا مذاق اُڑایا۔

منشی صاحب نے متعدد دل چسپ ناول بھی لکھے، حاجی بغلول، طلسمی فانوس، طرح دار لونڈی ان کے بہترین ناولوں میں ہیں۔

اودھ پنچ نے مثنوی گلزارِ نسیم کے سلسلے میں حضرت ریاضؔ سے بھی اختلاف کیا، لیکن ریاضؔ کا مذاق کہیں نہیں اُڑایا، جہاں بھی ان کا نام لیا، عزت اور احترام کے ساتھ لیا۔ حیرت ہے!

صبح امید —— لکھنؤ کے ایک خوش مذاق ادیب پنڈت برج نرائن چکبست اس کے مدیر تھے، کشمیری پنڈت تھے، نثر بھی اچھی لکھتے تھے اور شعر بھی عمدہ کہتے تھے، نظر

بہت وسیع تھی، اندازِ بیان سنجیدہ اور محققانہ، نقد و تبصرہ کرتے تھے تو تمام موافق اور مخالف پہلوؤں کو اُجاگر کر دیتے تھے۔

ایک طبقے کا یہ خیال ہی کہ مثنوی گلزارِ نسیم دراصل پنڈت دیا شنکر نسیم کی لکھی ہوئی نہیں ہی بلکہ ان کے اُستاد خواجہ حیدر علی آتش لکھنوی کی کہی ہوئی ہی۔ پنڈت چکبست نے اس خیالِ خام کی دھجیاں بکھیریں، اس شان سے اپنے تحقیقی مقالات شائع کیے کہ مخالفین بھی ان کے حسنِ انشا، خوبیِ بیان اور زورِ قلم کے قائل ہو گئے۔ صبح امید بڑا معیاری پرچہ تھا، پنڈت کشن پرشاد کول، منشی پریم چند، نواب ذوالقدر جنگ، مولانا عبدالماجد اور منوہر لال زتشی، اس کے خاص لکھنے والوں میں تھے۔ چکبست صاحب پر دفعتاً فالج کا حملہ ہوا اور جوانی ہی میں اس دنیا سے کوچ کر گئے۔

اودھ اخبار ـــــ شاید ہندستان کے زندہ اخبارات میں سب سے زیادہ پُرانا روزنامہ ہی۔ سے نکلتے ہوئے کم و بیش ستّر سال ہو چکے ہیں۔ منشی نول کشور (جن کا مطبع + نول کشور سارے ہندستان میں مشہور ہی)، اس کے بانی تھے، × اپنے یومِ اشاعت سے اب تک بڑی پابندی سے نکل رہا ہی۔ ایک زمانے میں پنڈت رتن ناتھ سرشار اس کے ایڈیٹر تھے، انھوں نے اس اخبار میں بہت زیادہ ادبی خوبیاں پیدا کر دی تھیں۔ ان کا مشہور کارنامہ "فسانۂ آزاد" پہلے پہل

اسی اودھ اخبار میں بالاقساط شائع ہوا تھا، پھر کافی عرصے کے بعد کچھ ردّوبدل اور حذف واضافے کے ساتھ کتابی صورت میں شائع ہوا۔

اس اخبار کی ادبی حیثیت سرشار کے بعد ختم ہو گئی، سرشار اور ریاض میں گہرے دوستانہ مراسم تھے، بعد میں ہزاکسی لینسی مہاراجا سرکشن پرشاد یمین السلطنت صدرِ اعظم، مملکتِ حیدرآباد کے متوسلین بارگاہ میں سرشار داخل ہو گئے تھے۔ ریاض صاحب بھی ایک مرتبہ حیدرآباد گئے۔

مہاراجا بہادر بہت لطف وعنایت سے پیش آئے، یہ ٹھیرے کہیں اور تھے، ایک بار ان کی مخصوص دعوت کی، سرشار ہر وقت مست سرشار رہتے تھے، مہاراجا نے خیال کیا سرشار کی طرح ریاض بھی حسب پییں، سنوں گے۔ اس خیال کے وجوہ بھی تھے۔ اردو زبان میں "خمریات" کے موجد و مخترع بھی تھے، جس واقعیت اور اصلیت کے ساتھ انھوں نے شراب کے مضامین باندھے، اس میدان میں کوئی ان کا حریف نہیں، لیکن عمل کا یہ حال کہ زندگی کے کسی دور میں شراب کا ایک قطرہ بھی زبان پر نہیں رکھا، اب شراب جو سامنے آئی تو یہ دنگ، نہ انکار کر سکتے ہیں، نہ پی سکتے ہیں، نہ جامِ ارغوانی سے آنکھ پھیر سکتے ہیں، فرماتے تھے، میں بڑے پس و پیش میں پڑ گیا، آخر ایک ترکیب سوجھی، میں نے کہا "بوتل فوراً میرے سامنے سے ہٹا ہے،

میں ضبط نہ کر سکوں گا، پینے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ یوں کا تو بس نہیں کروں گا، اور ڈاکٹر کا فیصلہ یہ ہو کہ اگر تم نے کم از کم چھ مہینے تک شراب سے اجتناب کامل نہ کیا تو کانسا لگے گا اور فوراً مرجاؤ گے" فوراً میز سے شراب کی بوتلیں ہٹا لی گئیں، ریاض کی رندی میں شبہ نہیں لیکن ان کی پارسائی بھی ایک حقیقت ہو!

مؤرخ —— یہ ایک تاریخی رسالہ تھا، مولانا عبدالحلیم صاحب شرر اس کے ایڈیٹر تھے۔ اچھا رسالہ تھا، زیادہ دن نہیں چلا۔

مخزن —— شیخ عبدالقادر کی ادارت میں شائع ہوتا تھا وہی شیخ عبدالقادر جو بعد میں پنجاب کی کونسل کے صدر، پھر پنجاب کے وزیر تعلیمات، بعد ازاں لاہور ہائی کورٹ کے جج، پھر لندن میں وزیرِ ہند کے مشیر، آخر میں عارضی طور پر سر ظفر اللہ خاں کے بجائے وائس رائے کونسل کے ممبرِ قانون مقرر ہوئے اور اب ریاست بہاول پور میں ہائی کورٹ کے چیف جسٹس ہیں، سر کے خطاب سے بھی نوازے جا چکے ہیں، اُردو کا بڑا ستھرا ذوق رکھتے ہیں، ذاتی ارتقا کے ہر دور میں اُردو سے ان کی شیفتگی برابر قائم رہی۔

ملک کے چوٹی کے رسالوں میں مخزن کا شمار ہوتا تھا۔ اس نے ایک نئی طرح قائم کی، پاکیزہ، ستھرا، کارآمد لٹریچر مخزن کا طغرائے امتیاز تھا۔ اس کے لکھنے والوں میں ڈاکٹر (علامہ) اقبال مرحوم، چودھری خوشی محمد ناظر، مولانا راشد الخیری مرحوم،

خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ شیخ عبد القادر خود کم لکھتے تھے لیکن ترتیب و تہذیب مضامین کے فن میں ماہر تھے، وہ پرچہ اس خوبی سے مرتب کرتے تھے کہ پڑھنے والا ان کے وقارِ ادارت سے مرعوب ہو جاتا تھا۔ یہی وصف دلگیر صاحب میں بھی تھا۔

خوب یاد آیا، مرزا سلطان احمد بھی اس پرچے میں مضمون لکھا کرتے تھے، یہ مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کے فرزندِ اکبر تھے، لیکن ان کے مسلک سے الگ تھے۔ یہ بڑے پُر بیس تھے، خیالی اور نیم تحقیقی مقالات خوب لکھتے تھے، طول نویس بھی بہت تھے۔

نقیب ــــ بدایوں سے نکلتا تھا۔ وحید احمد صاحب اس کے ایڈیٹر تھے، بہت بلند پایہ مضامین اس میں شائع ہوتے تھے، اس نے ایک خاص قسم کا لٹریچر پیدا کیا تھا، اس کے مضمون نگاروں میں قاضی عبد الغفار اور میر محفوظ علی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اس پرچے میں سیاسی مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ علی برادران کا یہ "نقیب" تھا!

معلومات ــــ لکھنؤ سے نکلتا تھا، حکیم عبد الوالی مرحوم اس کے ایڈیٹر تھے، والی صاحب کا طرزِ فکر و نظر برنرڈ شا سے ملتا جلتا تھا، وہی بے باکی اور صاف گوئی، وہی ان مسلّمات سے انکار جو عام طور پر مقبول ہوں اور لطف لے لے کر ان کی دھجیاں بکھیرنا۔

اس پرچے کے مضمون نگاروں میں چودھری محمد علی (ردولوی) اپنے دل چسپ طنزیہ مضامین کے لیے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

کہکشاں —— یہ پرچہ سیّد امتیاز علی تاج لاہور سے نکالتے تھے، ادبی پرچہ تھا، علمی اور تحقیقی مقالات بھی اس میں شائع ہوتے تھے۔ پریم چند، راشد الخیری، خواجہ حسن نظامی، سجاد حیدر، سالک جیسے لوگ اس کے مستقل مضمون نگاروں میں تھے۔

چند سطریں "خوابِ کلکتہ" کے متعلق بھی۔

یہ ایک ضخیم ناول ہے، مصنف نے ستم ظریفی یہ کی ہے کہ دوسرے حصے کی اشاعت پہلے حصے کے قارئین کی رائے پر رکھی۔ میں نے اُردو کے تقریباً تمام ناول، افسانے، قصے اور کتابیں دیکھی ہیں، لیکن "خوابِ کلکتہ" کے گم نام مصنّف نے (کہ مصنّف نے اپنا نام پردۂ خفا میں رکھا ہے) جس خوبی سے ایک شریف مسلمان گھرانے کی معاشرت کا نقشہ کھینچا ہے، جس ستھراپے سے انسانی جذبات کی تحلیل کی ہے، جس قابلیت سے فطرتِ انسانی کے اسرار بے نقاب کیے ہیں، جس ماہرانہ دست کاری سے اخلاق و کردار، حُسن و عشق، حُسن اور جذبے کی ایک ایک لہر کی تصویر کھینچی ہے، اس کی مثال کم از کم اُردو میں تو اب تک کہیں نظر نہیں آتی۔

اب تو یہ کتاب شاید بالکل نایاب ہے، فہرستوں میں بھی اس کا ذکر نہیں آتا۔

ریاض صاحب گورکھ پور سے چند روز کے بجائے تقریباً دو مہینے میں واپس آئے ، اس عرصے میں میں نے مطالعے کے ساتھ ساتھ لماری کی آراستگی اور صفائی پر بھی خاص توجہ کی تھی ، یہ دیکھ کر بہت خوش ہوتے اور اب مجھے ان کی قیمتی لائبریری سے استفادہ کرنے کی پوری پوری آزادی حاصل ہوگئی ۔

(۸)

ریاض صاحب کا ایک شعر ہی:

رِند قانع ، متوکّل ہو خدا دیتا ہی
جب وہ پاتا ہو تو پیتا ہی، پلا دیتا ہی

یہ شعر ان کی زندگی کی تفسیر ہی۔

کسبِ زر کے لیے انھوں نے اپنے وقار کو کبھی مجروح نہیں کیا۔ ایک زمانہ تھا کہ انھوں نے ہزاروں رُپیہ ماہ وار پیدا کیا اور اللّے تللّے سے خرچ کیا، پھر وہ زمانہ آیا کہ ان کی آمدنی جو کبھی بحرِ بےکراں کی حیثیت رکھتی تھی ، گھٹتے گھٹتے ایک جوے کم آب رہ گئی ، لیکن اس دوَر میں بھی ان کی شوخی ، ان کی بذلہ سنجی ، ان کی قناعت اور ان کی خودداری میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ اس سبھاؤ سے رہتے تھے کہ انتہائی جزرسی سے کام لے کر اپنے سارے مصارف پورے کر لیتے تھے ، کبھی کسی سے قرض نہیں لیتے تھے ، تھوڑا بہت پس انداز بھی رکھتے تھے کہ وقتِ ضرورت کام آئے ۔ گھر سے

لوگ ان کے اس رکھ رکھاؤ کی قدر نہیں کرتے تھے۔ وہ سمجھے تھے کہ ان کی جُزرسی اور کفایت شعاری بخل تک پہنچ گئی ہو، ورنہ ان کے پاس ہزاروں روپیہ ہو جسے وہ چھپاتے ہیں یہ غلط خیال تھا، ان کے پاس کوئی اندوختہ نہیں تھا، صرف ان کا سلیقہ تھا جو ان کا بھرم قائم رکھے ہوئے تھا۔

ریاض صاحب کے دونوں بھائی مالی اعتبار سے بہت کامیاب تھے، نیاز صاحب کو پنشن اور ریاست کی تنخواہ ملاکر چار سو ماہوار کے قریب مستقل آمدنی تھی، فیاض احمد صاحب کی بھی خاصی آمدنی تھی، ریاض صاحب کا اخبار اور پریس بند ہو چکا تھا، محمود آباد سے انھیں چالیس پچاس روپے ماہوار ملتے تھے اور وہ اسی پر قناعت کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے بھائیوں کی، ان بھائیوں کی جو الگ گٹ بیٹھے اور جن کی فیاضیاں خاندان کے ضرورت مندوں پر ابرِ کرم کی طرح برستی رہتی تھیں —— کوئی مدد کبھی نہ قبول کی نہ اس کے جویا ہوئے۔ اپنے بھائیوں سے وہ بہت محبت کرتے تھے، لیکن کبھی دونوں میں سے کسی سے سیدھے منھ بات بھی نہیں کرتے تھے، اپنی مختصر آمدنی میں وہ گھر کے سارے مصارف خوش اسلوبی سے پورے کر لیتے تھے۔

مرحوم سر علی محمد خاں، مہاراجا محمود آباد ریاض کے بڑے قدردانوں اور مداحوں میں تھے، جب ملاقات ہوتی،

اصرار کرتے آپ لکھنؤ تشریف لے آئیے، ان کی طرف سے اذنِ عام تھا کہ لکھنؤ کے قیام کی صورت میں مکان ریاست کی طرف سے ملے گا، وظیفہ سو رُپے ہو جاتے گا، بچّوں کی تعلیم و تربیت کا بار مہاراجا صاحب بہ نفسِ نفیس برداشت کریں گے، لیکن خیر آباد کی پُرسکون زندگی انھیں اتنی مرغوب تھی کہ ان ترغیبات سے وہ ذرا بھی متاثر نہ ہوئے، وعدہ کر لیتے، لیکن اسے پورا نہ کرتے۔ خیر آباد کے پچاس رُپے انھیں لکھنؤ کے دو سو کے مقابلے میں بھی زیادہ تھے۔

بعض دوسرے والیانِ ریاست کی طرف سے کبھی کبھی بالواسطہ کوشش ہوتی رہتی تھی کہ وہ خیر آباد کا قیام ترک کر کے وہاں چلے جائیں، لیکن ان تحریکوں کا جواب ان کے ہاں ایک تبسّم سے زیادہ نہیں تھا۔ جب کوئی ناگہانی ضرورت پیش آجاتی تو وہ مہاراجا صاحب محمود آباد کے پاس جاتے اور ان سے امداد کے طالب ہوتے، مہاراجا صاحب نے کبھی ان کی بات رد نہیں کی، فوراً ان کی فرمایش پوری کرتے۔

محمود آباد کے مختارِ کُل ڈپٹی حبیب اللہ صاحب تھے۔ مہاراجا صاحب مرحوم کو ان پر کامل اعتماد تھا، ساری ریاست کے سیاہ و سفید کے یہ مالک بنے ہوئے تھے۔ ان کے اقتدار اور سطوت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مہاراجا صاحب کے بعض احکام کی بھی پروا نہیں کرتے تھے، ریاست کا مفاد اس سختی سے پیشِ نظر رکھتے تھے کہ

کبھی کبھی نقد اپنی تنخواہ میں تخفیف کر لیا کرتے اور اسی ساتھ ہی مہاراجا کے جیب خرچ میں حسبِ مرضی کمی کر دیتے تھے۔

ڈپٹی صاحب سے اور ریاض سے نہیں بنتی تھی ریاض صاحب کا وظیفہ بند ہو گیا ہوتا اگر شخصی طور پر مہاراجا مرحوم بار بار اسے اپنی نگاہ میں نہ رکھتے۔ ریاض نے اپنی خودداری اور وقار کو قائم رکھتے ہوئے ڈپٹی صاحب کو رام کرنے کی کوشش کی، ایک مرتبہ انھوں نے کہا:

بہ فرض، پاؤں کبھی میں جوابِ تلخ اگر

مزہ شراب کا دے تلخیِ جواب حبیب

لیکن ڈپٹی صاحب کی روش قائم رہی۔ ایک بار مہاراجا صاحب نے ریاض صاحب کے حسبِ طلب انھیں سو روپے مرحمت فرمائے، ریاض صاحب کو خط لکھ دیا کہ وہ ڈپٹی صاحب سے رقم وصول کر لیں، ریاض صاحب نے اس رقم سے ہاتھ اٹھا لیا لیکن ڈپٹی صاحب کے پاس نہیں گئے۔

ایک بار ایک پُر لطف قطعہ بھی، ڈپٹی صاحب پر کہا:

نگاہِ شیخ میں سیّد کی آبرو کیا ہے؟

یہ قطعہ انھوں نے مزے لے لے کر مجھے بھی سنایا تھا، یہ قطعہ (۲۱) اشعار پر مشتمل تھا، دیوان میں شامل نہیں کیا گیا میرے پاس اس کی کوئی نقل نہیں ہے، اس قطعے کے چند اشعار دیوان میں قاضی تلمذ حسین کے اس نوٹ کے ساتھ

شائع ہوئے ہیں:-

"یہ غزل دراصل ۲۱ شعروں کی ہو مگر اس میں کچھ شخصی اشارات ہیں، مسودے کے حاشیے پر (ریاض صاحب کے قلم سے) یہ ہدایت درج تھی کہ یہ غزل محفوظ رہے گی شاملِ دیوان نہ ہو گی"

وہ چھو اشعار یہ ہیں، ان سے بھی کم از کم مرحوم سے تاثرات اور جذبات کا اندازہ ہو جاتا ہو:-

نہ کام آئے جو دامن کے اشک خوں کیا ہو؟
جو کام آئے نہ آنکھوں کے وہ لہو کیا ہو
بنا ہو وعدۂ فردا سے ان کے تارِ کفن
سفید ریش کا میری ہر ایک مو کیا ہو
نہ رنگ لائے نہ بو دے اگر کریں پامال
نئی کچھ نہیں ہوں مرا خونِ آرزو کیا ہو
جو توڑیے عوض مو زرا سا پانی دے
ہمارے دل کا پھپھولا ہو یہ سبو کیا ہو
بجھے گی پیاس نہ میری اگر گلا رگڑوں
نہ آب جس میں ہو وہ خنجرِ عدو کیا ہو
جو ناشناس ہیں ان کو ریاضؔ ہو معلوم
غلام ساقیِ کوثر کی آبرو کیا ہو؟

بعض شعرا نے اپنے شاگردوں سے نذرانہ وصول کرنا اپنا شعار بنا رکھا ہو، ریاضؔ اس سے ہمیشہ مجتنب رہے:

انھوں نے سرے سے کسی کو اپنا شاگرد ہی نہیں بنایا۔ بعض لوگ فکرِ سخن کرکے ان سے صلاح و مشورہ تحریری یا زبانی طور پر لیتے تھے اور اس میں وہ بُخل بھی نہیں کرتے تھے، لیکن استادی اور شاگردی کا "رشتہ" انھوں نے کبھی نہیں قائم ہونے دیا، انھیں اس سے چڑ تھی۔

زندگی میں ریاض کو حوصلہ فرسا حالات سے دو چار ہونا پڑا ہے لیکن اس کے باوجود اس کی نکتہ رسی، دقیقہ سنجی، استادی اور کمالِ فن کے قائل ان کے معاصرین بھی تھے، میں نے حضرتِ صفدر مرزاپوری مرحوم کی غزلوں پر حضرتِ ریاض کو بارہا اصلاح دیتے ہوئے دیکھا ہے، حضرت احسن مارہروی مرحوم بھی، اکثر ان سے مشورۂ سخن فرمایا کرتے تھے، اطراف و اکنافِ ہند کے لوگ ان کے پاس "بہ غرضِ اصلاح" اپنا کلام ارسال فرمایا کرتے تھے اور بعض لوگ تو "نذرانہ" پیش کرنے پر بھی بسر و چشم آمادہ رہتے تھے۔ ریاض صاحب مشورہ دینے میں بُخل نہیں کرتے تھے، کبھی کبھی اصلاح بھی دے دیتے تھے، لیکن انھیں یہ پسند نہ تھا کہ وہ اپنا کوئی حلقہ قائم کریں اور اسے اپنی آمدنی یا بسر اوقات کا ذریعہ بنا لیں، جب وہ اپنے حقیقی اور جاں نثار بھائیوں سے اس کے متمنّی نہ ہوئے تو دوسروں کو "حسنِ طلب" سے کیا ممنون کرتے؟

حصّہ دوم

خاندان، اِبتدائی حالات

مولوی سُبحان اللہ خاں مرحوم رئیس گورکھ پور کے خاندان اور ریاضؔ کے خاندان میں بڑے گہرے مراسم تھے، جو دوستانہ حدود سے گزر کر عزیزانہ صورت میں تبدیل ہو گئے تھے۔ بالکل یہ معلوم ہوتا تھا ایک ہی خاندان کے یہ دونوں چشم و چراغ ہیں۔

ریاضؔ کے خاندان کے بارے میں مولوی صاحب مرحوم کی روایت ہے:-

"سیّد ریاض احمد صاحب نسبتاً سیّد حسینی ہیں، ان کے آباؤ اجداد ہندستان میں آنے سے پہلے ایران میں کرمان کے رہنے والے تھے۔ وہاں سے ان کے مورث علاءُالدین کے زمانے میں ہندستان آئے، یہاں (بادشاہ کی) فوج میں کوئی عُہدہ بھی رکھتے تھے، ان کی فوج (ایک مہم سر کرنے کے لیے) بھیجی گئی، وہاں فتح حاصل کرنے کے بعد (یہ لوگ) چند ٹکڑیوں میں بٹ گئے اور ضلع بارہ بنکی و سیتاپور کے مختلف مقامات پر آباد کر دیے گئے۔

منشی ریاض احمد کے اجداد کی تولی خیرآباد ضلع سیتاپور میں آکر آباد ہوئی، جس میں ایک زمانے تک علما و فضلا رہے، جن کے ذمے قضا کا عہدہ کر دیا گیا تھا۔ علام و فنون خاندانی چیز تھی، ریاض کے والد انگریزی حکومت کے مختلف عہدوں پر فائز رہے، ان کے تین بیٹے تھے، پہلے سیّد ریاض احمد صاحب، دوسرے سیّد نیاز احمد صاحب، تیسرے فیاض احمد صاحب، تینوں بھائی پولیس میں ملازم ہوئے، منشی ریاض احمد صاحب مستعفی ہو گئے، سیّد نیاز احمد بھوپال میں سپرنٹنڈنٹ پولیس بھی رہ چکے ہیں اور حکومتِ انگریزی کے پنشنر ہیں۔"

خاندانِ ریاض کے ایک اہم رُکن سیّد عقیل احمد صاحب ہیں جنھوں نے خاندانی شجروں، دستاویزوں، پُرانی تحریروں، شاہی جاگیرات کی سندوں کی بڑی چھان بین کی ہے، ان کا بیان ہے کہ:

ریاض صاحب کے آبائے کرام میں اکثر حضرات سلاطینِ روزگار کی جانب سے معزز عہدوں پر مامور ہوتے رہے، چناں چہ خیرآباد کا عہدۂ قضا آپ ہی کے خاندان سے مختص تھا جس کے صلے میں شاہانِ وقت کی طرف سے جاگیریں بھی عطا ہوئی تھیں۔ جو کم و بیش غدر کے زمانے تک باقی رہیں۔ خیرآباد کا محلہ قضیارہ اسی عہد کی یادگار ہے۔ ریاض کے والد ماجد مولوی سیّد طفیل احمد صاحب

بڑے پایے کے عالم تھے، آپ کا نسب حضرت مخدوم شیخ سعد رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ حضرت قاضی سیّد بخش رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلے سے حضرت سید شاہ شجاع کرمانی تک پہنچتا ہے۔

حضرت قاضی سید بخش کا مزار مکانِ ریاض سے متصل ہے۔ انھی کے زیرِ سایہ بزرگانِ ریاض محوِ خواب ہیں"

بچپن، نشو و نما!

ریاض نے قدیم شرفا کی طرح اپنی تعلیم کا آغاز فارسی سے کیا، سید طفیل احمد صاحب خود فارسی اور عربی کے جید عالم تھے، فارسی کی ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار سے حاصل کی، پھر عربی کے لیے مدرسۂ عربیہ میں داخل ہوئے، تعلیم کی تکمیل نہ ہو پائی تھی کہ طبیعت شعر و سخن کی طرف مائل ہوئی اور تعلیم کا سلسلہ ختم ہوگیا۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ نواب میر مظفر علی خاں اسیرؔ کا طوطی بول رہا تھا، ریاضؔ نے اسیرؔ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، اسیرؔ اگرچہ ریاضؔ سے بہت محبّت کرتے تھے، لیکن خود ریاضؔ ان سے زیادہ مانوس نہ ہوسکے، ابتدا میں ان پر غالبؔ کا رنگ غالب تھا، چاہتے تھے انھی کی طرح مشکل الفاظ، پُرپیچ ترکیبوں اور ثقیل جملوں کو استعمال کرکے اُستاد پر اپنی دھاک بٹھائیں۔

اسیرؔ اس اُپج کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے تھے، بلکہ

انھوں نے انھیں چڑھانے کے لیے یہ وطیرہ اختیار کر لیا تھا کہ حضرت ریاض نے "بہ غرضِ اصلاح" کوئی شعر "عرض" کیا اور جناب اسیر نے ہم نشینوں سے فرمایا "بوجھیے"! گویا ریاض نے کوئی کہ مکرنی یا پہیلی سنائی تھی، جسے "بوجھنے" کے لیے اسیر صاحب حاضرینِ بزم کو طبع آزمائی کی دعوت دیا کرتے تھے۔ ریاض کو یہ چیز کھٹکتی تھی، لیکن سوا اس کے کہ ؎

ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرماں رفتم

کا ورد کرتے ہوئے قفسِ اسیر سے واپس آجائیں اور کر ہی کیا سکتے تھے۔

ریاض کی خوش قسمتی سے یہ اسیر کا آخری زمانہ تھا۔ امیر عملاً ان کے جانشین بن چکے تھے۔ کچھ عرصے بعد اسیر نے جان، کا یہ جنجال امیر کے سپرد کر دیا، ریاض نے اپنا کلام انھیں دکھانا شروع کر دیا، نئے استاد سے ریاض کو بے حد عقیدت تھی اور استاد کی طرف سے بھی مہر و محبت اور شفقت و مرحمت کا کوئی درجہ اٹھا نہیں رہتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ریاض کی وہ طبیعت جو اسیر کے حلقے میں بجھی بجھی سی رہتی تھی، امیر کے چمن زار میں کلی کی طرح کھِل گئی۔ اغلاق اور پیچیدگی کی جگہ اب شوخی اور شرارت آگئی، روانی اور سلاست پیدا ہو گئی، شستگی اور شگفتگی نے اپنا جلوہ دکھایا۔ استاد نے یہ جوہر قابل

عا تو زیادہ توجہ کرنی شروع کر دی۔ شاگرد سے یہ شفقت دیکھی تو طبیعت کو تخیل کی وادی میں آزاد چھوڑ دیا۔ یہی وہی ریاض جو اسیر کے ہاں نہ تھے، امیر کے ہاں آ کر سب کچھ ہو گئے۔

ریاض کا مستقل قیام نہ لکھنؤ میں تھا نہ خیرآباد میں، والد کے ساتھ ساتھ وہ بھی ایک شہر سے دوسرے شہر میں پہنچا کرتے تھے اور بلا ارادہ "سیروا فی الارض" پر عمل کیا کرتے تھے۔

گورکھپور میں

اسی اثنا میں طفیل احمد صاحب کا تبادلہ گورکھ پور میں ہو گیا، مولوی سُبحان اللہ خاں صاحب فرماتے ہیں:-

"منشی سید طفیل احمد صاحب خیرآبادی پھرتے پھراتے انسپکٹر پولیس ہو کر گورکھ پور میں تشریف لائے۔ اس وقت یہاں کے امرا شرفا بھی کسی نہ کسی علم میں، کسی نہ کسی فن میں دست گاہ رکھتے تھے۔

اس ماحول میں منشی سید طفیل احمد صاحب کا انسپکٹر ہو کر آنا، فارسی اور اُردو تہذیب کا مجسمہ تھا جو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ وہ اپنے سے زیادہ عمر والوں کی مجلس کی رونق افروزی کرتے تھے، ان کے لڑکے ریاض احمد گورکھ پور کے امراء و شرفا کے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ گھل مل کر کھیلتے

رہے اور تعلیم پاتے رہے۔

جو پوَد ریاضؔ کے ساتھ گورکھ پور کے اُمرا و شرفائے ہند و مسلمانوں کی بڑھ رہی تھی، وہ گویا کہ ایک خوش بودار پھولوں کا باغ تھا، جس میں ریاض بلبلِ شیراز بنا ہوا تھا۔ گورکھ پور کی جوان ہونے والی جماعت سے لے کر بڑھاپے تک نہ پہنچنے والی ہر جماعت صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک بے ریاضؔ کے زندہ رہنا نہیں چاہتی تھی۔ منشی طفیل احمد صاحب پولیس انسپکٹر تھے، گھر پر کوئی جائداد نہ تھی، جو کماتے وہی آذوقہ۔ خیامِ الہند ان کا بیٹا، اس طرح کے باپ کا بیٹا مگر اہلِ گورکھ پور میں اس طرح پل رہا تھا کہ امیر سے امیر کا بیٹا اور ریاضؔ دن رات کی زندگی میں ایک دوسرے سے ممتاز نہ تھے۔

جب گورکھ پور کے پھولوں کا یہ باغ اپنے شباب پر آیا، اس وقت صوبۂ متحدہ ایک خاص قسم کے لٹریچر سے گونج رہا تھا، وہ لٹریچر اس مانجھی کا تھا جس نے علی گڑھ میں ایک ناؤ تیار کرنی چاہی تھی جس ناؤ کا نام مدرسۃ العلوم تھا اور مانجھی کا نام سر سیّد احمد خاں تھا!"

زندگی کا آغاز!

مولوی سبحان اللہ خاں فرماتے ہیں:۔

"مرحوم سیّد احمد خاں نے علی گڑھ سے "تہذیب الاخلاق"

نکالا تھا جس کے جواب میں سارے ہندستان کو چھوڑ دو تو صرف صوبہ متحدہ میں کوئی ضلع ایسا نہ تھا جہاں سے پُرانے یا نئے جوابی اخبار یا رسالے نہیں نکل رہے ہوں، گویا صوبے بھر میں "تہذیب الاخلاق" کے موافق اور مخالف لٹریچر کی آگ مشتعل ہو رہی تھی۔ کوئی گھر جو پڑھے لکھوں کا تھا، ایسا نہ تھا جس میں "تہذیب الاخلاق" اور اس کے مخالفین یا موافقین کا کوئی نہ کوئی اخبار یا رسالہ نہ آتا ہو۔

خیام الہند جوان ہو کر اگرچہ باپ کی ہم پیشگی کی وجہ سے گورکھپور ہی میں سب انسپکٹر ہو گئے تھے مگر یہ معمولی روزی کا سامان تھا، ورنہ دن رات اہلِ گورکھپور کی صحبتیں اور اس قسم کا لٹریچر، یہ ان کی زندگی کے اٹھان کا ایک اہم معاملہ تھا!"

یہ تھا وہ ماحول جس میں ریاض نے ہوش کی آنکھیں کھولیں۔ پروان چڑھے پھلے پھولے۔

جیسا کہ مولوی سبحان اللہ صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، گورکھپور ہی میں ریاض باپ کے اثر و رسوخ کی بدولت سب انسپکٹر ہو گئے تھے، واقعہ یہ ہے سید طفیل احمد صاحب اپنے دوَر کے بڑے آدمیوں میں تھے، صورت کے لحاظ سے بھی اور شخصیت کے لحاظ سے بھی، ہم نے ان کی تصویر دیکھی ہے، چوڑی دار پاے جامہ، سر پر دستار، نہایت بارُعب چہرہ، اچکن زیب تن، دُودھ کی طرح سفید داڑھی، بھرا بھرا مُنھ

سر سید کی تصویر میں بہت مشابہت ہے، ہاتھ میں ایک شمشیر آب دار لیے ہوئے کرسی پر بیٹھے ہیں۔ ان کی شخصیت کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے حکام —— انگریز حکام —— ان کا لحاظ کرتے تھے، مان رکھتے تھے، بات مانتے تھے۔ مسٹر انیس احمد عباسی ایڈیٹر روزنامہ "حقیقت" لکھتے ہیں:

"حضرت ریاض خیرآباد ضلع سیتا پور کے ایک معزز خاندان کے رکن تھے، آپ کے والد سید طفیل احمد صاحب محکمۂ پولیس میں انسپکٹر تھے، حکامِ اعلا میں ان کا کمال درجہ پاس و لحاظ کیا جاتا تھا، انھیں سرکاری یونیفارم سے بھی مستثنیٰ کر دیا گیا تھا!"

ایسے باپ کا لڑکا اگر نو عمری ہی میں سب انسپکٹر ہو جائے تو حیرت نہیں۔ ریاض صاحب ملازم تو ہو گئے، لیکن یہ عظیم الشان "بارِ امانت" ان کے اُٹھائے اُٹھ نہ سکا، کہاں ان کی وارفتہ مزاج اور لااُبالی طبیعت اور کہاں سرکاری ملازمت کی گراں بار ذمّے داریاں:

میں کہاں اور یہ وبال کہاں؟

ان کی طبیعت اس تنگ نائے میں گھبراتی تھی، وہ اپنے لیے وسعت کی جویا تھی:

کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے!

آخر انھوں نے یہ تسمہ لگا نہ رہنے دیا اور اس خوشی

سے ملازمت سے علاحدہ ہو گئے جیسے کسی کو کوئی بہت بڑی ملازمت مِل جاتی ہی!

(۲) ریاضؔ اور گورکھپور

وہ گلیاں یاد آتی ہیں جوانی جن میں کھوتی ہی
بڑی حسرت سے لب پہ ذکرِ گورکھ پور آتا ہی!

گورکھ پور، ریاضؔ کے لیے صرف وہ شہر نہیں تھا جہاں دبدبے اور طنطنے سے ان کے والد دادِ حکومت دے رہے تھے، جہاں وہ عیشِ اِمروز میں مصروف اور غمِ فردا سے بیگانہ تھے، جہاں دوستوں کی بزم آرائیوں اور محفل طرازیوں کی رونق بنے ہوئے تھے بلکہ وُہی ریاضؔ کا گہوارۂ شباب تھا، یہیں ان کی جوانی نے انگڑائیاں لیں، یہیں اس نے چشمک زنی سیکھی، یہیں عروج و ارتقا کے منازل تک پہنچی۔ گورکھپور کو ریاضؔ سے وہی نسبت تھی جو مجنوں سے نجد کو تھی، یہ ان کا نجد تھا، وہ اگر کرشن تھے تو گورکھ پور ان کا متھرا تھا، یہاں کی گوپیوں میں واقعی وہ کرشن کنھیا نظر آتے ہیں، وہی مدبھری تانیں، وہی وہ ان کا نظر فروز حُسنِ مردانہ، وہی وہ ان کی بانکی، البیلی اور من چلی ادائیں:

دنیا کی پڑ رہی ہیں نگاہیں ریاضؔ پر
کِس نوک کا جوان ہی کس آن بان کا!

یہاں ان کے عشق نے خروشِ پیہم کی منزلیں طے کیں، یہاں

ان کے عشق نے حسن کی کشاکش کا نظارہ کیا، یہاں ان کی جوانی نے آسودگی اور عافیت کی وادیوں میں سکون، سکوت اور اطمینان کے دن تیر کیے، یہاں انھوں نے دل کی دُنیا بسائی اور اس دنیا کے شہر یار بن کر رہے، یہاں کا ذرّہ ذرّہ، چپّہ چپّہ، گوشہ گوشہ ان کے لیے دامانِ باغ بان و کفِ گُل فروش تھا۔

یہی وجہ تھی کہ گورکھ پور کا نام ان کے تارِ حیات پر مضراب کا کام دیتا تھا، اس نام میں زندگی بھر وہ اتنی شیرینی، اتنی جاذبیت اور اتنی کشش محسوس کرتے رہے کہ یہ تذکرہ ان کے لیے جانِ سخن کا حکم رکھتا تھا:

اِک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے!

گورکھ پور کا نام آیا اور ان کی گزری ہوئی جوانی واپس آ گئی۔ ایک بار انھوں نے اپنے خمریات کے سلسلے میں کہا تھا:

یہ چھلکتا ہوا کیا جامِ شراب آتا ہے
اے میں قربان مرا عہدِ شباب آتا ہے

چھلکتے ہوئے جام کی جگہ اگر گورکھ پور کا ذکرِ رنگیں رکھ دیا جائے تو یہ شعر ان کے لیے واقعہ بن جائے۔

وہ گورکھ پور کا ذکر بار بار کرتے تھے، اس ذکر سے کبھی نہیں تھکتے تھے۔ یہ وہ موضوع تھا جو ہمیشہ نامکمّل رہتا تھا، یہ وہ پیاس تھی جس کی تشنگی کبھی نہیں بجھی، یہ وہ

افسانہ تھا جو زلفِ دراز کی طرح، طول شبِ فراق کی طرح بڑھتا جاتا تھا، گھٹنے کا نام نہ لیتا تھا:

پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ
بس آج کی شب بھی سو چکے ہم!

یہ قصہ جب وہ چھیڑتے تھے تو نہ سننے والے گھبراتے تھے نہ وہ سناتے سناتے تھکتے تھے۔

ریاض گورکھپور سے لکھنؤ آ گئے، لکھنؤ سے اٹھے اور خیرآباد کی مستقل اقامت اختیار کر لی، مگر ان کا دل ہمیشہ گورکھپور میں رہا۔

عربی زبان کا مشہور شاعر متنبی جب اپنے ممدوح کے ہاں سے رخصت ہونے لگا تو اس نے کہا:

وانی عنك بعد غد لغاد　　وقلبی عن فنائك غیر غاد
محبك حیث ما اتجهت ركابی　　وضیفك حیث كنت من البلاد

یعنی:-

"میں کل تجھ سے رخصت ہو رہا ہوں، لیکن میرا دل اسی مکان کا مکین رہے گا۔

میری سواری مجھے کسی طرف بھی لے جائے، میں کسی شہر میں بھی اتروں لیکن مہمان تیرا ہی رہوں گا!"

متنبی نے جو کچھ کہا تھا، شاعرانہ ترنگ میں کہا تھا لیکن ریاض کی زندگی ان اشعار کی عملی تفسیر تھی۔ وہ جہاں کہیں بھی رہے۔ جہاں کہیں بھی گئے گورکھپور ان کے دل و دماغ پر ہمیشہ چھایا رہا۔

یہ وہ داستان تھی جس کے کسی ٹکڑے کا بھلانا ممکن بھی نہ
بہ قولِ حسرتؔ:

بھلائے یہ بھی قصۂ ربط ماضی
بھلایا نہ جائے گا — ہم سے نہ تم سے!

اور سچ یہ ہے کہ طرفین میں سے "قصۂ ربط ماضی" کوئی بھی نہ بھلا سکا!

مجنوں کا بیان

جناب مجنوںؔ گورکھ پوری فرماتے ہیں:۔

"اپنے شہر اور خصوصیت کے ساتھ اپنے گھر میں جس شاعر کی دھوم تھی، وہ ریاضؔ تھے، جس کے نام کے آگے ایک مدت تک خیرآبادی کا تصور ہم لوگوں کے ذہن میں نہیں آیا، ہم لوگ عرصے تک ریاضؔ کو گورکھ پور کی چیز سمجھتے رہے۔ اس لیے کہ گورکھ پور ان کی جوانی کی جولان گاہ رہا اور بڑھاپے میں بھی وہ اپنے داغ کہنہ تازہ کرنے گورکھ پور برابر آتے رہتے تھے، وہ میرے خسر مولوی افراغ صاحب مرحوم سے ملنے آیا کرتے تھے، جو ان کے جوانی کے رفیق تھے اور جن کے ساتھ مل کر وہ کسی زمانے میں "تصویر" کے عنوان سے رینالڈ کے (Bronze Statue) کا ترجمہ کر رہے تھے۔

داستانِ فراقؔ!

منشی رگھوپتی سہائے فراقؔ گورکھپوری پروفیسر الہ آباد یونی ورسٹی فرماتے ہیں:۔

"میرا وطن وہی شہر گورکھپور ہے جس کی وہ گلیاں جن میں ریاضؔ نے اپنی جوانی کھوئی تھی، ریاضؔ کو عمر بھر یاد آتی رہیں۔ یوں تو اپنی عمر کے آخری تیس برس ریاضؔ نے کبھی لکھنؤ اور کبھی خیرآباد میں گزارے۔ لیکن ان مقامات پر وہ مہمان کی طرح رہے اور گورکھپور چھوڑنے کے بعد بھی جب زخمِ کہنہ تازہ کرنے کے لیے وہ گورکھپور آجاتے تھے تو ان کے چہرے کا وہ رنگ ہوتا تھا جو صبح وطن ہی پیدا کرسکتی ہے۔ اسے میری نگاہوں نے خود بھانپا ہے!"

مجنوںؔ اور فراقؔ کے یہ بیانات واقعیت اور حقیقت کے مظہر ہیں!

مجنوںؔ صاحب اپنے ایک بیان میں فرماتے ہیں:۔

"یوں تو ریاضؔ عمر بھر جوان رہے اور جس کے ساتھ دم بھر کو بیٹھے، اس کو جوان بنا دیا، لیکن ریاضؔ کی وہ جوانی جس کو عرفِ عام میں بھی جوانی کہتے ہیں، واقعی دیوانی تھی، ان کی شاعری کا ایک ایک حرف اس کا غماز ہے، گورکھپور کی سرزمین ان کے ولولۂ شباب کی شاہد ہے، گورکھپور نے ان کی جوانی کے لیے جولان گاہ مہیا کی اور انھوں نے اپنی

شاعری سے گورکھ پور کو غیر فانی بنا دیا۔ ریاضؔ نے عمر کا بیش تر حصّہ گورکھ پور کی سیر میں بسر کیا ہو اور اس پورب دیس کی یاد ہمیشہ ان کی روح سے لپٹی رہی، وہ اس پیرانہ سالی میں بھی گزرے ہوئے زمانے کی یاد تازہ کرنے گورکھ پور برابر آتے رہے، خود کہتے ہیں:

اے ریاضؔ اس طرح آ جاتا ہو دو دن کو شباب
داغِ کُہنہ تازہ کر لاتے ہیں گورکھ پور سے!"

تذکرۂ رنگیں

امراء القیس عربی زبان کا زندۂ جاوید شاعر ہو، عہدِ جاہلیت کا شاعر تھا، لیکن آج تک اقلیمِ سخن پر اس کا سکّہ چل رہا ہو، اس کی شاعرانہ عظمت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہو کہ خود سرورِ کائنات بھی اور حضرت فاروق اعظمؓ بھی اس کی شاعرانہ بزرگی کو مانتے تھے۔

ایک مرتبہ امراء القیس کا گزر دیارِ محبوب کی طرف ہوا، اپنے ایک قصیدے میں بے تابانہ کہتا ہو:۔

قفا نبك من ذکری حبیب منزل
بسقط اللوی بین الدخول فحول

ریاضؔ جب دیارِ محبوب سے جدا ہونے لگے تو کہتے ہیں:۔

ہوئی ہو میری جوانی فدائے گورکھ پور
لحد سے آئے گی آواز ہائے گورکھ پور

اودھ کی شام، بنارس کی صبح صدقے ہو
کہ اک جہاں سے جدا ہی ہوائے گورکھ پور
میں اپنے خون تمنا سے سینچ آیا ہوں
حسین رنگاتیں منگا کر حنائے گورکھ پور
پکارتی ہیں یہی دل فریبیاں اس کی
جسے ہو آکے نہ جانا وہ آئے گورکھ پور
پرستش اس کی ہمارا تو دین وایماں ہو
عجیب چیز ہو مہماں سرائے گورکھ پور

یہ تو مسلسل اشعار ہیں، ان سے قطع نظر انھوں نے اپنی متعدد غزلوں کے مقطعوں میں گورکھ پور کا ذکر بڑی حسرت سے کیا ہو۔ ایک غزل کا مقطع ہو:۔

ریاضؔ اب کیا کریں ہم قصد خیر آباد جانے کا
نصیبوں میں لکھا ہو خاکِ گورکھ پور ہو جانا

اس طرح کے اشعار تلاش کیے جائیں تو کافی مل سکتے ہیں، لیکن اب اس داستان کو کہاں تک طول دیا جائے:

رات اور زلف کا یہ افسانہ قصہ کوتہ بڑی کہانی ہو!

(۳) زندگی کے رومان

جو کھلا پھول بنا زخم مرے دل کا ریاضؔ
جو کلی رہ گئی کھلنے سے بنی دل میرا

ریاضؔ اوباش طبع نہیں تھے، آوارہ مزاج اور کوچہ گرد

بھی نہیں تھے، بدنظر اور تاک جھانک کرنے والے لوگوں میں بھی ان کا شمار نہیں تھا، عیّاش اور تماش بین بھی نہیں تھے۔ وہ بڑے کردار کے شخص تھے، لیکن آدمی تھے، سینے میں دل رکھتے تھے، دل مُردہ نہیں تھا، آرزوؤں اور تمنّاؤں کا مرکز، رنگینیوں کا مرقّع، وہ اپنی زندگی کے کسی دوَر میں جادۂ اخلاق سے منحرف نہیں ہوتے، کوئی حادثۂ رنگیں ان کے پائے ثبات میں لغزش نہ پیدا کرسکا، انھوں نے اپنی زندگی کو کبھی بھی بے راہ نہیں ہونے دیا۔ ان کی رِندی پر پارسائی نثار تھی، ان کی رنگینی پر تقدّس صدقے ہوتا تھا، ان کی بے باکی پر وضع احتیاط نازاں تھی، وہ چاہتے تو بہت آسانی سے جرأتِ رندانہ کو کام میں لا سکتے تھے، لیکن ان کی جرأتِ رندانہ ہمیشہ پاک بازی کے دامن سے لپٹی رہی۔

ریاضؔ بہت حسین تھے اور اس کا خود انھیں بھی بغیر کسی انکسار کے اعتراف تھا، فرماتے ہیں:۔

کیا جانے کیوں رقیب بنا تھا گلے کا ہار
صورت میں وہ ریاضؔ سے اچھا تو کچھ نہ تھا

نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا عشق کبھی یک طرفہ نہیں رہا، اسی لیے وہ اپنی محبّت میں ناکام بھی کبھی نہیں ہوتے۔

جناب فراق گورکھپوری فرماتے ہیں:۔

"ریاض غیر معمولی ذہانت کے آدمی تھے، ان پر جوانی

اور زندگی پھٹی پڑتی تھی۔ لکھنؤ کے دورِ انحطاط میں لکھنؤ کی سو برس کی بزم آرائیاں سمٹ کر ان کی شخصیت میں سما گئی تھیں اور وہ تمام بانکے عاشق اور ماہ پارہ عورتیں جنھوں نے کبھی لکھنؤ کو لکھنؤ بنا دیا تھا، سب کے سب ریاضؔ کی زندگی کا جزو ہو گئے تھے۔ سو برس کے لکھنؤ نے اپنے آخری لمحوں میں ریاضؔ کے اوپر اپنے آپ کو صدقے کر دیا، لُٹا دیا، پورا لکھنؤ مٹ کر ریاض بن گیا......"

فراقؔ کا یہ بیان ایک آئینہ ہے، جس میں ریاضؔ کا جلوہ دیکھا جا سکتا ہے!

فراقؔ کے موقلم کی کھینچی ہوئی تصویر نامکمل رہے گی، اگر اس کا یہ رُخ بھی سامنے نہ رہے جس کی رنگ آمیزی فراقؔ ہی کے قلم کی رہینِ منت ہے:۔

"بجائے اس کے کہ حسن وعشق کی کیفیتیں ریاضؔ پر طاری ہوں، خود ریاضؔ ان کیفیتوں پر چھائے ہوئے نظر آتے ہیں:

ہم آ گئے، ہم پا گئے، ہم لے گئے ان کو
وہ کھوئے گئے کوچۂ دشمن سے نکل کر!

یہ شخص شاعر ہے یا کرشن کنہیا ہے"

ریاضؔ کی زندگی کا یہ بالکل صحیح مرقع ہے، ایسا مرقع جس میں ان کے خدوخال بالکل صاف اور نمایاں نظر آ رہے ہیں۔

پہلا رومان!

ریاضؔ کی زندگی کا سب سے پہلا رومان، یہ داستان خود ریاضؔ کی زبان سے سُنیے:۔

"سب سے تم اچھے ہو تم سے مری قسمت اچھی
یہی کم بخت دکھا دیتی ہے صورت اچھی

اس شعر نے زبان پر آتے ہی" افسانہ از افسانہ می خیزد" کی ٹھیرا دی، ایک واقعہ یاد آگیا:

دامن یار خدا ڈھانک لے پردہ تیرا

میں کسی دوُر مقام پر ایک ایسے متقدر بزرگ رئیس کے مکان پر مہمان تھا، جس سے خاندانی روابط اور تعلقات کی وجہ سے میرا زمانۂ طفولیت وہیں گزرا تھا (بڑے ہونے کے بعد بھی) میری خاطر داشت زنان خانے میں ویسی ہی تھی جیسی بچپن میں۔ گھر کی بیبیاں، پُرانی مامائیں مجھے اسی نظر سے دیکھتی تھیں۔ کھانا دونوں وقت وہیں کھاتا، کھانے کے تخت یا پلنگ کے قریب ان کی دونوں ناکتخدا صاحب زادیاں دوہری چادر کے پردے میں وہیں آبیٹھتیں اور بیبیاں پردہ نہ کرتیں، اتنا لگاؤ بھی بُرا تھا، شرعی و رسمی حجاب کی نگہداشت بہ شدّت ملحوظ رہتی، قصبات میں نامحرم اعزّا اس زمانے میں بھی محرم سمجھے جاتے تھے اور یہ بدنما رواج کبھی کبھی کسی حد پر شرمندگی کا باعث ہوتا تھا۔

میں اعزا سے نہ تھا، بیگانہ تھا مگر اعزا سے کم نہ تھا
خاندانی شرافت صفات پر ایک حد تک خامی عمر میں بھی اثر انداز
رہتی ہی، بہ ایں ہمہ:

بساکیں دولت از گفتار خیزد

رُکنے والی چیز نہ تھی، رفتہ رفتہ اتفاقات نے یہ ترقی اور
یہ صورت بھی پیدا کر دی؛

دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی

آغازِ شباب کا خواب دیکھ رہا تھا کہ بڑھاپے نے موت
یاد دلا دی۔

کسی کا دوسری سے سن میں بڑا ہونا آنے والی قیامت
کے فتنوں کو اپنی کف پا کے لیے برگ حنا بناتے ہوئے
تھا یہ بھی قیاسی ہی، نظارۂ جمال کا کیا ذکر نقش کف پا بھی
دیکھنا نہ نصیب ہوئے تھے، نہ نوشت وخواند اس پیام و
سلام کا ذریعہ تھی، جس کا امکان نشست گاہ میں نہ تھا،
پیامی بھی ایک ضعیفہ تھی، جس نے کئی حج کیے تھے،
ہفتے کی طرح مہینے گزرتے چلے گئے، طوفانی اشکوں
کی گریز پائی چاہتی تھی نظارۂ جمال کی حسرت کو دل
سے نکال لے جائے، مگر یہ اپنی جگہ پر تھی، پردہ گہرا
ہوتا گیا، آواز میں بھی پتی لگنے کی خلش پیدا ہو گئی،
آب رو کے پاس نے میرے لیے بھی موقع کی نزاکت
بڑھا دی تھی، پھر بھی انتہائی جرأت سے مطلع کیے بغیر

ایک روز موقع مل جانے پر جب گھر کی بیبیاں کسی تقریب میں گئی ہوتی تھیں اور صاحب خانہ مع ضروری اشخاص کے علاقے پر تشریف لے گئے تھے باب کعبۂ مقصود اندرونی جانب سے اس طرح بند تھا کہ دست دعا کی جنبش جب چاہے اسے کشود کار کا ذریعہ بنا لے۔

تاریک شب کے خطرناک حصے میں چھپتا چھپاتا اس خواب گاہ ناز تک پہنچا جس کا نقشہ پہلے سے آنکھ میں تھا اور جہاں شمع کی دھیمی روشنی چہرے پر پڑ رہی تھی۔

جھجک بھی، خوف بھی، شرافت سے گرا ہوا فعل بھی گھرے پردے نے اور ڈرا دیا تھا کہ یہ کہنے کو نہ ہو:

اُٹھے فتنے نگاہ خشم گیں سے
گلے ملتے ہوئے چینِ جبیں سے!

چھپے چہرے سے آنچل کا سرکانا تھا کہ یہی صورت پیش آئی، اگر ساتھ ہی نام نہ بتا دیا جاتا تو ایک ہی چیخ رُسوائی کے لیے کافی ہوتی۔

نظارۂ جمال کی حسرت نکلی مگر بُری طرح حُسن، عشق سے زیادہ بےتاب تھا، شرعی جواز کے حدود میں آجانے کی کوشش تھی؛ بہ صورتِ حرماں نصیبی جانِ زار جمال آفریں کے سپرد کر دینے کا عزم تھا۔

اشک پیہم اور گریۂ متصل نے والدین کو سعی جواز کی طرف آمادہ کر دیا تھا، بہ ایں ہمہ ایک عفت مآب پردہ نشین

کی شرافتِ نفس کسی نامحرم کی نگاہ کو کھل کر موقع دینا نہیں چاہتی تھی، بے پردہ آواز کی طرف سے صرف سعیِ جواز کا ایما! ناکامی مجھے اپنی جگہ پر واپس لاتی، ابھی تک تو "بسا کیں دولت از گفتار" سے سابقہ تھا، اب تو نظارۂ جمال نے، ہجومِ شرار و برق نے مجھے نئے تجلّی زار میں پہنچا دیا تھا۔ وطن آنے پر میری تمام کوششیں جواز کے لیے ناکام رہیں، میری حالت میں تغیّر پیدا کرنے کو میرا عقد جوارِ وطن میں کر دیا گیا اور افسانۂ محبّت ٹریجڈی پر تمام ہوا۔

وہی پیامی ضعیفہ وطن میں میرے مکان پر یہ کہتی آئی کہ غمِ فرقت سے جاں بر ہونا محال تھا، کسی نے جانِ زار پہلے ہی جان آفریں کو سُپرد کر دی تھی۔ آخر وہ وقت آ گیا کہ ہر شخص کی زبان پر تھا:

کفن سرکا کے حُسنِ نوجوانی دیکھتے جاؤ
زرا اُفتادِ مرگِ ناگہانی دیکھتے جاؤ"

اس بیانِ واقعہ سے جہاں ریاؔض کے کردار اور محبوب کے ایثار، قربانی، پاکیزہ نفسی اور وفاداری پر روشنی پڑتی ہے، اُس عہد کی گھریلو زندگی، آپس کے رہن سہن اور عشقِ صالح کا بھی ایک نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔

ریاؔض کے اس بیانِ واقعہ کا ایک اور پہلو بھی قابلِ غور ہے، یہ کہ ریاؔض نے اپنی زندگی کے سب سے

پہلے رومان کو خود بیان کیا ہی، لیکن "ترقی پسند ادب" کی زبان میں نہیں، ہر ہر لفظ یہ معلوم ہوتا ہی کہ سوچ سوچ کر، ٹھیر ٹھیر کر لکھا گیا ہی۔ یہ ان کی تحریر کی ایک خصوصیت ہی؛ وہ واقعہ بیان کرتے ہیں، جذبات میں اشتعال نہیں پیدا کرتے، وہ داستان سرائی کرتے ہیں "شب نامچہ" نہیں کھولتے، وہ حُسن اور عشق کی کیفیتوں کو پیش کرتے ہیں، مگر اس طرح نہیں کہ تنہائی میں بھی پڑھیے تو شرم آنے لگے، اس طرح کہ بے تامّل ہر لڑکی اور ہر خاتون، ہر لڑکا اور ہر نوجوان پڑھے اور متاثر ہو، لیکن نہ پڑھتے ہوئے کہیں شرمائے، نہ مکالمے کے دوران میں اس کی پیشانی عرق آلود ہو، آج کل کی دنیا میں ریاض کا یہ "ادبِ لطیف" نہ معلوم کس عنوان کے ماتحت رکھا جائے۔

ایک اور المیہ!

ریاض کی شادی ہو گئی۔ اس طرح کہ وہ شادی پر تیار نہیں تھے مگر باپ کی قہرمانیت اور استبداد نے انھیں اس زنجیر میں جکڑ ہی دیا۔

وضع داری، شرافت اور کیے کو نباہنا ریاض پر ختم تھا۔ شادی کے بعد جن لوگوں نے ان کی عائلی زندگی دیکھی ہی، ان کا بیان ہی کہ ایسا معلوم ہوتا تھا، ریاض کی شادی کیا ہوئی انھیں دولتِ کونین مل گئی۔ ان کی یہ اہلیہ

جب تک زندہ رہیں، گھر کی ملکہ بنی رہیں۔ کیا مجال تھی ریاض سے کوئی ایسی حرکت سرزد ہو جائے جو ان کی رفیقۂ حیات کے لیے رنج دہ ہو یا انھیں ناگوار ہو۔

یہ تو تھی سطح، لیکن تہ میں کیا ہو رہا تھا؟ ایک ایسا طوفان اُمنڈ رہا تھا جس نے ان کی کائناتِ دل کو درہم برہم کر رکھا تھا۔

ان کی شادی ہو گئی، گھر آباد ہو گیا، باپ کی ضد اور ماں کی تمنا پوری ہو گئی لیکن ریاض کے دل کی کلی نہ کھلی!

ریاض کی زندگی کا دوسرا حادثہ بھی ایک ٹریجڈی پر ختم ہوا۔

ایک شریف غیر مُسلم گھرانا ہے، ریاض وہاں آتے جاتے ہیں اور ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے ہیں، گھر کیا ہے چمنستان ہے، سبدِ گل ہے، باغِ رضواں ہے، ایک گلِ رعنا سے آنکھ لڑتی ہے، محبّت کے پینگ بڑھتے ہیں، ملاقات بے تکلفی میں، بے تکلفی اُنس میں، اُنس محبّت میں اور محبت عشق میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ایک طرف عشق ہے جو چاکِ گریبانی اور بادیہ پیمائی پر آمادہ ہے، دوسری جانب حُسن ہے جو ایک گلِ نو دمیدہ کی طرح کِھل رہا ہے، باغِ ہستی کی ہوائیں اس میں تازگی پیدا کر رہی ہیں، حُسن نہ احساسِ خودی سے محروم ہے، نہ شوقِ جلوہ آرائی سے، وہ اپنی بے پناہیوں کی پرستش چاہتا ہے، اپنی گیرائیوں کا اعتراف چاہتا ہے، اپنی انفرادیت

پر نازاں بھی ہو اور مغرور بھی۔

دِن گزرتے رہے اور دِنوں کے ساتھ دونوں دِلوں میں عشق کی آگ بھی سلگتی رہی، یہاں تک غنیمت تھا، لیکن اب معاملات دوسرا رُخ اختیار کرتے ہیں، اب وہ منزل آتی ہے کہ یا تو ہجر و فراق کی کُلفتیں دُور ہوں، ورنہ رُسوائی اور بدنامی کی منزلیں طے کی جائیں۔

مذہب کی تفریق آج بھی بہت کچھ ہے، لیکن آج سے ستّر برس پہلے تو باہمی میل جول کے باوجود یہ تفریق اپنے شباب پر تھی۔ مذہب مشترک ہوتا تو ممکن تھا کامیابی کی کوئی صورت بھی نکلتی، لیکن مذہب کے اختلاف نے ایک ایسی حدِ فاصل قائم کر دی تھی جو سدِّ سکندری سے بھی زیادہ مضبوط تھی۔

ایک صورت تھی وہ یہ کہ ریاض "ننگ و ناموس" کے خیال کو تج دیتے اور طرفِ ثانی کی آمادگی نے اس راستے کی تمام واقعی اور ذہنی دشواریوں کو ختم بھی کر دیا تھا، لیکن وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ اعتماد شکن کہلائیں، انھیں یہ گوارا نہ تھا کہ ایک شریف خاندان کے ناموس کو بٹہ لگائیں، انھیں یہ پسند نہ تھا کہ اپنے دل کی تسکین و تسلی کے لیے ایک معزز خاندان کو منھ دکھانے کے قابل نہ رکھیں، وہ اپنے دل کو قربان کر سکتے تھے، اپنی آرزوؤں کو خاک میں ملا سکتے تھے، اپنا وجود ناکارہ بنا سکتے تھے، لیکن یہ نہیں

کر سکتے تھے کہ ایک خاندان کو تباہ کر دیں۔ عشق کی چنگاری سلگتے سلگتے شعلہ جوالہ بن گئی لیکن ریاضؔ کے پائے استقامت میں جُنبش نہ آئی۔

حُسن کے دربار میں عشق نے ہر طرح کے اعترافِ عجز و نیاز کے باوجود اس امر پر آمادگی کا اظہار نہ کیا کہ کوئی ایسی حرکت سرزد ہو جو حُسن کو رُسوا کردے۔

یہ بڑے دل گردے کا کام تھا مگر ریاضؔ نے کیا، وہ ایک طول دوُرے پر روانہ ہو گئے کہ اس اثنا میں شاید طرفِ ثانی کا خیال بٹ جاتے۔ کئی مہینے کے بعد واپس آئے، درِ یار تک پہنچے معلوم ہوا دِق کی شکایت ہے، معالج جواب دے چکے ہیں۔ آگے بڑھے اور حریمِ ناز میں پہنچ گئے۔ وہی چہرہ جو اپنی تازگی میں پھولوں کو، جو اپنی تابانی میں ماہِ نیم کو، جو اپنی شادابی میں گُلِ تر کو شرماتا تھا، سوکھ کر ایک بے رونق ڈھانچہ رہ گیا تھا۔ دونوں کی نگاہیں ملیں۔ ریاضؔ کہتے ہیں، اس مختصر ملاقات نے حُسن کی حالت "دگرگوں" کر دی، چند لمحوں میں یہ ملاقات ختم ہوئی اور ریاضؔ واپس آ گئے۔ دوسرے روز معلوم ہوا حیا اور عصمت کی وہ پُتلی اس جہانِ آرزو سے ناکام و نامُراد اُٹھ گئی۔ سچ کہا تھا اکبرؔ نے:

خزاں آتی ہی ہے اور خاک میں ملنا ہی پڑتا ہے
مگر کلیوں کو اِس گلزار میں کھلنا ہی پڑتا ہے

جگر کو زخم سے زخموں کو آہوں سے بچاتا ہوں
مگر لگتے ہی ہیں زخم اور انھیں جھیلنا ہی پڑتا ہے

مَیں بہت چھوٹا تھا، جب ریاض صاحب نے اس قصّے کے بعض اجزا ایک موقع پر بیان کیے تھے۔ مجھے وہ اچھی طرح یاد ہے "دگرگوں" سب سے پہلے مَیں نے انھی کی زبان سے سنا تھا۔ میرے ذہن میں متعدد ایسے الفاظ ہیں جو کسی خاص شخص کی زبان سے کسی خاص موقع پر مَیں نے پہلے پہل سُنے اور مجھے یاد ہو گئے۔ وہ الفاظ مَیں جب کسی سے سُنتا ہوں یا کہیں پڑھتا ہوں تو وہ مخصوص واقعہ بھی میرے ذہن و دماغ میں گردش کرنے لگتا ہے، یہ سانحہ مجھے لفظ "دگرگوں" ہی کی وجہ سے یاد رہ گیا!

زندگی کا سب سے بڑا حادثہ

مشرقی تہذیب میں بُرائیاں بھی اس طرح کی جاتی تھیں کہ وہ اپنے اندر کچھ نہ کچھ جاذبیت ضرور رکھتی تھیں۔ پہلے زمانے کی طوائفوں میں اور آج کی طوائفوں میں کتنا زمین آسمان کا فرق ہے؟ آج حُسن کا بازار لگتا ہے جہاں عشوہ طرازی اور ناز آفرینی کی کمی نہیں، لیکن بے باکانہ عفّت اور ناموس کا سودا ہوتا ہے۔ اس کاروبار نے عادات و خصائل، سرشت اور مزاج، اخلاق

اور انسانیت و شرافت کو بالکل مسخ کر دیا ہی، گُناہ کے کوچے پہلے بھی گناہ ہُئے کوچے تھے، لیکن ان میں وہ عفونت اور گندگی نہیں تھی جو آج نظر آتی ہی، اس طبقے میں وفاداری اور جاں نثاری کا تلاش کرنا ایسا ہی ہی جیسے کوئی شخص "ایون فریزر" یا "وہائٹ وے" کے ہاں جانماز اور مُصلّا خریدنے چلا جائے، لیکن آج سے نصف صدی پہلے کی طوائف وضع میں، بناہ میں، سُبھاؤ میں اپنی نظیر آپ تھی، اُس زمانے میں واقعی شرفا اپنے لڑکوں کو طوائفوں کے ہاں ادب و تہذیب سیکھنے بھیجا کرتے تھے، اس زمانے کی وضع اور رکھ رکھاؤ کچھ ایسا ہی تھا۔ اُس زمانے کی طوائفیں ہر جائی بھی نہیں تھیں، وہ ایک عرصے کے میل جول کے بعد کسی سے تعلق پیدا کرتی تھیں اور اسے نباہ بھی دیتی تھیں اور اگر کسی خوش قسمت کو توبہ کی سعادت حاصل ہو گئی تو یہ حقیقت ہی کہ پھر اس کی زندگی تمام تر عفت اور پاک بازی کی زندگی ہوتی تھی۔

ایک غیر مُسلم خاتون سے جو اسی گروہ سے تعلق رکھتی تھیں، ریاض کے مراسم پیدا ہوئے۔ ریاض کے مذہب میں یہ قطعاً جائز نہ تھا کہ وہ شرعی حدُود سے باہر رہ کر ناجائز زندگی بسر کریں۔ انھوں نے جب خوب جانچ کر لی اور آزما لیا تو تبدیلِ مذہب، توبہ اور نکاح کی تجویز پیش کی تینوں تجویزیں منظور کر لی گئیں۔ ریاض نے فوراً نکاح کر لیا، یہ ریاض کی زندگی کا ایک نیا دور تھا۔

دونوں کی زندگی محبت و سرور کے ساتھ بسر ہو رہی تھی، عیش امروز نے فکرِ فردا کی کھٹک کبھی نہیں پیدا ہونے دی۔ بے فکری، ابتہاج، فارغ البالی اور سکون کی زندگی تھی، بے غل و غش بسر ہو رہی تھی۔ یہ کوٹھے پر رہتی تھیں اس لیے "کوٹھے والی" کہلاتی تھیں، بڑے جاہ و دبدبے کی خاتون تھیں، مسلمان ہوتیں تو اس طرح کہ بالکل اسلامی معاشرت کے سانچے میں ڈھل گئیں۔

کئی برس اسی طرح بیت گئے کہ چرخ نادرہ کار نے ایک نیا رُخ بدلا، کبھی کبھی وہ موقع بھی آجاتا ہے کہ ایک باعفت عورت شیرنی بن جاتی ہے، ایسا ہی اتفاق ان کے سامنے بھی پیش آیا، وہ قتل کے الزام میں ماخوذ ہوتیں۔

یہ حادثہ ریاض کے لیے اتنا جگر فگار اور دل دوز تھا کہ ان کے حواس جاتے رہے۔ یہ شادی انھوں نے مخالفتوں کے ہجوم میں کی تھی، سارا خاندان ان کا شدید مخالف تھا، دوستوں کا ایک گروہ بھی ناصح مشفق بنا ہوا تھا، ان مخالفتوں کو انھوں نے ہنسی خوشی برداشت کر لیا تھا، لیکن اب یہ صدمہ کیوں کر برداشت کرتے؟ ان کے دل کا چین اور رات کی نیند اس حادثے نے اُڑا دی تھی، وہ باؤلے ہوگئے تھے، انھوں نے جو کچھ کمایا تھا، سب اس مرحلے پر صرف کر دیا، جو انھیں ہلاتے تھے اور جن کے ہاں وہ نہیں جاتے تھے، اب بے تابانہ ان کے ہاں پہنچ رہے تھے۔

اس حادثے میں ریاضؔ کے خاص خاص دوستوں نے ان کی بڑی مدد کی۔ مہاراجا محمود آباد نے اپنا سارا اثر و رسوخ صرف کر ڈالا، نوّاب حامد علی خاں فرماں روائے رام پور نے دستِ خاص سے گورنر کے نام چٹھی لکھّی، لکھنؤ کے چوٹی کے وکیلوں نے اپنی ساری نکتہ آفرینیاں اور موشگافیاں صَرف کر دیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پھانسی کی سزا تو نہیں ہوئی، البتّہ حبسِ دوام بہ عبورِ دریائے شور کی سزا ہو گئی، یہ بھی گویا پھانسی ہی تھی۔

جان ہوتی ہو جدا جسم سے گویا حسرتؔ
آساں ان سے چھڑاتا ہو جُدا ہوتے ہیں!

عدالت کا فیصلہ بہ رُوئے کار آیا اور ایک پاک باز اور پاک نہاد ملزمہ "کالے پانی" بھیج دی گئی۔ اس حادثے نے ان کے دل و دماغ پر بڑا گہرا اثر کیا، طبیعت بجھ گئی، دلولے سرد پڑ گئے۔ اُمنگیں جاتی رہیں۔ ان کی سیرت تو ہمیشہ سے بے داغ تھی، لیکن اب صورت بھی نورانی ہو گئی، کہاں تو وہ بڑی بڑی مونچھیں، مُنڈی ہوئی ڈاڑھی اور کہاں ریش دراز اور نور کی شکل!

اس واقعے کا ذکر ان کے نواسے سیّد عقیل احمد صاحب جعفری نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"الزامِ قتل سے بری کرانے کی کوشش میں حضرت ریاضؔ خود ایک اطلاعی تار دے کر رام پور پہنچے، باریابی

کے لیے دس بجے شب کا وقت ملا، ملاقات کے وقت حالات معلوم ہونے کے بعد ریاست کے چیف سکریٹری کو طلب کیا گیا، کچھ مشورے کے بعد ایک یورپین افسر بلائے گئے جن سے دیر تک گفتگو ہوتی رہی؛ پھر نواب صاحب بہادر نے دستِ خاص سے گورنر صاحب بہادر کے نام ایک چٹھی لکھ کر دی۔ حضرت ریاضؔ چٹھی لے کر مہاراجا محمود آباد کے ہم راہ شملہ گئے، گورنر صاحب نے چٹھی ملاحظہ فرما کر حضرت ریاضؔ کو جب باریاب کیا تو سب سے پہلا سوال یہ تھا "آپ ہندستان میں سب سے بڑا شاعر ہی؟"

حضرت ریاضؔ کی یہ غزل اسی زمانے کی اور اسی واقعے کی یادگار ہی۔

ہی پری خانہ کوئی شیشۂ در ٹوٹ نہ جائے
سر نہ ٹکراؤں یہاں شملہ میں کہ سر ٹوٹ نہ جائے

دیکھنا مجھ کو چڑھا لائی کہاں بن کے کمند
آس، اک چیز ہی دنیا میں اگر ٹوٹ نہ جائے

ابر کہسار کے آگے نہ ہنسی ہو تیری
تار اشکوں کا کہیں دیدۂ تر ٹوٹ نہ جائے

تارے ہٹتے ہی نہیں اپنی جگہ سے ای چرخ
شبِ غم کی کہیں امید سحر ٹوٹ نہ جائے

مئے سُرخ، ابر سیہ، سبزۂ کہسار ریاضؔ
یہ کوئی چیز نہیں توبہ اگر ٹوٹ نہ جائے

اس (سزایابی) سے حضرت ریاضؔ اس قدر متاثر ہوئے کہ وہ قبل از وقت بوڑھے ہو گئے، ان کی بڑی اور کھڑی مونچھیں، لمبی اور نیچی ڈاڑھی میں بدل گئیں، یہاں تک کہ اپنے اخبار وغیرہ سے بھی انھوں نے قطع تعلق کر لیا اور محمود آباد کی پنشن پر قناعت کر کے خیرآباد میں خانہ نشین ہو گئے!

یہاں پر یہ واقعہ قابلِ ذکر ہے کہ اس حادثے سے تھوڑی مدت پیش تر ایک مرتبہ بات ہی بات میں بات بڑھ گئی، موصوفہ نے طلاق کا مطالبہ کیا اور ریاضؔ صاحب نے فوراً تعمیل کر دی، نہ ان کا یہ مقصد تھا کہ طلاق لیں نہ ریاضؔ صاحب کا یہ مقصد تھا کہ طلاق دیں، لیکن ہونے والی بات ہو گئی، معاً دونوں پر پشیمانی کا جذبہ طاری ہوا، لیکن تیر نکل چکا تھا اور اب وہ واپس نہیں آسکتا تھا، انھوں نے ریاضؔ صاحب سے یہ التجا کی کہ اس واقعے کا افشا نہ کیا جائے، آج سے اگر زن وشوہر کے تعلقات ختم ہو گئے ہیں تو کوئی مضائقہ نہیں، لیکن عزیزانہ تعلقات تو قائم رہ سکتے ہیں۔ ریاضؔ صاحب نے یہ خواہش مان لی؛ صرف یہ دونوں جانتے تھے کہ ہم دونوں اب غیر ہیں ورنہ سب کی نظر میں کوئی خاص تغیر نہیں ہوا تھا، رہنے سہنے میں ضرور تغیر ہوا تھا، لیکن وہ ایسا تھا جس کی صدہا معقول تاویلیں اور توجیہیں ہو سکتی تھیں۔

اس واقعے کی تصدیق اس سے بھی ہوتی ہے کہ کم وبیش

۱۸ سال کے بعد جب وہ اپنی میعادِ اسیری پوری کرکے واپس آئیں تو ریاض صاحب کی طرف سے ان کی آؤ بھگت، خاطر مدارات اور پرسش میں کوئی کمی نہیں ہوئی لیکن انھوں نے کبھی وہ مطالبہ نہیں کیا جس سے یہ معلوم ہو کہ وہ ریاض کی رفیقۂ حیات ہیں، اس کی وجہ ان کی کس مپرسی اور بے چارگی نہیں تھی، میں خود ان سے ملا ہوں اور میں نے ان کے اعترافِ تشکر کے الفاظ سُنے ہیں۔ وہ محسوس کر رہی تھیں ریاض ان کے ساتھ جو سلوک کر رہے ہیں، یہ ان کی شرافت ہی۔

جب تک ریاض زندہ رہے، اپنی محدود آمدنی کے باوجود ان کی مالی مدد کرتے رہے، حالاں کہ وہ اس کی کچھ بہت زیادہ محتاج نہیں تھیں ان کے پاس ان کی تھوڑی بہت زمین اور جایداد اب بھی باقی تھی اور اس سے وہ منتفع ہوتی تھیں۔

بہرحال یہ بھی ایک عبرت انگیز پہلو تھا کہ جس گھر پر انھوں نے ایک عرصے تک حکومت کی تھی، آج وہاں وہ ایک مہمان کی طرح مقیم تھیں۔ مہمان کی خواہ کتنی ہی عزت کی جائے، لیکن وہ پا بہ رکاب ہی رہتا ہی!

دونوں پر بڑھاپا طاری ہو چکا تھا، کون کہ سکتا ہی کہ اس بڑھاپے میں بھی دونوں کے دل یادِ ماضی سے خالی ہے۔ وہ ماضی جو صدہا رنگینیوں اور تجلیوں کا گہوارہ تھا!

(۴) خانہ آبادی

ریاض کی چار شادیاں ہوئیں، دو خاندان میں، دو خاندان سے باہر۔ اولاد کے معاملے میں تقریباً ساٹھ برس کی عمر تک وہ بہت بدنصیب رہے، نہ خاندانی بیویوں سے کوئی اولاد ہوئی نہ غیرِ خاندانی سے۔

پچھلے باب میں جس حادثے کا ہم نے تذکرہ کیا ہے اس سے معلوم ہو گا کہ سزایابی کے حادثے نے ریاض کو کتنا ملول و دل شکستہ کر دیا تھا اور ان کی ہیئتِ ظاہری، وضع قطع اور کردار و عمل میں کتنا زبردست فرق ہو گیا تھا۔ ریاض الاخبار جو ان کی زندگی کی عزیزترین متاع تھی، اسے بھی انھوں نے بند کر دیا تھا۔ گورکھپور کی بزم آرائیاں اور لکھنؤ کی بے تکلف مجلسیں ان کے حاشیۂ خیال سے محو ہو چکی تھیں۔ اب وہ خیرآباد میں خانہ نشین تھے، لیکن وہ لق و دق مکان اور یہ بالکل یکہ و تنہا، دونوں بھائی سرکاری مناصب پر فائز تھے اور مختلف شہروں میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ ریاض نے یہ گوارا نہ کیا کہ کسی بھائی کے پاس اقامت اختیار کریں، انھیں اب خیرآباد کا خرابہ یاد آ رہا تھا اور یہیں وہ زندگی کے باقی دن یادِ خدا میں صرف کر دینا چاہتے تھے۔ ہاں ان کے پاس ایک لڑکا تھا جسے "ناکردہ گناہ" نے گود لیا تھا، وہ ریاض

کے پاس تھا اور بہت کم سن تھا، اس کی دیکھ بھال کی ذمّے داریاں مزید!

بہرحال ایک عرصے تک وہ خاموشی اور تنہائی کی زندگی بسر کرتے رہے، ان کی یہ زندگی جو تمام تر اضمحلال وافسردگی تھی، ان کے دوستوں اور ہوا خواہوں کو کَھل رہی تھی۔ وہ چاہتے تھے ریاضؔ صاحب پھر تاہل کی زندگی اختیار کریں۔

ریاضؔ صاحب کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ بہت جلد اپنا ایک نیا ماحول بنا لیتے تھے اور پھر پورے انہماک اور مسرّت سے اسی ماحول میں زندگی بسر کرنے لگتے تھے۔

آخر حالات نے انھیں دوسری شادی پر مجبور کیا؛ ایک شریف اور ممتاز گھرانے میں ان کی یہ چوتھی شادی ہوئی۔ ریاضؔ کو اولاد کی تو اب کوئی آس تھی نہیں، ہاں یہ خیال ضرور تھا کہ اپنے "متبنّیٰ" کی ذمے داریوں سے وہ اس شادی کے بعد بڑی حد تک سبک دوش ہو جائیں گے۔

بہرحال شادی ہوئی اور ان کا اُجڑا ہوا گھر پھر آباد ہو گیا، وہ پھر اطمینان اور مسرّت کی زندگی بسر کرنے لگے۔ اب کی قدرت ان پر مہربان تھی، شاید ان کے پچھلے دُکھوں اور صدموں کا کفارہ کرنا چاہتی تھی۔ تقریباً ساٹھ برس کی عمر میں ان کی پہلی اولاد ہوئی، اتنی طویل مایوسی کے بعد ابرِ رحمت کی درفشانی اتنا بڑا اور عجیب واقعہ تھا کہ ان کی بے اندازہ مسرت کا اندازہ لگایا ہی

نہیں جا سکتا:

جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں!

اور پھر اولاد بھی کیسی نورٌ علیٰ نور، جیسے وہ خوب صورت اور خوب سیرت تھے ویسی ہی انھوں نے اولاد بھی پائی، اس مسرت نے انھیں ایک نئی زندگی سے روشناس کیا، ایسی زندگی جس نے اُمیدوں اور آرزوؤں کی ایک نئی شاہ راہ سامنے کر دی تھی!

اولاد کا سلسلہ آخر وقت تک جاری رہا، جب انھوں نے اس دنیا کو چھوڑا تو ماشاءاللہ نصف درجن سے زائد لڑکے اور لڑکیاں موجود تھیں، یہ بھی قدرت کی ستم ظریفی تھی، جب تمنا تھی اولاد سے محروم رہے، جب مایوس ہو گئے تو گنج ہائے گراں مایہ کی فراوانی ہو گئی۔

زندگی کے آخری دور میں اولاد اور اس کے مستقبل کی فکر نے ان کے افکار و ہموم میں اضافہ کر دیا تھا لیکن اولاد کے وجود نے انھیں مسرّت کا جو لازوال خزانہ بخشا تھا، وہ ان افکار و ہموم کو بھی مدھم کر دیتا تھا۔

اپنی اولاد سے وہ بے تابانہ محبت کرتے تھے، ہمارے گھر میں لڑکوں سے زیادہ لڑکیوں کا مان رکھا جاتا ہے اس گھرانے کی تہذیب میں یہ بات ریاض صاحب اور ان کے چھوٹے بھائی نیاز احمد صاحب کی بدولت داخل ہو گئی تھی کہ لڑکے اتنے باادب کہ کیا مجال بڑوں اور بزرگوں

کے سامنے لب کشائی کر سکیں اور لڑکیاں :

کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ !

کی مصداق !

ریاض صاحب کو اپنی لڑکیوں سے، بالخصوص بڑی لڑکی سے بڑی محبت تھی۔ اس کی شادی انھوں نے بڑی دھوم دھام سے مالی تنگی کے باوجود کی۔ ایک لڑکے کی شادی بھی اپنی زندگی میں انھوں نے کی۔ اور اس میں بھی انھوں نے کافی حوصلہ مندی کا ثبوت دیا، لیکن وہ بات نہ تھی !

لڑکی کی شادی میں تو انھوں نے سخاوت اور دریا دلی کے وہ نمونے دکھائے ہیں کہ کیا کوئی مال دار باپ اپنی لڑکی کے لیے یہ اہتمام کرے گا۔

دوسرے بچے بہت کم سن تھے، ان کی وفات کے بعد ان کی اہلیۂ محترمہ نے جس حوصلہ اور استقامت سے نامساعد حالات میں اپنے بچوں کی تربیت اور پرداخت کا کام انجام دیا، وہ اُنھی کا کام تھا !

(۵) شوخی و شرارت

بڑے نیک طینت، بڑے پاک باطن
ریاض آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں !

ریاض فطرت کی طرف سے بڑی چلبلی اور نٹ کھٹ

طبیعت لے کر آئے تھے، وہ حتی الامکان غم کو اپنے پاس نہیں پھٹکنے دیتے تھے اور اگر کسی طرح غم ان تک پہنچ جاتا تھا تو وہ اس کی مہمان داری میں بہت بخل کرتے تھے، وہ ہر وقت خوش رہنا چاہتے تھے، وہ ہر وقت خوش رہتے تھے، جو ان کے پاس بیٹھ جاتا تھا خواہ کتنا ہی ملول و غمگین ہو لیکن جب اٹھتا تھا تو اس طرح کہ اس کی باچھیں کھلی ہوتی تھیں۔

عجیب بات یہ ہے کہ ریاضؔ نہایت سنجیدہ اور ثقہ آدمی بھی تھے، ان کی سنجیدگی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کبھی ٹھٹھا مار کر نہیں ہنسے، کتنا ہی مضحکہ خیز واقعہ ہو، ان کا مختصر تبسم اپنی حد سے کبھی آگے نہیں بڑھتا تھا، لیکن باتیں اتنے دل موہ لینے والے انداز میں کرتے تھے، نفسیاتی تحلیل اس طرح کرتے تھے، شہ رگ پر حملہ اس صفائی سے کرتے تھے، طنز میں اتنی لطیف شوخی اور شیرینی پیدا کر دیتے تھے کہ آدمی ہنسی سے بے قابو نہیں ہوتا تھا البتہ اس پر انبساط اور نشاطِ قلب کی ایک کیفیت ضرور طاری ہو جاتی تھی، یہی ان کا "آرٹ" تھا!

مجنوںؔ گورکھپوری نے ریاضؔ کی شوخی اور شرارت کا مرقع ان الفاظ میں کھینچا ہے:-

" ریاضؔ کی شوخ اور الھڑ طبیعت نے کبھی اس کو گوارا نہیں کیا کہ وہ معشوق کے سامنے ہار مان لیں، وہ معشوق

سے بڑھ چڑھ کر رہتے ہیں اور بہ قول ہمارے دوست پروفیسر رگھوپتی سہائے فراقؔ گورکھ پوری کے حُسن کی شوخی وشرارت اس کے عشق کی بے باکی کے سامنے حسرت و بے چارگی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ انھوں نے اپنے کو عشق میں کبھی مجبور و مظلوم نہیں پایا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معشوقوں نے جتنے ستم اب تک عاشقوں کی جان پر توڑے ہیں، وہ ان سب کا انتقام لینے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ وہ کبھی معشوقوں کے رحم و کرم کے محتاج نہیں رہے، جب جو جی میں آیا کہہ بیٹھے اور کر بیٹھے، چاہے معشوق راضی رہے یا ناخوش!"

مجنوںؔ اور فراقؔ کی یہ تصویر کشی یقیناً "نقل مطابق اصل" ہے لیکن ریاضؔ کی شوخی اور شرارت کا یہ رنگ صرف شاعری میں ہے، زندگی میں نہیں۔ معاملات کی دنیا میں ان کی شوخی ہلکی گدگدی اور شرارت نرم چٹکی سے زیادہ نہیں اور سچ پوچھیے تو شوخی اور شرارت کی آخری حد بھی یہی ہے، اس کے بعد وہ پھکڑ اور مسخرگی کی حد میں آجاتی ہے۔ ریاضؔ پھکڑ اور مسخرے نہیں تھے، شوخ اور شریر تھے۔

عقیل احمد صاحب نے ریاضؔ کی بعض شوخیوں کو دل چسپ پیرائے میں تحریر کیا ہے، جن میں سے چند درج ذیل ہیں:۔

ایک دِل چسپ واقعہ

جھوائی ٹولہ (لکھنؤ) کے خواجہ فرید الدین عرف فدّن حضرت ریاضؔ کے بچپن کے دوست تھے، دس پندرہ برس کے بعد ریاضؔ لکھنؤ آئے تو ان سے ملنے گئے۔

اتنی مدّت کے بعد صورت میں فرق ہو ہی جاتا ہے، کچھ اس وجہ سے اور کچھ اس وجہ سے کہ اپنے کام میں مصروف تھے، دیکھتے ہی ان کو پہچانا نہیں۔ ریاضؔ کو شرارت سوجھی، مؤدبانہ سلام کر کے دُور ایک مونڈھے پر بیٹھ گئے۔ مغرب کا وقت تھا، کام زیادہ تھا اس لیے خواجہ صاحب پریشان تھے ان کی طرف مخاطب نہ ہو سکے، اتنا وقت جو ریاضؔ کو ملا تو پوری اسکیم تیار کر لی۔

اب جو فدّن صاحب مخاطب ہوئے اور پوچھا آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں، تو حضرت نے کہا حضور میں شیخ اصغر علی کے کارخانے سے آیا ہوں، آپ کے یہاں کچھ عطر اور تیل آیا تھا، اس کے چودہ رُپے بارہ آنے باقی ہیں۔

خواجہ صاحب حساب کتاب اور لین دین کے صاف آدمی تھے سن کر برہم ہو گئے ریاضؔ ان کی اس عادت کو اچھی طرح جانتے تھے۔ فدّن صاحب نے کہا کیسا رُپیہ؟ بل نے آج تک کسی جگہ سے کوئی چیز قرض نہیں منگائی ہے۔

حضرت ریاضؔ نے جواب دیا میں کیا جانوں شیخ صاحب جھوٹ کہتے ہوں گے۔ شیخ اصغر علی صاحب بھی فدّن صاحب کے گہرے دوست تھے، ان کی شان میں یہ کلمہ نہ سُن سکے، پوچھا یہ تو بتایئے آپ ہیں کون؟ ریاضؔ نے کہا ایک دفعہ تو عرض کر چکا ہوں، کہیے تو کعبے کی طرف ہاتھ اُٹھا کر کہوں، قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کے کہوں۔ یہ جواب سُن کر خواجہ صاحب آگ ہو گئے کہا تم بڑے گستاخ آدمی معلوم ہوتے ہو۔ ریاضؔ نے جواب دیا بجا ہے، چیزلے کے رُپے نہ دیں اور جب تقاضہ کرنے آدمی آئے تو اسے گستاخ بتائیں۔

یہ توتو میں میں ہو ہی رہی تھی کہ ہادی علی خاں آ گئے، یہ بھی ان دونوں کے بچپن کے دوست تھے، حضرت ریاضؔ کے دو ہی چار روز آگے پیچھے ان کا بھی انتقال ہوا ہے۔ انھوں نے ریاضؔ کو پہچان لیا اور بول اٹھے ارے فدّن تو نے نہیں پہچانا؟ اب جو خواجہ صاحب نے غور سے دیکھا تو دوڑ کر لپٹ گئے۔

فقیروں کا بھیس

حکیم عبدالوالی صاحب مرحوم کا بیان ہے کہ نثار حسین مہتمم "پیام یار" معمولی پڑھے لکھے آدمی تھے۔ چوک میں سیّد حسین خاں کے پھاٹک کے پاس عطر اور تیل کی دُکان تھی جو کسی زمانے میں شام کو مشہور مصنّفین و شعرا کے بیٹھنے

کی جگہ تھی، سرشار (صاحبِ فسانۂ آزاد) سجّاد حسین، شررؔ (مولانا عبدالحلیم)، ریاضؔ، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، اکبر الہ آبادی، شبلی، سب اس دُکان پر دل بہلانے بیٹھ چکے ہیں۔

اسی دکان کا قصّہ ہے کہ ریاضؔ اپنے اسی قسم کے چند دوستوں کے ساتھ بیٹھے تھے، ہنسی مذاق ہو رہا تھا مٹھائی کھانے کی ٹھیری، حضرت ریاضؔ دوستوں سے کسی بات پر بگڑے اور کہا کہ میں قوتِ بازو کی روزی کھاتا ہوں مٹھائی بھی زورِ بازو کی کھاؤں گا۔ دوستوں کو معلوم تھا کہ اس وقت ان کی جیب میں کچھ نہیں ہے اس لیے ان کا چیلنج قبول کر لیا گیا۔

ایک خدمت گار کھڑا تھا ریاضؔ نے اس کی چادر گھسیٹ لی اور چل دیے۔ پندرہ منٹ گزرے ہوں گے کہ دیکھا پیپنے ہاتھ میں چھنکاتے ہوئے آ رہے ہیں۔ خدمت گار کو چادر واپس کی اور بارہ چودہ آنے پیسے دیے، حکم دیا کہ سیر بھر امرتیاں لے آ اور جو کچھ پیسے بچیں، خود لے لے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ فقیروں کا بھیس بنا کر اکبری دروازے سے گول دروازے تک گئے جو شریف مرد آدمی ملا، اس سے ایسے الفاظ اور ایسے انداز سے مدد طلب کی کہ جو جس کے پاس تھا دے دیا۔

دو منٹ!

پنڈت رتن ناتھ سرشار حضرت ریاضؔ سے بہت بے تکلف

تھے (اپنے تئیں ان کا) "ہم مشرب" بھی سمجھتے تھے، ریاض الاخبار کے نامہ نگار بھی تھے، ایک روز آپ نے حضرت ریاضؔ کو پیامِ دعوت دیا، ریاضؔ نے دعوت منظور کر لی، پنڈت جی آپ کو لے کر مرے کمپنی کے ایک خاص کمرے میں داخل ہوئے اور تھوڑی دیر میں وہ سامان آ گیا جس کے حضرت ریاضؔ نظم میں خوگر تھے، یہ سامان دیکھ کر حضرت ریاضؔ کے ہوش اُڑ گئے مگر سرشار صاحب کے خوش کرنے کو اس سے پیش تر کہ بوتل سے جام میں آئے اور جام سے لب تک، حضرت ریاضؔ کی باچھیں کھلی ہوتی تھیں، دفعتہً آپ سرشار صاحب سے "دومنٹ" کہہ کر اس انداز سے اُٹھے کہ گویا ابھی واپس آتے ہیں مگر واپس آئے تو کب اور کہاں؟ بیس سال کے بعد دکن میں مہاراجا دسرکشن پرشاد) پیش کار بہادر کے کاشانے پر، یہاں حضرت ریاضؔ سرشار صاحب کے مہمان نہ تھے بلکہ مہاراجا پیش کار بہادر کی طرف سے حضرت ریاضؔ کی خدمتِ مہمان داری جناب سرشار کے سپرد تھی!

دکن میں، ایک اور واقعہ اس سے ملتا جلتا پیش آیا تھا، حضرت ریاضؔ ایک شب "جریدۂ روزگار" مدراس کے ایڈیٹر سے ملنے ان کے قیام گاہ پر گئے۔ ۱۸۵۷ء والے دربارِ دہلی کے بچھڑے ہوئے مدّتِ مدید کے بعد ملے، بہت احباب اور مشتاقین حضرتِ ریاضؔ جمع ہو گئے۔ عفو صاحب بھی آئے اور دکن کے مشہور درباری شاعر گرامیؔ بھی گرامی

کے ہم راہ ایک موقر ایرانی شاعر بہ اِصرار ریاضؔ کو اپنی فرودگاہ پر لے گئے۔ دو چار ہم مشرب اور ہم مذاق اور بھی شریکِ صحبت ہوئے۔

یہاں بھی تکلّف کے ساتھ میز پر وہی مرے کمپنی والا سامان آ گیا، حضرت ریاضؔ نے بھی دستِ شوق بڑھایا، پھر کچھ جھجکے اور کہا کہ طبیعت مانتی نہیں لیکن جگر کی خرابی کی وجہ سے ڈاکٹر نے ایک سال کے لیے قطعی ممانعت کر دی ہے، انکار سے پارسائی کا یقین نہ ہوتا لیکن اس تدبیر سے:

رِند کے رِند رہے ہاتھ سے جنّت نہ گئی!

ناخواندہ مہمان!

(نواب کلب علی خاں) خلد آشیاں کی رحلت کے بعد حضرت ریاضؔ، مولانا شررؔ اور ایڈیٹر پیامِ یار بہ ایمائے امیرؔ مینائی رام پور گئے۔ اس وقت مراد آباد میں ریل سے اُتر کر رام پور سواری سے جانا پڑتا تھا۔ سمیع اللہ خاں بہادر مرحوم کے صاحب زادے بھی لکھنؤ سے شریکِ سفر ہوتے۔ رات لُطف سے باتوں میں گزری، پچھلے کو سوئے تو مراد آباد سے نکل کر ایک چھوٹے سے اسٹیشن کانٹھ پر آنکھ کھُلی، گاڑی کم ٹھیرتی تھی، بہ ہزار دقّت اُترے، نہ کھانے کا سہارا نہ پان تمباکو کا، بنگالی اسٹیشن ماسٹر نے خشک جواب دے دیا، قصبہ چار پانچ میل، مراد آباد جانے والی ریل کا وقت ساڑھے تین بجے

کے بعد اسباب ایک ریلوے ملازم کے سپرد کیا، بھوک کی شدت میں بازار کا سہارا کانٹھ کی طرف لے چلا، جتنا آگے بڑھتے، منزل دور ہو جاتی، آخر دور سے کچھ شان دار عمارتیں نظر آئیں، ڈھارس ہوئی کہ شاید بازار کی خاک نہ پھانکنا پڑے۔

دربان سے معلوم ہوا یہاں کے زمیں دار چودھری ندھان سنگھ ہیں، جو مع اہل و عیال کے مراد آباد گئے ہوتے ہیں، یہاں نائب صاحب ہیں اور وہ مسلمان ہیں، کئی صحن طے کر کے دیوان خانے تک رسائی ہوئی، شان دار دیوان در دالان میں سفید چاندنی کا فرش، منتدی سُرخ سُرخ کھاتے کھولے ہوئے، دونوں دالانوں کے وسطی در میں مسند بھی، گاؤ تکیہ بھی، نائب صاحب بھی، بہت بڑا شان دار پیچوان منہ سے لگا ہوا، ناخواندہ مہمان لبِ فرش حاضر، نگہ رُو بہ رُو کہنے والا کوئی نہیں، نائب صاحب کی نظر کاغذات پر جمی ہوئی، کچھ دیر انتظار کی تکلیف اٹھا کر حضرت ریاض نے بلند آواز سے السلام علیکم کہا، جواب میں نظر اُٹھی مگر غضب ناک!

ناخواندہ مہمانوں کی صورت سائلانہ نہ تھی مگر آمد سائلانہ تھی۔ اب انتظار فضول تھا، حضرت مرحوم آگے بڑھ کر نائب صاحب کے برابر مسند پر جا بیٹھے، نائب صاحب کا یہ عالم کہ:-

غصہ مرے بانکے کا اُترتا ہی نہیں ہے!

حاشیہ نشینانِ بساط پر جرمانے کے پردے میں غیظ و غضب کا اظہار ہونے لگا، کچھ دیر بعد دیوان صاحب نے دوسری مسل کھینچی تو ریاض صاحب نے دست بستہ عرض کیا ہم لوگ نام سُن کر بہت دوُر سے آتے ہیں، سُنا ہے حضور کو موسیقی کا شوق ہے۔ چیں بہ جبیں ہو کر فرمایا "بالکل نہیں! چودھری صاحب مرادآباد میں ہیں، وہیں جاؤ!" ریاض نے کہا ہم ان کی واپسی کا انتظار یہیں کریں گے، کھانے کا انتظام فرمادیا جائے، نائب صاحب نے بلند آواز سے کہا "کوئی ہے!" دو تین گنوار سپاہی جھپٹے، وقت نازک آجانے سے اڈیٹر پیامِ یار کو تاب نہ رہی، ایک ہی سانس میں کہہ گئے، یہ حضرت ریاض مالک ریاض الاخبار ہیں، یہ مولانا عبدالحلیم شرر اڈیٹر دِل گداز ہیں، میں نثار حسین مہتمم پیامِ یار ہوُں، ساتھ ہی اصل واقعہ بھی بیان کر دیا۔

نائب صاحب عرق عرق "لاحول ولاقوۃ، غضب کیا!" کہتے ہوتے اُٹھے، ہر ایک سے معانقہ کیا، اسٹیشن سے اسباب لینے کو آدمی دوڑائے، حضرت ریاض کے دل میں گُدگُدی کاش تفریح کے لیے ہارمونیم یا کوئی اور ساز ساتھ ہوتا تو نثار حسین صاحب کو صفائی میں دِقت پیش آتی، بہ ہرحال سب مہمان نصف گھنٹے کی مسلسل معذرت کے بعد ایک مکلّف کمرے میں پہنچائے گئے، پنکھے کی ہوا جناب نثار اور مولانا شرر کو ٹھنڈا نہ کرسکی، حضرت ریاض پر غصہ کہ

بے وجہ آب رُو لی تھی۔ آپ نے فرمایا کہ موجودہ عزّت اسی مذاق کے صدقے میں ہے!

یہی گفتگو پیش تھی کہ نائب صاحب سر کو جنبش دیتے، "لاحول ولا قوۃ، غضب کیا!" کو تکیۂ کلام بناتے ہوئے آئے کہا کہ تکلیف نہ ہو تو عمارتیں، باغات اور دفاتر وغیرہ کی سیر کر لیجیے۔ واقعی ہر چیز قابلِ تعریف تھی، خوش سلیقگی کی حد نہ تھی، ایک بجے واپس آئے۔ دسترخوان مختلف الاقسام کے کھانوں سے بھرا تھا، مایوسانِ رزق نے سیر ہو کر کھانا کھایا، کچھ دیر استراحت کی، نائب صاحب کو دو چار روز قیام پر اصرار تھا مگر موقع نہ تھا آخر روانہ ہوتے۔ ایک ہاتھی پر حضرت ریاضؔ اور نائب صاحب، دوسرے پر مولانا شررؔ اور جناب نثارؔ، نائب صاحب نے ضد کر کے دوسرے دوسرے درجے کے ٹکٹ ناخواندہ مہمانوں کے لیے لیے۔

یہ واقعات گو چھپائے گئے مگر منشی امیر احمد صاحب کو معلوم ہو گئے۔ رام پور میں اب نہ وہ صحبت تھی نہ وہ لوگ، مرزا شاغل صاحب برادر داغؔ نے دھوم دھام کی دعوت کی اور پیامِ یار کی طرح پر اپنی غزل کا یہ مقطع اظہارِ مدعا کے لیے لکھ کر بھیجا:-

شررؔ، نثارؔ، ریاضؔ آئیں شوق سے شاغلؔ
غریب خانے میں تیار ماحضر بھی ہے!

دعوت خوب تھی مگر کانٹھ کا لُطف نہ تھا!

شوخ جذبتیں!

مولوی سبحان اللہ خاں صاحب کا بیان ہے:
"منشی ریاض احمد صاحب بچپن سے اس قدر شوخ وشریر واقع ہوئے تھے کہ ان کا کوئی ملنے والا ان کی شوخی وشرارت کا شکار ہونے سے نہ بچا، نثر میں وہی شوخی، نظم میں وہی شوخی۔

قاعدہ ہے کہ جوانی کی اُمنگ تک ہر شخص کم وبیش شوخی برتتا ہے، عمر بڑھتی ہے تو متانت آجاتی ہے۔ منشی ریاض احمد سر سے پاؤں تک اس قدر شوخ تھے کہ متین بننا چاہتے تھے مگر بن نہیں سکتے تھے۔

مَیں نے اُردو کے پچاس شاعروں کا کلام اوّل سے آخر تک دیکھا ہے، جس میں ان کا ابتدائی، متوسط اور آخری دور سب شامل ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابتدائی کلام ہے، اب متانت آرہی ہے؛ اب متانت آگئی۔ ریاضؔ کی شوخی قدرت کی طرف سے ایسا پختہ رنگ تھا کہ جو کبھی پھیکا نہ پڑا...... منشی ریاض احمد کی یہ بات گو کوئی زیادہ قابلِ ذکر نہیں ہے مگر ان کی طبیعت کی شوخی دکھانے کو یہ بات لکھ رہا ہوں کہ سیّد احمد خانی دور ہوا تو ترکی ٹوپی چلی، ریاضؔ کی ٹوپی میں چاند تارا لگا ہوتا، پھُندنا سنہرا ہوتا۔ سید احمد خانی دور میں ترکی کوٹ جو پیچھے سے کٹا ہوتا

اور کمر کے قریب دو بٹن لگے ہوتے رائج تھا ریاضؔ نے شیروانی میں بھی جیبر بنوائی، آگے بالا بر کھلا ہوا اور بٹن کھلے ہوتے اور دونوں پہلوؤں سے اسی کپڑے کا وہ ٹکڑا اِدھر اُدھر سے آکر بٹن بند کرتا، جس سے معلوم ہوتا کہ شیروانی یا مصنوعی ترکش کوٹ کے نیچے واسکٹ پہنے ہوئے ہیں۔ اس طرح گریباں چاک، ریاضؔ کا چلنا وہ بھی جھومتے ہوتے۔ یہ ایسی انوکھی مستانی ادا تھی کہ جس کی مثال ان کے مرتے دم تک ہندستان بھر میں مجھے کیا کسی کو بھی نظر نہ آئی:

ہو ریاضؔ اک جواں مست خرام
نہ پیے اور جھومتا جائے!"

ایک پُرلُطف واقعہ!

وصلؔ بلگرامی مرحوم نے ۲۵ء لکھنؤ سے ایک ماہ وار رسالہ "مرقّع" نکالا، ریاضؔ صاحب کے ان سے گہرے مراسم تھے۔ وہ بار بار بڑی محبّت سے اُنھیں لکھنؤ بُلاتے تھے اور یہ کشاں کشاں "طالبِ وصل" ہو کر لکھنؤ پہنچا کرتے تھے۔

"مرقّع" کا دفتر ان تمام بڑے آدمیوں کا مرکز تھا (جن کے راستے میں آتے یا جاتے وقت لکھنؤ پڑتا تھا) جن سے وصلؔ صاحب کے مراسم تھے، وہ اتنے رسا آدمی تھے کہ ہر بڑے آدمی سے تعلقات پیدا کر لینا ان کے

بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ ریاضؔ سے ملنے کی امید میں وہ لوگ بھی لکھنؤ آکر مرقع کے دفتر کا پھیرا کر لیتے تھے، جن سے ریاضؔ کے گہرے تعلقات تھے۔

سر عزیزالدین مرحوم کے چھوٹے بھائی قاضی خلیل الدین سے ریاضؔ کے بے تکلفانہ مراسم تھے۔ قاضی صاحب بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ بندیل کھنڈ کی متعدد ریاستوں میں دیوان کے عہدے پر فائز رہے۔ ایک مرتبہ وہ لکھنؤ آئے، مرقع کے دفتر میں پہنچے، دو منزلہ عمارت تھی، نیچے کے حصے میں دفتر اور پریس تھا، اوپر کا حصہ قیام گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا، قاضی صاحب نے دفتر میں دریافت کیا، معلوم ہوا ریاضؔ صاحب اوپر ہیں۔ انھوں نے زینے پر آکر ریاض، ریاض پکارنا شروع کیا۔ ریاضؔ ان کی آواز پہچان گئے اور اسی بے تکلفی سے جواب دیتے ہوتے اترے، بغل گیر ہوئے، وہیں سامنے کے برآمدے میں میز پڑی تھی، اِرد گرد کرسیاں رکھی تھیں، قاضی صاحب اور ریاض وہیں بیٹھ گئے، قاضی صاحب کے ہاتھ میں ایک بوتل تھی، جس میں کوئی انگریزی دوا تھی، وہ میز پر رکھ دی، اب ان دونوں میں کھل مل کر باتیں ہونے لگیں۔

اتفاق سے اس مرتبہ ریاضؔ کے ساتھ وسیمؔ صاحب بھی خیرآباد سے تشریف لائے تھے، وہ عجب باہمہ اور بے ہمہ آدمی تھے، انھیں پتا بھی نہیں چلا کہ کس نے آواز

دی اور ریاضؔ نیچے کیوں گئے؟ جب دیر ہو گئی اور ریاضؔ نہیں پہنچے تو وہ تحقیقِ احوال کے لیے نیچے اُترے، انھیں دیکھتے ہی ریاضؔ نے بہ آوازِ بلند بوتل کی طرف اشارہ کرکے اور وسیمؔ صاحب کی طرف دیکھ کر کہا:

اٹھواؤ میز سے مئے و ساغر ریاضؔ جلد
آتے ہیں ایک بزرگ پُرانے خیال کے!

قاضی صاحب کا تو یہ حال تھا کہ ہنستے ہنستے لوٹ گئے، خود وسیمؔ صاحب بھی کافی محظوظ ہوتے!

چھیڑ چھاڑ!

ریاضؔ کی شوخی اور شرارت ان کے دوستوں میں اتنا گھر کر چکی تھی کہ وہ ان سے کچھ سننے کے لیے، انھیں گُل افشانیٔ گفتار پر مجبور کرنے کے لیے کبھی کبھی برسرِ ملاقات انھی کا کوئی شعر سنا کر انھیں دعوتِ تکلّم دیتے تھے۔

مہاراجا صاحب محمود آباد مرحوم جب ریاضؔ کو دیکھتے مُسکراتے اور کہتے:

بڑے نیک طینت بڑے پاک باطن
ریاضؔ آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں!

خان بہادر سیّد احمد حسین رضوی مالک "کارخانہ احمد حسین دِل دار حسین تاجرِ تمباکوئے خوردنی چوک لکھنؤ" سے بھی ریاضؔ کے گہرے دوستانہ مراسم تھے، ریاضؔ

جب لکھنؤ جاتے خان بہادر سے ضرور ملاقات کرتے اور خان بہادر صاحب بھی ان سے مل کر ایک خاص کیف محسوس کرتے۔

ریاضؔ سے جب خان بہادر صاحب کی ملاقات ہوتی، سب سے پہلے وہ یہ شعر پڑھتے:-

حنا لگا کے پہنچے ہیں گل رخوں میں ریاضؔ
کچھ ان کی ریش مبارک کا اعتبار نہیں!

بیرنگ خط!

میں جب ندوہ میں داخل ہوا تو جب تک وہاں جی نہیں لگا تھا، ہر روز ایک خط والدہ کو لکھا کرتا تھا۔ اور جب وہاں طبیعت لگ گئی تو ہفتے گزر جاتے اور مجھے خط لکھنے کی "فرصت" نہ رہتی۔

والدہ میرے خط کے انتظار میں بے قرار رہتیں۔ دن کا بڑا حصہ ریاضؔ "مردانے" میں گزارتے تھے، اِدھر میرے خط میں دیر ہوتی، اُدھر والدہ نے ملازمہ کو "بڑے بابا" کے پاس بھیجنا شروع کیا "جا بڑے بابا سے پوچھ۔ رئیس کا کوئی خط آیا ہو!" اس نے پوچھا، جواب ملا "نہیں!" اس جواب سے وہ قطعاً مطمئن نہیں ہوتی تھیں، ملازمہ پر جرح ہوتی تھی، کوئی اور تھا یا نہیں؟ معلوم ہوا کوئی آدمی بیٹھا تھا، بس فیصلہ ہو گیا "باتوں میں لگے

تھی اس لیے ٹال دیا" تھوڑی دیر کے بعد وہ پھر بھیجی جاتی پھر وہی جواب لاتی، پھر اس سے جرح ہوتی "کیا کر رہے تھے؟" معلوم ہوتا "کچھ پڑھ رہے تھے!" پھر بھی رائے قرار پائی جواب غیر تسلّی بخش ہے، تھوڑی دیر کے بعد پھر ملازمہ "دیکھ بھال" کے لیے بھیجی جاتی، اگر رپوٹ دیتی "قلم ہاتھ میں ہے، کچھ سوچ رہے ہیں!" اب اسے یہ کہہ کر روانہ کیا جاتا "ذرا پوچھ، خط آیا یا نہیں؟ اگر کہیں نہیں تو کہنا "ذرا ڈاک اچھی طرح دیکھ لیجیے!" حکمِ حاکم مرگِ مفاجات وہ بے چاری پھر جاتی، اور اب کی اسے دیکھتے ہی وہ بُری طرح ڈانٹتے، وہ بغیر کچھ کہے سُنے واپس آجاتی، پھر لاکھ اس سے اِصرار کیا جاتا مگر وہ باہر جانے پر "اِستعفا" دینے کو ترجیح دیتی!

اپنی ان بھتیجی کو رِیاض صاحب بے حد چاہتے تھے، گھر میں ہر شخص ان کا لحاظ کرتا تھا، ان سے دبتا تھا، لیکن یہ ان کی جناب میں اتنی گستاخ تھیں کہ ان کے ہر قاعدے، ہر قانون، ہر اصول کو توڑتی اور دوسروں سے تُڑواتی رہتی تھیں، مگر وہ خاموشی سے برداشت کرتے تھے۔ ان کی تاکید تھی باہر جب آدمی بیٹھے ہوں تو ماما سوال جواب کے لیے نہ بھیجی جاتے، یا جب وہ "پڑھ" رہے ہوں تو ان کے پاس کوئی نہ آتے، یا جب وہ کچھ سوچ رہے ہوں یعنی فکرِ سخن کر رہے ہوں تو کوئی

ان سے بات نہ کرے، سب، حتیٰ کہ ان کی اہلیہ محترمہ تک، ان باتوں کو ملحوظ رکھتے تھے، مگر ان کی بھتیجی ان پابندیوں سے مستثنیٰ نہیں۔

اتفاق سے میرا خط کئی روز تک نہیں آیا؛ اور ادھر گھر میں روز یہی کیفیت پیش آتی، ایک مرتبہ انھوں نے جل کر ملازمہ سے کہا، "جا کہہ دے بیرنگ خط آیا ہے" وہ یہ پیام لے کر آئی، والدہ نے خوشی خوشی پیسے بھیجے، ملازمہ خط لے کر اندر آئی! والدہ نے اسے پڑھا تو کئی مہینے کا خط تھا! جل ہی تو گئیں، سمجھ گئیں "یہ بڑے بابا کی حرکت ہے!" اس دن دوپہر کو وہ کھانا کھانے بھی گھر میں تشریف نہیں لائے۔

نہ معلوم کہاں سے یہ خط انھوں نے ڈھونڈھ نکالا تھا اور ایسے ہی موقع پر استعمال کرنے کے لیے اسے رکھ چھوڑا تھا!

(۶) شفقت و محبّت!

ریاض کے پہلو میں ایک محبت کرنے والا دل تھا، جو دوسروں کی مصیبت پر کڑھتا تھا، دوسروں کی تکلیف سے پریشان ہوتا تھا، دوسروں کے کام آتا تھا، ان کی شفقت و محبت کا یہ عالم تھا کہ ان کے بدترین دشمن بھی ان کے

ممنونِ کرم تھے۔ ان میں اپنائیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ جس سے ملتے، یہ معلوم ہوتا کوئی عزیز قریب ہی جو بچھڑا جا رہا ہو، ان کے خلوص اور ملنساری کا بھی یہی حال تھا۔

شدست سینہ ظہوری پُر از محبتِ یار
برائے کینۂ اغیار در دِلم جانیست!

وہ کسی کے دشمن نہیں تھے، سب کے دوست تھے، انھوں نے کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچانا چاہا، وہ ہمیشہ سب سے خلوص و محبّت کا برتاؤ کرتے رہے، جن لوگوں نے انھیں تباہ و برباد کرنے کا بیڑہ اٹھایا تھا، جو ان کے خون کے پیاسے تھے، جو انھیں صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی محو کر دینا چاہتے تھے، ریاضؔ کے دل میں ان کی بھی جگہ تھی!

ریاضؔ کی جب وفات ہوئی تو اُن کے دوست، ملنے والے، شناسا سب اِس طرح متاثّر تھے جیسے کوئی ان کا قریبی عزیز اس دنیا سے اُٹھ گیا ہو۔

تاثّرات!

مولانا عبدالماجد دریابادی کا یہ تاثّر عین مطابقِ واقعہ ہے:-

"حادثے کی خبر پڑھ کر جی سن سے ہو گیا، ایسا محبّت کرنے والا انسان، ایک نیک دِل مسلمان، بے مثل

ادیب، بے نظیر شاعر، شیریں زبان، سخن سنج اب کہاں دیکھنے میں آئے گا؟"

مولانا ظفر الملک علوی ایڈیٹر الناظر کا بیان ہے:-

"ریاض صاحب میرے حال پر اس قدر شفقت فرماتے تھے کہ میں ان کو اپنا عزیز سمجھنے پر مجبور تھا، اگرچہ ان کی وفات سے ان تمام لوگوں کو رنج ہو گا جو ان کے کمالاتِ شاعری سے متاثر تھے، مگر مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سر سے ایک بزرگ کا سایہ اُٹھ گیا! شاعری اور ادب کا ذکر چھوڑ کر اگر شخصی حیثیت سے نظر کی جائے تو حضرت ریاضؔ اودھ کے عربی النسل قصبا تیوں کی طرح اخلاص و محبت اور خُلق و مروّت کا مجسّمہ تھے، حتّٰی کہ چھوٹوں اور نیازمندوں کو بھی وہ اپنی بزرگی کا احساس نہیں ہونے دیتے تھے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا!"

عبدالشاہد صاحب شروانی، جو اس زمانے میں خان بہادر حاجی غلام محمد صاحب رئیس دادوں (علی گڑھ) و "مہاجر خیر آباد"، کے ساتھ خیر آباد میں اقامت گزیں تھے، فرماتے ہیں:-

" ۱۶ ربیع الثانی، بعد عصر زیارت کے لیے حاضر ہوا، دروازے سے پیر صاحب زادے کو آواز دی، آواز سنتے ہی باہر نکل آئے اور میرا کاندھا پکڑ کر باہر

صحن میں آ بیٹھے، چوں کہ کئی دست آ چکے تھے، بہت
کم زوری تھی، مجھے اس کا علم نہ تھا ورنہ آواز نہ دیتا۔
باہر بیٹھ کر مغرب تک باتیں کیں، دنیا چھوڑنے میں صرف
۲۰ گھنٹے باقی تھے۔ ایسی حالت میں بھی موصوف نے
سرفراز فرمایا!"

ریاضؔ کے خلق و مروّت کی یہ انتہا تھی!

نوّاب اختر یار جنگ بینائی کا ارشاد ہے:-

"ہم لوگوں سے ان کو جو تعلّق تھا وہ عزیزوں سے
بڑھ کر حقیقی بھائیوں کا سا تھا اور اب تو حقیقی بھائیوں
میں بھی ایسی محبّت کم ہوتی ہے، ان کی رحلت سے
محبّت و خلوص کا پیکر اُٹھ گیا، وہ ہر ایک سے صاف دِلی
اور خلوص سے ملتے تھے!"

قاضی تلمذ حسین صاحب ام۔ اے تحریر کرتے ہیں:-

"کثیر الاحباب بہت لوگ ہوتے ہیں، مگر حضرت
ریاضؔ کا وصف خاص یہ تھا کہ ہر مشرب، ہر طریق،
ہر حیثیت کے لوگ ان کے احباب میں داخل تھے اور
اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ بچّے، جوان، بوڑھے، سب
ان سے یک ساں بے تکلّف رہا کرتے تھے۔ اپنے والد
کے دوسرے ہم نشینوں کے سامنے مجھے جس ادب و لحاظ
کی ضرورت تھی، حضرت ریاضؔ کے لیے اس کی ضرورت
نہ تھی!

یاد سے تکلیف ہوتی ہی، ہیں جب حیدرآباد سے گورکھ پور جاتا اور لکھنؤ میں قیام کا ارادہ ہوتا تو مرحوم کو مطّلع کر دیتا، محض مجھ سے ملنے کے لیے خیرآباد سے لکھنؤ تک تشریف لاتے تھے!"

اَنجان!

خاندان کے چھوٹوں کو اگر وہ کوئی بات خلافِ تہذیب وادَب کرتے دیکھتے تھے تو فوراً ڈنڈا لے کر نہیں کھڑے ہو جاتے تھے، اس وقت تو بالکل انجان بن جاتے تھے گویا انھیں کچھ معلوم ہی نہیں ہی، پھر بعد میں اس طرح کہ کسی قابلِ سرزنش واقعہ کا ذکر نہیں، لیکن باتوں باتوں میں نصیحت کر دی اور وہ دل پر جاکر بیٹھ گئی۔

ریاؔض صاحب نماز روزے کے بڑے پابند تھے، وہ چاہتے تھے ان کے گھر میں ہر شخص نمازی اور روزہ دار ہو جائے، جن لوگوں کو وہ اس طرف سے بے پروا دیکھتے تھے انھیں زجرو توبیخ تو نہیں کرتے تھے لیکن نصیحت برابر کرتے رہتے تھے۔ ان کی نصیحت چوں کہ خلوص پر مبنی ہوتی تھی اس لیے براہ راست دل پر اثر انداز ہوتی تھی۔

رمضان کا مہینہ تھا، رمضان میں ان کی عبادت اور ریاضت میں بہت زیادہ اضافہ ہو جاتا تھا، کئی

پاروں کی روز تلاوت کرتے تھے، نماز بالعموم مسجد میں باجماعت ادا کرتے تھے۔ میں ندوہ کے دوسرے درجے میں تعلیم حاصل کر رہا تھا اور تعطیل میں گھر آیا ہوا تھا، اتفاق سے اس دن میں روزے سے نہیں تھا۔ وسیم صاحب کے چھوٹے صاحب زادے جناب شمیم بھی گورکھ پور سے خیرآباد آئے ہوئے تھے اور وہ بھی روزے سے نہیں تھے۔

ہم دونوں میں طے ہوا کہ مٹھائی کھائی جائے، قریب ہی ایک ہندو حلوائی کی دُکان تھی "تازہ بہ تازہ نَو بہ نَو"، مٹھائی ایک دُکان سے لائی گئی، اب سب سے اہم سوال یہ تھا کہ یہ ٹھکانے کہاں لگائی جائے؟ گھر میں تو یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں تھا، سب روزے سے تھے، آخر سوچ بچار کے بعد یہ طے پایا کہ گھر کے عقبی حصّے کی گلی میں۔ جو بہت سنسان تھی، ہم لوگ وہاں پہنچے اور کارگزاری شروع ہو گئی۔ اب ہم دونا پھینکنے والے تھے اور آخری گلاب جامن اُٹھا رہے تھے کہ سامنے سے ریاض صاحب آتے ہوئے دکھائی دیے، وہ عصر کی نماز پڑھنے مسجد جا رہے تھے۔ اس وقت ہم دونوں کی جو کیفیت ہوئی، اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ ریاض صاحب اس طرح آنکھیں نیچی کیے ہوئے چلے گئے، گویا انھوں نے ہمیں دیکھا ہی نہیں، وہ تو نماز پڑھنے چلے گئے اور

یہاں انفعال کی وہ کیفیت طاری ہوئی کہ شمیم صاحب باچشمِ پُرنم مجھے دیکھ رہے ہیں اور مَیں باگریہ گلوگیر انھیں دیکھ رہا ہوں، نہ ان کی زبان یاری دیتی ہے نہ مجھ میں تابِ تکلّم ہے! کئی منٹ تک بےخودی اور خود فراموشی کی یہی کیفیت طاری رہی۔

دونا اور باقی مٹھائی ہم نے وہیں پھینکی اور شرمندہ واپس آئے، اس کا اثر یہ ہوا کہ پھر رمضان کے جتنے دن بھی باقی رہ گئے تھے، ہم نے مسلسل روزے رکھّے، لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا ریاضؔ صاحب کو ہماری روزہ داری کا یقین تھا یا نہیں!

۷۔ وَضع داری!

ریاضؔ پُرانے زمانے کے آدمی تھے اور پُرانے زمانے کے آدمیوں کی خصوصیت میں وضع داری شامل تھی۔ انھوں نے چند باتیں اپنی زندگی کے پروگرام میں داخل کر لی تھیں جب تک زندہ رہے ان پر عمل کرتے رہے۔ ایک مرتبہ جو بات طے کر لی، جس سے جو برتاؤ کیا، جس طرح کا رہن سہن اختیار کیا، زندگی کے کسی دوَر میں اپنے اس اصول کو نہ بدلا۔

ریاضؔ کو واسطی قلم پسند تھا، زندگی بھر انھوں

نے نِب کا استعمال نہیں کیا، ہمیشہ کلک کے قلم سے لکھتے رہے، لطف یہ کہ نہ قلم بنانا آتا تھا، نہ اس پر قط رکھنا، اس معاملے میں ہمیشہ دوسروں کے محتاج رہے، لیکن اپنی اس وضع داری میں انھوں نے کبھی فرق نہیں آئے دیا، وہی کالی روشنائی، وہی کلک کا قلم، رنگین روشنائی کے استعمال سے بھی انھیں چڑھ سی تھی، گھر کے اور لوگ ان کی اس "تکلیف مالایطاق" پر ہنستے تھے، مگر وہ اس پر نازاں تھے۔

ایک زمانہ تھا کہ وہ مشاعروں میں بڑے شوق و ولولے سے شریک ہوتے تھے، کئی بڑے معرکے کے مشاعرے انھوں نے سر کیے، لیکن پھر وہ دَور آیا کہ انھوں نے مشاعروں کی شرکت ترک کر دی اور عرصۂ دراز تک اس عزمِ ترک کے بعد وہ زندہ رہے، لیکن یہ انکار ان کی وضع داری میں دخل ہو گیا تھا، پھر کبھی وہ مشاعرے میں نہیں شریک ہوئے، نہ کلام سُنایا، بہت دباؤ پڑا تو کچھ دیر کے لیے کسی گوشے میں بیٹھ گئے۔ لیکن شعر خوانی کے وہ کبھی مرتکب نہیں ہوئے۔

لکھنؤ میں ان کے بہت سے دوست تھے۔ کتنوں سے بے تکلفی تھی۔ بہتوں سے عزیزانہ تعلقات تھے لیکن آخری دَورِ زندگی میں وہ مولوی انعام اللہ خاں منصرم کمشنری لکھنؤ کے دولت کدے پر ٹھیرا کرتے تھے

جب تک انعام اللہ خاں صاحب لکھنؤ میں رہے، ریاضؔ ان کے سوا کہیں نہیں ٹھیرے بعد میں لکھنؤ میں ان کے کچھ عزیز بھی پہنچ گئے تھے، لیکن عزیز، قرابت دار، دوست، آشنا ملتے سب سے تھے مگر ٹھیرتے کہیں نہیں تھے، بس مولوی انعام اللہ خاں کا مکان تھا جسے انھوں نے اپنا مہمان سرا بنا لیا تھا۔

انھوں نے لباس میں بھی کچھ تراش خراش سے کام لیا تھا، یعنی اپنی جدّت پسندی سے اس میں کچھ تبدیلیاں کی تھیں، زندگی کی آخری سانسوں تک وہ اپنی رَوِش پر قائم رہے۔ ان کے نزدیک اس سے بڑھ کر کوئی تعجب خیز بات ہی نہیں تھی کہ آدمی ایک اصول بنائے اور اس سے رُوگرداں ہو جائے۔ وضع داری پہ قائم نہ رہے، وہ اسے "چھچھورا پن" سمجھتے تھے۔

مطالعے کا انھیں بڑا شوق تھا، ان کے پاس درجنوں اخبار اور رسالے آتے تھے اور اسی "حسنِ طلب" کے ماتحت آتے تھے کہ ریاضؔ صاحب اپنے کلام سے سرفراز فرمائیں۔ انھوں نے اپنی فہرست میں چند لوگوں کو داخل کر لیا تھا، انھی کے جرائد میں وہ کبھی کبھی سال میں دو ایک دفعہ اپنی کوئی غزل بھیج دیتے تھے، سیّد جالبؔ مرحوم کے اخبار ہمدم، مولانا ظفر الملک کے الناظر، منشی دیا نرائن نگمؔ کے زمانہ، حکیم

برہم کے مشرق اور آخر میں وصل صاحب کے مرقع میں وہ بالالتزام اپنا کلام بھیجا کرتے تھے، طلب ہو یا نہ ہو، وہ وقتِ مقررہ پر اپنا کلام ضرور بھیجتے تھے۔ ان کے علاوہ بہت سے اخبارات و رسائل تھے جو اعزازی طور پر ان کے نام آیا کرتے تھے، ان کی طرف سے طلب و تقاضے کے خطوط آتے تھے، اصرار ہوتا تھا، لیکن انھوں نے اپنی فہرست بنا لی تھی ایسا بہت کم ہوتا تھا کہ اس پر نظر ثانی کریں۔

محلے کی مسجد کو وہ سالانہ کچھ رقم دیتے تھے، ان پر مالی تنگی اور پریشانی کے بڑے بڑے طوفان آئے، لیکن اپنی "نذر محقر" میں انھوں نے کبھی اِلتوا گوارا نہیں کیا، وقت آیا اور چپکے سے رقم بھیج دی۔

دوستوں کے انتقال پر پورے شغف و انہماک کے ساتھ تمام مراسم میں حصّہ لیتے تھے۔ جاڑا ہو، گرمی ہو، برسات ہو، خود علیل ہوں، مزاج ناساز ہو، ان میں سے کوئی مانع بھی ان کے عزم میں تزلزل نہیں پیدا کر سکتا تھا۔ حکیم عابد علی صاحب کوثر کا انتقال ہوا، مرحوم سے ان کا بڑا پرانا یارانہ تھا، ان کا خاندانی قبرستان ان کے مکان سے ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر تھا۔ کچھ یہ صدمہ اور کچھ ویسے ہی طبیعت نِڈھال تھی، گرمی کا موسم، کڑاکے کی

دھوپ، دوپہر کا وقت، کوئی چیز بھی ریاض صاحب کو نہ روک سکی، گئے اور آخر وقت تک شریک رہے۔

سیتا پور میں میر مظفر حسین صاحب وکیل سے ان کے بڑے گہرے مراسم تھے، ان کا انتقال ہوا، تجہیز وتکفین میں تو تنگیِ وقت کے سبب نہ شریک ہو سکے لیکن ان کے چہلم اور مجلسِ فاتحہ میں ضعف اور پیرانہ سالی کے باوجود گئے اور شریک ہوئے۔

خیرآباد کے ایک رئیس نظام احمد صاحب ان کے بچپن کے دوست تھے، دونوں میں بڑے گہرے مراسم تھے، ان کا انتقال ہوا، ریاض صاحب نے وہ راستہ سے نکلنا چھوڑ دیا، اتفاق سے ان کا مکان ایسی جگہ واقع تھا کہ اسٹیشن اگر جانا ہو یا وہاں سے آنا ہو تو لازمی طور پر اسی طرف سے گزرنا ہوتا تھا، ریاض صاحب اکثر خیرآباد سے باہر آتے جاتے رہتے تھے، مگر کیا مجال جو کبھی ادھر سے گزرے ہوں، ہمیشہ چکّر کاٹ کر جاتے اور آتے تھے، خواہ پیدل ہوں یا سواری پر، تقریباً ۲۵ سال تک وہ اپنی اس وضع داری پر قائم رہے یہاں تک کہ وہ وقت آگیا جو ایک روز سب کو پیش آنا ہے۔

خیرآباد کے شرفا اور رؤسا ان کے عزیز بھی تھے اور دوست بھی تھے، مگر کبھی کسی کے ہاں نہیں جاتے

تھے؛ خیرآباد اگرچہ ایک اُجڑا دیار ہے لیکن وہاں کے قدیم خاندانوں میں عام اس سے کہ وہ دولت مند ہوں یا نہ ہوں، مجلس طرازی کی پرانی شان باقی ہے، ہر بڑا گھر ایک کلب کی حیثیت بھی رکھتا ہے، جہاں شام کو یارانِ بزم مجتمع ہوتے ہیں، خوش گپیاں ہوتی ہیں۔ ذاتیات، شخصیات اور سیاسیات پر تبصرے ہوتے ہیں۔ ریاض صاحب ان مجلسوں میں کبھی شریک نہیں ہوئے۔ خود اپنے گھر پر بھی مجلس طرازی کی طرح نہیں ڈالی، کوئی ملنے آگیا مل لیے، ورنہ وہ ہیں اور گھر ہے، البتہ سیّد نیاز احمد صاحب جب خیرآباد آتے تھے تو مجلس نہیں دربار لگنے لگتا تھا، حضرت ریاض اس سے بھی الگ تھلگ رہتے تھے۔

ہاں ایک جگہ تھی جہاں وہ جاتے تھے اور گھنٹوں بیٹھتے تھے، ایک زمانے میں تو ہر روز جایا کرتے تھے، وہ مکان تھا جناب ظہیر احمد صاحب فاروقی آنریری مجسٹریٹ خیرآباد کا۔ یہ ریاض صاحب کے چھوٹے تھے اور اپنے باپ کی طرح ان کا احترام کرتے تھے، لیکن ان کی مجلس میں ریاض صاحب اکثر شریک ہوا کرتے تھے۔

خیرآباد ہر دوسرے تیسرے برس شدید طاعون کا شکار ہوا کرتا تھا۔ ایسے موقع پر تقریباً سارا خیرآباد اُجڑ جاتا تھا خود ہمارے محلے میں ہُو کا عالم ہو جاتا تھا۔ سب لوگ مضافات کے دیہاتوں اور

باغوں میں نقلِ مکان کر لیتے تھے، مگر ریاض صاحب اس کے خلاف تھے، وہ خدا کی "تقدیر" کے مقابلے میں فرار کو پسند نہیں کرتے تھے، بڑے سے بڑے طاعون میں بھی ان کا قدم کبھی نہ ڈگمگایا، سارا محلہ سونا پڑا ہے؛ تقریباً ہر ہر گھر خالی پڑا ہے، مگر ریاضؔ کے گھر سے کوئی باہر نہیں جا سکتا، آخری طاعون میں ہمارے گھر میں پے بہ پے تین چار جوان موتیں ہوئیں، مگر وہ نہ ٹلے، پہاڑ کی طرح اپنے عزم پر جمے رہے، خیرآباد میں قبلہ حکیم انور حسین صاحب مدظلہٗ اور جناب حکیم احمد علی صاحب بھی انھی راسخینِ عزم میں سے ہیں، یہ حضرات بھی طاعون سے کبھی نہیں بھاگے بس یہ چند گھرانے تھے جو ہمیشہ تقدیرِ الٰہی پر شاکر رہتے تھے!

(۸) پاسِ خاطر، لحاظ، مُروّت!

کیوں خفا ہو ریاضؔ سے کوئی؟
اس رَوِش کا وہ آدمی ہی نہیں!

ریاضؔ کا مشرب تھا!

ہم کفر جانتے ہیں دل توڑنا کسی کا

وہ کسی کی دِل آزاری نہیں کرتے تھے، کِسی کی حوصلہ شکنی نہیں کرتے تھے، کسی سے کوئی ایسی بات نہیں کرتے تھے جس سے وہ نادِم اور شرم سار ہو، جہاں تک بَن

پڑتا تھا، سب کا دل رکھتے تھے، سب کا لحاظ کرتے تھے، سب سے مروّت سے پیش آتے تھے۔ کسی کے سامنے کوئی ایسی بات نہیں کرتے تھے جس سے اس پر کیفیتِ انفعال طاری ہو۔

مجھے خود اپنا ایک واقعہ یاد آگیا، میں ندوہ کے ابتدائی درجے کا ایک طالبِ علم تھا، بعض دوسرے طالبِ علموں کی دیکھا دیکھی مجھے عینک کا شوق ہوا۔ میں نے اپنے نانا سیّد نیاز احمد صاحب کو ایک خط لکھا اور عینک کی ضرورت لکھ کر ان سے چالیس پچاس رُپے منگائے کہ معمولی عینک سے کام نہیں چلے گا، بہت اعلا قسم کی عینک چاہیے، اگر فوراً عینک نہ خریدی گئی تو بصارت کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ وہ میرے اِس "طفلانہ فریب" میں کیا آتے، انھوں نے ایک خط لکھ دیا "ابھی تمھیں عینک کی ضرورت نہیں ہے، بھائی صاحب کی بھی یہی رائے ہے!"

ریاض اس زمانے میں ان کے پاس چند روز کے لیے بھوپال گئے تھے۔ یہ جواب پاکر مایوسی ہوئی اور مایوسی نے برہمی کی صورت اختیار کر لی، اب میں نے ادبی رسائل دیکھنا شروع کر دیے تھے، یہ غالباً ۲۶ء کا واقعہ ہے۔ میں نے نیاز احمد صاحب کو ایک بڑا سخت خط لکھا اور آخر میں لکھ دیا "بڑے بابا نے بھی ایک

شاعرانہ تبسّم کے ساتھ آپ کے اس ظالمانہ فیصلے کی تائید کر دی ہو گی!"

یہ خط ریاض کے ہاتھ میں پڑا، سوادِ خط سے انھوں نے پہچان لیا میرا ہے، نیاز احمد صاحب دفتر میں تھے اس لیے انھوں نے کھول بھی لیا، خط گول کر گئے، نیاز احمد صاحب کو نہیں دیا ورنہ نہ معلوم میرا کیا حشر ہوتا، مَیں نے جھلّا کر یہ خط بھیج تو دیا تھا لیکن اب پشیمان ہو رہا تھا کہ دیکھیے انجام کیا ہو؟

چند روز کے بعد مطلوبہ رقم کا منی آڈر آیا، کوپن پر "بڑے بابا" نے لکھا تھا۔

"نورِ چشم! دُعا

تمھارا خط مَیں نے نیاز احمد کو نہیں دکھایا ان سے رُپیہ لے کر بھیجتا ہوں، تم نے خوب خط لکھا

اللہ کرے زورِ قلم

نیاز احمد نے بے خیالی میں لکھ دیا ہو گا، مَیں نے انھیں منع نہیں کیا تھا!"

اس "جواب باصواب" کی ہرگز مجھے توقّع نہیں تھی، خط دیکھ کر تو مَیں پانی پانی ہو گیا۔

کچھ روز کے بعد وہ نعیر آباد واپس آ گئے، انھوں نے والدہ سے بھی میری اس گستاخی کا ذکر نہیں کیا،

تعطیل میں یہاں آیا تو حسبِ معمول اس شفقت و محبّت سے ملے کہ گویا مجھ سے کوئی نادیبا حرکت سرزد ہی نہیں ہوئی تھی۔ کئی مرتبہ جی میں آیا کہ ان سے معذرت کر دی، جب میں نے یہ ارادہ کیا، انھوں نے تاڑ لیا اور اس طرح ان کی شفقت چھا گئی کہ مجھے یارائے تکلم نہ رہا۔

جب مجھ جیسے ناچیز خورد کے ساتھ پاسِ خاطر اور مُروّت کا یہ عالم تھا تو دوستوں اور شناساؤں کے ساتھ کیا حال نہ ہوگا؟ وہ خود بڑی سے بڑی ذہنی اور دماغی اذیت سہ لیتے تھے لیکن کسی کی خاطر شکنی نہیں کرتے تھے۔

مہاراجا محمود آباد کا مشورہ!

قاضی تلمذ حسین صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

"مہاراجا صاحب مرحوم (محمود آباد) ریاضؔ کے دیوان میں کچھ حذف و اسقاط چاہتے تھے، ارشاد ہوا تھا کہ دیوان مجھے دیجیے، اس پر نظر کروں اور بعض اشعار کو خارج کر دوں۔ حضرت مرحوم نے اپنی طبعی خوش خلقی اور ہمہ گیر دل جوئی سے عرض کر دیا کہ زحمت فرمائی کی ضرورت ہی کیا ہے یہ معلوم ہو جائے کہ کس قسم کے اشعار حذف کرنا مدنظر ہے میں خود اِس قسم کے تمام

اشعار خارج کردوں، مثلاً یہ شعر بتایا گیا:۔

کسی سے وصل میں سنتے ہی جان سوکھ گئی
چلو ہٹو بھی ہماری زبان سوکھ گئی

حضرت ریاضؔ تو سنتے ہی سناٹے میں آگئے، مگر اظہارِ اتفاق کرکے چلے آئے۔ مجھ سے فرمایا کہ شعر تو شائع ہو چکا بلکہ زباں زد ہو چکا، اب خارج کروں تو کیسے؟ میں نے عرض کیا کہ اگر آپ خارج بھی کر دیں گے تو میں اس قسم کے تمام اشعار کو یک جا کرکے ایک ضمیمہ شائع کر دوں گا۔ اِدھر حضرت مرحوم اس خلجان میں پڑے، اُدھر مہاراجا بہادر قومی معاملات اور پھر سرکاری ملازمت[1] میں منہمک ہو گئے۔ سمجھ لیا گیا، رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت![2]

"سُبحان اللہ!"

قاضی تلمذ حسین صاحب روایت فرماتے ہیں:۔

"قُدرت کو ابھی کچھ اور ستم ظریفی کرنا تھی، جناب مولوی سُبحان اللہ صاحب کی ذکاوت و فطانت پر ان

---

[1] منٹو مارلے اصلاحات کے نفاذ کے بعد جب صوبائی کونسلیں قائم ہوئیں تو یو۔پی میں سب سے پہلے مہاراجا صاحب محمود آباد مرحوم "ہوم ممبر" کے منصبِ جلیلہ پر فائز ہوئے تھے۔

[2] تعجب ہے مہاراجا بہادر کو اس شعر پر اعتراض تھا، حالاں کہ یہ رنگ خود ان کے ہاں بھی تھا، یہ مصرعہ انھی کا ہے:
ہم چھیڑ چھاڑ سے اُتر آئے تو غصہ اُترا! (مؤلف)

کے تمام جاننے والے ایمان لاتے ہوئے ہیں۔ آپ نے حضرت ریاؔض کے بعض اشعار میں کچھ ترمیمیں سوچیں یا زیادہ صحیح یہ ہے کہ آپ کو سوجھیں، اسی زمانے میں چند ترمیمیں مجھے بھی سُنائی تھیں۔ ان میں سے ایک ترمیم یاد ہے۔ ریاؔض فرماتے ہیں:-

لاشہ ہے میرا یا سبتے رنگیں کی موج ہے
تُربت ہے میری یا کوئی بوتل شراب کی!

ترمیم ہوئی:-

لاشہ ہے میرا اکوتی بوتل ہے سر بہ مُہر
تُربت ہے میری یا کوئی بھٹّی شراب کی!

اس میں شُبہ نہیں کہ تشبیہ میں ترقّی ہو گئی ہے، مگر اس طرح کی ترمیموں سے سارا دیوان مبدّل ہو جاتا، وہ ریاؔض کا کلام نہ رہتا۔ حضرت مرحوم نے اس موقع پر بھی خلقتی مروّت سے کام لیا اور دیوان کو وقف اصلاح کر کے چلے گئے۔ مجھے سخت خلاف ہوا، میں نے یہ کہہ دیا کہ اس دیوان میں ترمیم نہیں ہو گی۔ یہ ممکن ہے کہ ترمیمات کا ایک ضمیمہ لگا دیا جائے۔ مشکل یہ ہوئی کہ ترمیم نہ آج ختم ہوتی ہے نہ کل، مجھ سے اور حضرت مرحوم سے برابر مراسلت رہی۔

تین مہینے ہوتے کہ حضرت مرحوم نے پُر معنی الفاظ میں مجھے اطلاع دی کہ "مولوی صاحب نے جُملہ قیود

اُٹھا دیے اور دیوان رضوان اللہ کے حوالے کر دیا، دیوان آجائے تو لکھنؤ جاکر انتظام کروں" کسی شاعر کے کلام میں ترمیم کی جائے اور وہ ترک ترمیم کو "قیود اٹھا دینے" سے تعبیر کرے، یہ حضرت مرحوم ہی کا اخلاق تھا!

(۹) عالی ظرفی!

عالی ظرفی ریاضؔ کے خمیر میں داخل تھی، وہ بڑے حوصلہ مند آدمی تھے، ان سے کبھی کوئی ایسی بات نہیں سرزد ہوئی جسے تنگ ظرفی یا چھچھورے پن پر محمول کیا جا سکے، یہ ان کی عالی ظرفی تھی کہ وہ دشمنوں کو معاف کر دیتے تھے، بدخواہوں سے درگزر کرتے تھے، دریدہ دہنوں اور گستاخوں سے کوئی تعرض نہ کرتے تھے، احسان کرتے تھے تو اسے جتاتے نہیں تھے، سلوک کرتے تھے تو اسے چھپاتے تھے، افشائے راز کرنا ان کے مشرب میں سب سے بڑا گناہ تھا، ان کا سینہ گنج اسرار تھا، معلوم کتنوں کے راز اس میں پوشیدہ تھے لوگ ان پر بھروسا کرتے تھے اور وہ ان کے بھروسے کی ہر قیمت پر حفاظت کرتے تھے، انھوں نے کبھی کسی کو جائز شکایت کا موقع نہیں دیا۔

کبھی کبھی بعض لوگ اخبارات یا رسائل میں ان پر

خوردہ گیری بھی کرتے تھے، ان پر اعتراض کرکے، ان کی شاعری میں سقم نکال کے، ان کی عیب جوئی کرکے بامِ شہرت پر پہنچنا چاہتے تھے، وہ ایسے لوگوں کو منھ نہیں لگاتے تھے، ان کا کوئی جواب نہیں دیتے تھے، ان سے برسرِ پیکار نہیں ہوتے تھے، لیکن اگر کبھی ایسا کوئی آدمی ان سے ملتا تھا، اظہارِ نیاز کرتا تھا تو وہ اس عالی ظرفی سے ملتے تھے کہ محسوس ہی نہیں ہونے دیتے تھے انھیں اس سے کوئی شکایت ہے یا ان کے دل میں اس کی جانب سے غُبار ہے۔

ایک ریاست کے دیوان صاحب سے ریاضؔ کی نہیں بنتی تھی، وہ ہمیشہ نیش زنی کرتے رہتے تھے اور انھیں نقصان پہنچانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے تھے، ایک مرتبہ ریاضؔ صاحب کی والیِ ریاست سے ملاقات ہوئی، انھوں نے اپنے دیوان کے نام ایک پُرزہ لکھّا "ریاضؔ صاحب کو ایک ہزار رُپیہ دے دیا جائے!" ریاضؔ نے شکریہ ادا کیا اور پُرزہ جیب میں رکھ لیا۔

باہر نکلے تو پہلا کام یہ کیا کہ اس پُرزے کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے پھینک دیا، بات آئی گئی ہوگئی۔ ایک عرصہ دراز کے بعد والیِ ریاست کو خیال آیا، اس نے اپنے دیوان سے اس پُرزے کے بارے میں استفسار

کیا، جواب ملا مجھے نہ آپ کا کوئی پُرزہ مِلا، نہ میں نے ریاض صاحب کو کوئی رقم دی۔ ریاض صاحب بُلائے گئے، بازپُرس ہوئی۔ انھوں نے کہا "میری ان کی ناچاقی ہوا!" سوال ہوا "پھر ہم سے شکایت کیوں نہیں کی؟" فرمایا "یہ میری عادت نہیں!" اس واقعے سے دیوان صاحب بھی متاثر ہوئے، ان کی نیش زنی اگرچہ "مقتضائے طبیعتش" کی مصداق تھی، لیکن پھر اس میں بہت کمی ہوگئی۔

ایک اور بڑے رئیس کے مختارِ کُل صاحب ریاض کے خواہ مخواہ کے دشمن تھے۔ انھیں یہ بہت کھٹکتا تھا کہ رئیس ریاض سے اتنا مانوس کیوں ہے؟ اور ریاض کا اس پر اتنا اثر کیوں ہے؟ اس صدمۂ جاں گُداز سے وہ بہت ملول و متاثر تھے، لیکن کر کیا سکتے تھے۔

ریاض صاحب کو ان کی اس ذہنیت کا علم تھا، جب تک وہ رئیس کے مختارِ کُل رہے، ریاض صاحب کبھی ان سے مخاطب نہ ہوئے، انھیں بالکل لائقِ التفات نہ سمجھا۔

کچھ عرصے بعد مختار صاحب معتوب ہوئے اور وہاں سے ان کا سلسلہ منقطع ہوگیا، وہ لکھنؤ آئے اور کاروبار کرنا چاہا۔ ریاض کی امداد سے وہ بے نیاز نہیں ہوسکتے تھے، سب سے پہلے ریاض ہی کے پاس پہنچے۔ ریاض ان سے اس اپنایت سے پیش آئے کہ گویا کچھ

ہوا ہی نہیں تھا، کوئی تلخی اور بدمزگی درمیان میں تھی ہی نہیں، انھوں نے بے انتہا اخلاقی امداد انھیں پہنچائی۔

اس عالی ظرفی کا یہ اثر ہوا کہ سابق مختار صاحب اب ریاض کے جاں نثار بن گئے اور پھر زندگی بھر ان کی یہ حالت رہی کہ ریاض کے پسینے پر اپنا خون بہانے کو تیار رہتے تھے۔

نواب اختر یار جنگ تحریر فرماتے ہیں:۔

"ریاض مرحوم نہایت پاک نفس اور دریا دل انسان تھے، ان کی پاکیزہ نفسی اور استغنا کے بہت سے واقعات میرے علم میں ہیں۔ ان کی شرافتِ نفس ہمیشہ اس کی متقضی رہی کہ جن لوگوں نے ان سے بے وفائی کی، ان کو نقصان پہنچایا، ان کی قابلیتوں اور ان کے نام سے ناجائز فائدہ اٹھایا، ریاض نے ان کے نامناسب عمل سے ہمیشہ چشم پوشی کی اور اپنا قلم ہمیشہ ان کی فرمائشوں کی تعمیل کے لیے رواں رکھا۔"

ایک شاعر کی سب سے بڑی پونجی، اس کا سرمایۂ سخن ہوتا ہی، لیکن ریاض کی عالی ظرفی اور بلند حوصلگی اِس سرمایے کو بھی حاتمِ دوراں کی طرح لُٹا رہی تھی۔

نواب اختر یار جنگ کی روایت ہو کہ:۔

"پرگو بلا کے تھے، اکثر ایسا ہوا ہو کہ ان کو ایک ہی طرح میں کئی کئی غزلیں کہنی پڑیں، ایک غزل کہی

جس نے اس کی تعریف کی، اس کو دے دی، دُوسری کہی، وہ بھی کسی نے مانگ لی، لیکن کیا مجال ان کے تیور پر ذرا بھی مَیل آیا ہو، ہمیشہ یہی کہہ کر ٹال دیا "اونھ کیا ہے اور کہہ لیں گے!"

مَیں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے جن لوگوں نے فریقِ مخالف کی حیثیت سے ریاضؔ کو بیخ و بُن سے اُکھاڑ پھینکنے کی کوشش کی، جنھوں نے ریاضؔ کے قلب و جگر پر کچوکے لگائے، جنھوں نے ان کا دل دو نیم کیا، ریاضؔ کی عالی ظرفی نے اسے بھی نہ روا رکھا کہ ان کے خلاف کوئی محاذ قائم کرنا تو بڑی بات ہے، کوئی بات سُن بھی لیتے، اگر کہا تو یہ:-

رہِ حیات کٹی اس طرح کہ اُٹھ اُٹھ کر
مَیں بیٹھ بیٹھ گیا گردِ کارواں کی طرح
ہمیں ہے گھر سے تعلق اب اس قدر باقی
کبھی جو آئے تو دو دن کو میہماں کی طرح
شریکِ درد نہ کیا باعثِ اذیت ہیں
وہ لوگ جن سے روابط تھے جسم وجاں کی طرح
ریاضؔ موت ہے اس شرط سے ہمیں منظور
زمیں ستائے نہ مَرنے پہ آسماں کی طرح

(۱۰) ذہانت!

معاملات کی تہ تک پہنچنے میں، حالات کو رُو براہ کرنے میں، زندگی کی مسافت قطع کرنے میں ریاض بڑے ذہین تھے، ان کی زندگی دل چسپ اور کارگر ذہانت کا پیکر تھی، وہ اپنی ذہانت اور فطانت سے ایسی اُلجھی ہوئی باتیں سلجھا لیتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی، ہار ماننا تو وہ جانتے ہی نہ تھے، جس کام کا بیڑہ اُٹھا لیا اس پر اپنی تمام قوت صرف کر دی۔ اس سلسلے میں ان کی حُسنِ تدبیر اور ذہانت کے بڑے لاجواب مرقعے آنکھوں کے سامنے آتے رہتے تھے۔

انوکھا انتظام!

ایک مرتبہ خیرآباد اور سیتاپور میں زور کا طاعون چلا، عجیب لرزہ خیز منظر تھا، انسانی زندگی حباب کی طرح ٹوٹ رہی تھی۔ آدمی اچھا بھلا بیٹھا ہے، گِلٹی نِکلی، بخار چڑھا اور آن کی آن میں چٹ پٹ۔

کون سی کی نہ دوا کون سی مانگی نہ دُعا!

لیکن دَوا بھی بے کار اور دُعا بھی بے نتیجہ، ایک ایک دن میں جان پہچان والے دس پانچ آدمی ختم ہوتے رہتے تھے۔

نیاز احمد صاحب اسی زمانے میں حکومتِ انگریزی کی ملازمت سے پنشن لے کر آئے تھے اور مع لاؤ لشکر کے سیتاپور میں مقیم تھے۔ خیرآباد کا سارا خاندان بھی وہیں منتقل ہو گیا تھا۔ ریاضؔ صاحب دن کو سیتا پور چلے آتے تھے اور شام کو واپس خیرآباد چلے جاتے تھے۔

قصبات میں شہروں کی طرح چھوٹے چھوٹے گھر نہیں ہوتے، بڑے بڑے وسیع اور کشادہ مکانات ہوتے ہیں۔ ریاضؔ کا مکان بھی ایسا ہی تھا، اتنا بڑا مکان۔ اور سارے گھر میں اکیلے ریاضؔ، خیرآباد۔ طاعون کی وجہ سے آدھا خالی ہو چکا تھا اور ہمارا محلّہ قضیارہ تو کہنا چاہیے، بالکل خالی ہو چکا تھا۔ ویرانی اور سنسانی کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جو پردہ نشین خواتین ایک گھر سے دوسرے گھر میں جانے کے لیے ڈولی کی محتاج ہوتی تھیں، وہ اب ایک محلّے سے دوسرے محلّے میں اگر جانا ہوتا تھا تو کاندھے پر محض احتیاطاً برقعہ ڈال لینا کافی سمجھتی تھیں، نہ آدمی نہ آدم زاد! ویرانی، سنّاٹا، دہشت! عجیب ہول ناک سماں تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ خیرآباد کے بعض اکابر سے ان کی سخت رنجش تھی، ان حالات میں گھر کے لوگوں کو بجا طور سے وہم ہوا اور ان کے متعلق طرح طرح کے اندیشے پیدا ہونے لگے۔ پہلے تو اس کی کوشش

کی گئی کہ وہ اس اکیلے گھر میں تنہا رہنا چھوڑ دیں اور خود بھی اپنے بال بچوں سمیت سیتاپور میں ہی رہیں، وہ بال بچوں کو سیتاپور میں رکھے ہوئے تھے لیکن خود خیرآباد نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ اس ویرانی اور تباہی کے دور میں چوری کی وارداتوں میں بھی بڑا اضافہ ہو گیا تھا اس لیے اور "اندیشہ ہائے دور و دراز" طاری تھے۔

ان حالات میں ریاض نے اپنے مکان کی رکھوالی کا ایسا انوکھا انتظام کیا کہ لوگ پھڑک اُٹھے۔

خیرآباد میں ایک مستند چور رہتا تھا جس کا نام ٹن تھا، بڑے بڑے معرکے سر کیے ہوئے اور بڑی بڑی کڑیاں جھیلے ہوئے، جیل خانے کو "سسرال" کہا کرتا تھا، بڑے جیوٹ کا آدمی تھا، پولیس بھی اس سے گھبراتی تھی، اسے نہ اپنی جان کی پروا، نہ دوسروں کی جان کا خیال، پولیس چوکی میں اسے روز حاضری لکھانی پڑتی تھی، ہر شخص ٹن کا نام سنتے ہی کچھ سہم سا جاتا تھا۔

ریاض صاحب نے آدمی بھیجا کہ "ٹن سے کہو "میاں بلاتے ہیں"۔ وہ فوراً آیا، آپ نے اسے گھر کا پہرہ دار مقرر کر دیا، شام کو مغرب کے بعد سے فجر تک کی ڈیوٹی لگادی، وہ بہ ظاہر بے کار بھی تھا اور پولیس

کے سامنے اپنا ایک ذریعۂ معاش ثابت کرنے کی اسے ضرورت بھی تھی، فوراً راضی ہو گیا۔

اس حادثے کی اطلاع جب سیتاپور میں ہوئی تو سب پریشان ہوتے "یہ آپ نے کیا غضب کیا؟" کوئی کہتا "چور اور گھر کی رکھوالی!" خود ان کے چھوٹے بھائی سید نیاز احمد صاحب جن کی ساری زندگی پولیس کی ملازمت میں گزری تھی اور جنھوں نے بڑے بڑے ڈاکوؤں کو گرفتار کر کے سرکاری انعامات حاصل کیے تھے، وہ بھی اس انتظام سے خوش نہیں تھے۔ ریاضؔ ان نکتہ چینیوں اور برہمیوں کا جواب اپنے دل نواز تبسم سے دیتے رہے، ان کا فیصلہ قائم رہا اور گھر والوں کا احتجاج بے کار ثابت ہوا۔

اس انتظام کا نتیجہ یہ نکلا کہ خیرآباد میں دھڑا دھڑ چوریاں ہوتی رہیں، خود ہمارے محلّے قضیارہ میں بھی کئی جگہ چوریاں ہوئیں، لیکن "گل کدۂ ریاضؔ" بالکل صحیح سلامت رہا۔

مقدمہ بازیاں

انھیں اپنی زندگی میں کئی بار مقدمہ بازیوں کے غیر دل چسپ اور غیر شاعرانہ جھمیلوں سے بھی سابقہ پڑا۔ مقدمے بھی کیسے بڑے معرکے کے!

وہ مختار اور وکیل کی خدمات سے فائدہ اُٹھاتے تھے، لیکن مقدمات کی ایک ایک شاخ اور ہر ہر جز تہ سے اتنی گہری واقفیت رکھتے تھے کہ خود وُکلا حیران رہ جاتے تھے۔ بعض دفعہ تو ایسا ہوا ہی کہ ان کے بیان کردہ نکات پر وکلا نے بحثیں کیں اور سارے مقدمے کی بنیاد قائم کی۔

والد کے انتقال کے بعد ہم دونوں بھائیوں کی جائداد انھی کی نگرانی میں آگئی تھی، انھوں نے اپنے بھروسے کے ایک آدمی کو مختارِ عام بھی مقرر کرایا تھا۔ سیتاپور میں ہمارے ایک عزیز بڑے کام یاب بیرسٹر تھے اور ہمارے تمام مقدمات کی پیروی وہ بے معاوضہ کرتے تھے۔ لیکن بیرسٹر صاحب ہوں یا مختار صاحب دونوں پر ان کی قانونی ژرف نگاہی کی دھاک بیٹھی ہوتی تھی۔

اسی طرح ایک اور جائداد کا مقدمہ تھا جس کے بے ضابطہ مشیرِ قانونی وہی تھے۔ یہ مقدمہ تو اتنا بڑا تھا کہ پریوی کونسل تک گیا اور وہ برابر ہر ہر مرحلے پر پوری ہمہ دانی کے ساتھ گویا بہ نفسِ نفیس مقدمہ لڑتے رہے۔ جس سوجھ بوجھ کے وہ تھے، اس سوجھ بوجھ کے انھیں مختار اور پیروکار نہیں ملے، نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے مقدمات میں حسبِ دل خواہ کام یابی نہیں ہوسکی اور ہم دونوں بھائیوں کی جائداد تو آخر میں کوڑیوں کے مول بک گئی۔

انجنیرنگ

انجنیرنگ کے فن میں ریاض صاحب کو خُداداد مَلکہ حاصل تھا، باضابطہ طور پر اس فن سے وہ بالکل نابلد تھے لیکن عملی طور پر اس سے خوب خوب کام لیتے تھے۔ انھوں نے اپنے عنفوانِ شباب سے لے کر عہدِ پیری تک اپنے آبائی مکان کو اپنی انجنیرنگ کا تختۂ مشق بنائے رکھا۔ ایک مکان کے اندر کئی مکان بنا لینا، چھوٹے سے چھوٹے مکان میں نئے نئے کمرے بنانا، دالان تعمیر کرانا اور اسے بزعمِ خود ایک پورے خاندان کے لیے موزوں اور آرام دہ ثابت کر دینا، ان کا کام تھا۔

ایک خاندان جو چند افراد پر مشتمل ہو، اسے کس طرح کا گھر چاہیے؟ یہی نا کہ صحن ہو، کمرے ہوں، دالان ہوں، باورچی خانہ ہو، غسل خانہ ہو، پاخانہ ہو، کوٹھریاں ہوں، جس گھر میں اتنی چیزیں ہوں گی، وہ یقیناً ایک اوسط درجے کے خاندان کے لیے کفایت کرے گا۔ اب یہ ان کی انجنیرنگ کا کمال تھا کہ چند گز زمین پر وہ مذکورۂ بالا سب چیزیں بہت ہی مختصر مدت میں خاص اپنی زیرِ نگرانی تیار کرا دیتے تھے۔ رہنے والے ناخوش ہوں، اسے ناکافی قرار دیں، اسے "تنگ، اور گھٹا ہوا" کہیں، اسے کبوتروں کی کابک سے تشبیہ

دیں، یہ ان کی ناسمجھی تھی!

(۱۱) کردار!

زندہ دِلی، خوش مزاجی، رجائیت!

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی!

جب ریاضؔ کی وفات ہوئی تو مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے لکھا تھا:-

"جانے والا اچھا گیا، ہیضے کی موت شہادت کی موت، زِندوں کے لیے باعثِ رشک، مُردوں کے لیے موجبِ فخر، ہنس ہنس کر جیا، مسکراتا ہوا دنیا سے اُٹھا!"

یہ واقعہ تھا! واقعی وہ "ہنس ہنس کر" جیے اور "مُسکراتے ہوئے" دنیا سے اُٹھے۔ یہ ان کا کردار تھا۔ وہ رونا نہیں جانتے تھے، مایوسی ان کے مذہب میں کُفر تھی، آس اور اُمید ان کے لیے مینارۂ نور کا کام دیتی تھی، جس کی روشنی میں وہ بحرِ طوفاں خیز کی سر بہ فلک موجوں کو چیرتے ہوئے آگے بڑھتے تھے اور اپنا راستہ نکال لیتے تھے۔ موت کے خوف سے وہ "جاں بہ لب" کبھی نہیں ہوتے، اُنھوں نے کافی عمر پائی اور ہمیشہ پُرامید رہے

کہ ابھی اور جئیں گے۔ وہ موت کو اندیشے کی چیز ہی نہیں سمجھتے تھے، ان کا خیال تھا، وہ ناگزیر چیز ہے جب آئے گی تو روکے نہ رُکے گی لہٰذا اس کی دہشت بے کار ہے، زندہ ہو تو اس طرح زندہ رہو کہ گویا تمھیں کبھی مرنا ہی نہیں ہے۔

جج سے باتیں!

سیتا پور کا ڈسٹرکٹ اینڈ سشن جج ایک انگریز ٹی۔ کے۔ جانسٹن تھا، بڑا بارُعب اور وجیہ، ساتھ ہی ساتھ بڑا شریف اور حسّاس بھی!

ہماری جایداد وغیرہ کے مقدّمات اس کی عدالت میں پیش ہوتے تھے، ہم یتیموں سے اسے بڑی ہمدردی تھی، مقدّمات کے سلسلے میں مَیں بھی کھیلتا کودتا ریاض صاحب کے ساتھ یا مختار صاحب کے ساتھ کچہری پہنچ جاتا تھا۔ دو ایک مرتبہ جج صاحب کے سامنے ہم لوگوں کی پیشی بھی ہوتی، اس سے وہ پہچان بھی گیا تھا۔ والد کی وفات کے بعد ہماری جایداد پر سازشیوں اور مخالفوں کے مشترکہ حملے ہو رہے تھے، کبھی فوج داری ہو گئی، کبھی فساد ہو گیا، کبھی کسی چپّے زمین پر قبضۂ مخالفانہ ہو گیا، کبھی باغ کے درخت کاٹ ڈلے گئے، کبھی آگ لگا دی گئی۔ یہ سب قضیے روز ہوتے رہتے تھے۔ اور زیادہ تر جج صاحب ہی کی عدالت میں پیش ہوتے

تھے۔ مقدمے کے سلسلے میں مختار صاحب جاتیں یا ریاض صاحب
میں ہم زاد کی طرح ان کے ساتھ ضرور ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ
قاضی جلیب اشرف صاحب بیرسٹر سے ملنے ریاض صاحب
گئے، وہ زیادہ تر عدالتِ جحی میں پریکٹس کرتے تھے،
میں ان کی باتوں سے اُکتایا تو میں نے کہا لاؤ جج صاحب
کی عدالت میں مقدموں کی کارروائی دیکھوں، تماشائیوں
کی بنچ پر میں جاکر بیٹھ گیا۔ جج صاحب جب لنچ کے لیے
اُٹھنے لگے تو ان کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ انھوں نے
اُردو میں اپنے سررشتہ دار صاحب سے کہا "معلوم کرو
یہ نابالغ کیوں آیا ہے؟ کوئی بات کہنے کا ہے؟"
سررشتہ دار صاحب فوراً میرے پاس آئے۔ پوچھا، میں
نے کہا "ایسے ہی آگیا!" جج مطمئن نہیں ہوا، اس نے
مجھے اپنے چیمبر میں بلایا اور بہت دل دہی سے پوچھا
"تم کیوں آیا؟" جب اس نے میری زبان سے جواب
سُن لیا تب مطمئن ہوا۔

اسی عدالت میں ولایت کا مسئلہ پیش ہوا کہ
"ہم" نابالغوں" کا ولی کون ہو چچا یا والدہ؟ دونوں کو
اپنے اپنے مطالبے پر اصرار تھا۔ جج والدہ کو ولیہ تسلیم
کرلینا چاہتا تھا، لیکن اسے یہ اندیشہ تھا کہ وہ ایک
پردہ نشین خاتون ہیں، انتظام نہیں کر پائیں گی۔ اس
لیے وہ یہ اطمینان چاہتا تھا کہ والدہ کو ان کا کوئی

بزرگ خاندان پوری پوری مدد دینے کو تیار ہو یا نہیں.
ہمارے نانا نیاز احمد صاحب میرٹھ میں انسپکٹر حلقہ تھے،
ظاہر ہے ان سے اس معاملے میں کسی طرح کی اُمید
نہیں کی جا سکتی تھی۔ ریاض صاحب عدالت میں پہنچے.
انھوں نے کہا میں تیار ہوں۔ جج نے پوچھا آپ پورا
وقت دیں گے؟ اُنھوں نے جواب اثبات میں دیا،
پھر اس نے کہا یہ تھوڑی مدت کا کام نہیں ہے،
یہ نگرانی اور امداد ۱۲ - ۱۵ سال تک جاری رکھنی ہوگی۔
ریاض نے کہا میں اس پر بھی تیار ہوں۔ جج نے زرا
جھجکتے ہوئے کہا "آپ کو امید ہے آپ اِتنے دن زندہ
رہیں گے؟" انھوں نے فوراً جواب دیا "یقیناً! اور اگر
میں زندہ نہ رہا تو میرے بھائی نیاز احمد کی پنشن میں
تھوڑی مدت ہے، وہ آ جائے گا!" جج مطمئن ہو گیا اور
اس نے والدہ کو ولی بنا دیا۔

اس واقعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں رجائیت
کتنی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی! چناں چہ اس واقعے
کے بعد وہ تقریباً ۲۰ سال زندہ رہے!

نئے کپڑے!

نئے کپڑے وہ بڑے شوق اور چاؤ سے بنوایا کرتے
تھے، گویا انھیں بہت دن زندہ رہنا ہے۔ میں جب اُن

کے نئے کپڑے دیکھتا تھا تو مجھے ان کی رجائیت پر حیرت ہوتی تھی۔ میں اپنے دل کو تولتا تھا تو محسوس کرتا تھا اگر میں اس عمر کو پہنچ جاؤں تو موت کے انتظار میں ہرگز ایسی "فضول خرچی" روا نہ رکھوں۔

عقیل صاحب نے سچ فرمایا ۔

"(ریاض) نماز پانچوں وقت کی پڑھتے تھے اور خضوع وخشوع سے، روزے تیسوں رکھتے تھے۔ لیکن اس عمر میں بھی اس انہماک و استغراق اور لطف ودل چسپی کے ساتھ زندہ تھے جیسے وہ جوان، "جسے مستقبل میں اپنی محنت اور عمر سے بہت سی امیدیں ہوں"!

یہی خصوصیت ان کے بھائی سید نیاز احمد صاحب مرحوم میں بھی تھی، (ابھی حال میں ان کا بھی انتقال ہوگیا) ۸۰ سے عمر متجاوز ہو چکی ہے، بلڈ پریشر اور دردِ گردہ کے مریض ہیں، لیکن بڑے اطمینان سے خیرآباد سے بھوپال تک کا سفر، شدید گرمی اور مسافروں کے ہجوم بے پناہی کے عالم میں کر رہے ہیں۔ مشاعرہ ہو تو ۴ بجے صبح تک اس میں شریک ہیں، کوئی منع کرے تو خفا ہو جاتے ہیں اور پرہیز تو ان کے نزدیک ایک بے معنی لفظ تھا!

آخری شادی!

انھوں نے آخری شادی تقریباً ۵۵ برس کی عمر میں

کی۔ قدرت نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ بڑھاپے میں اُن کے بچے ہوئے، لیکن ان میں سے بعض کو اُنھوں نے صاحب اولاد دیکھ لیا اور اس طرح خدا نے نہ صرف ان کی یہ حسرت پوری کر دی کہ خدا انھیں صاحب اولاد کردے بلکہ اس حسرت کی دوسری شاخ یعنی اولاد کی اولاد دیکھنا بھی خدا نصیب کرے پوری، ہو گئی۔

بڑھاپے کی شادی میں انسان دیوانہ وار اپنی اولاد کے ساتھ محبت کرتا ہو، یقیناً انھیں بھی اپنی اولاد سے بے انتہا اور بے تابانہ محبت تھی۔ باایں ہمہ انھوں نے اور: کی تعلیم و تربیت میں کبھی ایسی نرمی نہ برتی جو ان کے اخلاق و عادات پر بُرا اثر ڈالتی۔ وہ اپنے بچّوں کو اعلا تعلیم نہیں دِلا سکے اور مالی پریشانیوں کے باعث یہ چیز ان کے بس کی بھی نہیں تھی، لیکن انھیں زیورِ تربیت سے آراستہ کردیا۔ زیادہ تعلیم یافتہ نہ ہونے کے باوجود ان کے لڑکے اخلاق و عادات میں، شرافت اور معقولیت میں، ملنساری اور خوش اخلاقی میں بالکل اپنے نام ور باپ کا پرتو ہیں۔

جُرأت وہمّت!

کہن سالی اور ضعف و کہولت کے باوجود: وہ نڈر اور بے باک بھی بہت تھے۔ ان کا حوصلہ، ان کی ہمّت،

ان کی دلیری جوانوں کو شرماتی تھی۔

خیرآباد ایک ویران قصبہ ہے وہاں چوریاں اکثر ہوتی رہتی ہیں۔ ایک زمانے میں یہ افواہ اُڑی ہوئی تھی کہ اُن کے پاس بہت رُپیہ ہے۔ چوروں نے اس افواہ کی تصدیق کے لیے ان کا گھر تاکا اور تقریباً ہر روز پھیرا کرنا شروع کر دیا۔ یہ گرمی کا آخری زمانہ تھا، ابھی لوگ باہر صحن ہی میں سوتے تھے۔ اتفاق سے چوروں کی آمد کے ساتھ ہی جاگ ہو جاتی تھی اور انھیں بے نیلِ مرام واپس جانا پڑتا تھا۔

اب جاڑوں کا موسم آیا اور لوگ کمروں میں سونے لگے۔ ایک روز دو چور احاطے سے کمند لگاکر کوٹھے پر چڑھے، کوٹھے سے صحن میں اُترے، صحن سے انھوں نے بغلی کوٹھری کا رُخ کیا، یہ کوٹھری اس کمرے سے بالکل متّصل تھی جس میں ریاض صاحب سویا کرتے تھے۔ تھا کیا، جو چوروں کو ملتا، مزید اطمینان کے لیے انھوں نے تانبے کے برتنوں پر ہاتھ مارا، کھٹ پٹ جو ہوئی، ریاض کی آنکھ کُھل گئی۔ فوراً باہر نکلے، گھر میں سب عورتیں ہی عورتیں تھیں یا بچّے تھے۔ ہم سب لوگ خیرآباد سے باہر تھے۔ ان کی اہلیہ محترمہ نے انھیں منع بھی کیا، لیکن وہ کس کی سُنتے ہیں۔ اُن کے باہر آتے ہی چور زینے کی طرف بھاگے۔ یہ

ان کے تعاقب میں پیچھے پیچھے، گویا ارادہ یہ تھا کہ دونوں چوروں کو پکڑ کر انھیں قرار واقعی سزا دیں گے۔ لُطف یہ کہ چوروں کے ہاتھ میں نقب زنی کے آہنی ہتھیار اور آپ نہتّے اور بے یارومددگار۔ باہر احاطے میں عبداللہ خاں ریاضؔ صاحب کے دیرینہ ملازم استراحت فرما رہے تھے۔ اتفاق سے وہ اس وقت "حُقّہ" پینے اُٹھے تھے۔ انھوں نے جو یہ گڑبڑ سُنی تو دروازہ تھپتھپایا، اندر آئے۔ یہ وہ وقت تھا کہ چور چھو سات سیڑھیاں چڑھ چکے تھے اور تین سیڑھیاں ریاضؔ صاحب طے کر چکے تھے۔

پہلے چوروں کو یہ خیال تھا کہ یہ زینے تک آئے واپس جائیں گے، لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ یہ تعاقب کیے ہی جا رہے ہیں تو حملے کے لیے اترنا شروع کیا۔ وہ اگر انھیں ایک دھکّا بھی دے دیتے تو ان کی زندگی کا خاتمہ تھا۔ عبداللہ لال ٹین لیے اور ایک ہاتھ میں گرزِ گراں لیے ہوئے پہنچے، اب چوروں کے حواس پرّاں ہوئے اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ جب وہ پھاندے ہیں تو اتفاق سے پولیس کی رونڈ آرہی تھی۔ ایک تو بچ نکلا دوسرا گرفتار ہو گیا پھر وہ مفرور بھی پکڑ لیا گیا۔ دونوں عدالت میں پیش کیے گئے اور سزایاب ہوئے۔

پاک بازی

ریاضؔ کے کردار کی ایک اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ پاک بازی اور پاک نہادی ان کی سرشت بنی رہی۔ ان کی زندگی نے کئی پلٹے کھائے لیکن کسی دور میں بھی وہ جادۂ اخلاق سے منحرف نہ ہوئے۔ یہ ان کی زندگی کا طغرائے امتیاز ہے کہ رنگیں طبع اور رندمزاج ہونے کے باوجود انھوں نے کبھی کوئی ناجائز فعل نہیں کیا۔ خدا کا ڈر، حشر کی جواب دہی، ایمان اور اخلاق، یہ وہ محافظ تھے جنھوں نے کبھی بھی انھیں آوارہ اور اوباش نہیں ہونے دیا۔ ان کے بدترین دشمن بھی اس کے معترف ہیں کہ انھوں نے شاہدبازی نہیں کی، حوّا کی بیٹیوں سے ناجائز رابطہ نہیں قائم کیا، حدودِ شرعی سے کبھی باہر نہیں گئے۔ میں سمجھتا ہوں ان کے اخلاق کی بلندی اور کردار کی استقامت کا یہ بہت روشن رُخ ہے!

شاید یہی وجہ ہے کہ وہ دوسری دُنیا کے بارے میں بھی اتنے ہی پُراُمید تھے جتنے اس دنیا میں نظر آتے تھے:

رحمت سے ریاضؔ اس کی ہیں ساتھ فرشتے دو
اک حور بھی بڑھ جاتی تو اور مزا ہوتا!

انھوں نے اپنے کردار کا جو نمونہ قائم کیا، اس نے یقیناً انھیں اس کا سزاوار بنا دیا کہ آج حور و غلماں ان کی خدمت گزاری کر رہے ہوں!

پردے کی سختی!

پردہ شکنی کے بڑے سخت مخالف تھے بلکہ ہندستانی پردے کے دل و جان سے حامی تھے۔ وہ خود بھی اس کے معترف تھے کہ یہ پردہ اسلامی پردہ نہیں ہے، لیکن پھر بھی عمل اسی پر تھا۔

ممکن نہیں تھا کہ ان کے خاندان کی کوئی لڑکی یا خاتون پردے کے حدود میں ذرا بھی ترمیم کر سکے۔ عبداللہ ان کا پرانا، وفادار اور کہن سال ملازم ہے۔ اس پر وہ اتنا بھروسا کرتے تھے جتنا کوئی اپنے کسی قریبی عزیز پر کر سکتا ہے لیکن عبداللہ سے بھی بڑی سختی سے پردہ کرایا جاتا تھا۔ اب ان کی وفات کے بعد اس سے پردے کی وہ شدت نہیں قائم رہی ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے گھر کی لڑکیاں اور عورتیں اس سے "کانا پردہ" کرتی ہیں لیکن جب تک وہ زندہ تھے، یہ ممکن نہ ہو سکا۔

وہ اپنے گھر کی لڑکیوں اور عورتوں سے بڑی عزت اور محبت کا برتاؤ رکھتے تھے۔ ان کی بے انتہا

دل جوئی کرتے تھے، ان کی راحت و آرام کا پورا خیال رکھتے تھے، کبھی انھیں جھڑکتے یا ڈانٹتے نہیں تھے، ہمہ تن رفق و محبّت بنے رہتے تھے، لیکن اس پردے کے معاملے میں وہ ان کے ساتھ بھی کوئی رعایت نہیں کرتے تھے۔ ایسے مواقع پر ان کی آنکھوں سے شرارے نکلنے لگتے تھے۔

مثلاً بہشتی آیا ہو، یہ ممکن نہیں ہو کہ کوئی چادر لے کر کھڑا ہو جائے اور بہشتی پانی بھر کے چلا جائے۔ ہر عورت اور ہر لڑکی کو فوراً کمرے میں چلا جانا چاہیے۔ ان کی موجودگی میں اس اصول پر شدّت سے عمل ہوتا تھا، لیکن اگر وہ باہر ہوئے تو ذرا اس میں نرمی برت لی جاتی تھی۔ اتفاق سے اگر ایسے وقت آ گئے تو نہ بہشتی کی خیر ہو نہ گھر کی، بہت برہم ہوتے تھے بُری طرح ڈانٹتے تھے!

تربیت!

تعلیم سے ریاض صاحب کو بڑی دل چسپی تھی، وہ اپنے گھر کی خواتین کو بھی زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی بھتیجی (میری والدہ) اور بھانجی کی تعلیم میں بہت زیادہ انہماک برتا اور ان کی تعلیم اس درجے تک

پہنچا دی کہ اگر انھیں خواتین میں بہترین انشا پرداز اور بہترین شاعر کہا جائے تو ہرگز مبالغہ نہ ہوگا۔ خواتین کو غزل کی شاعری کی اجازت نہیں تھی۔ حمد، نعت اور مذہبیات یا مرثیے، بس شاعری کے یہ حدود تھے جو انھوں نے قائم کر دیے تھے۔

خواتین کی "نشر و اشاعت" کے بھی وہ سخت مخالف تھے، وہ اسے پسند نہیں کرتے تھے کہ عورتیں اپنے مضامین یا اپنی نظمیں اخباروں اور رسالوں میں چھپوائیں اور اس اصول پر اپنے خاندان میں سختی سے عمل کرتے تھے۔ ان کی بھانجی نے ایک بڑا پُر درد مرثیہ اپنے شوہر کی وفات پر کہا تھا۔

کسی کے ارمانوں کا مدفن ہو تو اے مٹی کے ڈھیر!

اس پر انھوں نے نظرِ ثانی بھی کی تھی، پسند بھی بہت کیا تھا۔ ان کے بھائی نے اسے شائع کرانا چاہا، اس کی اجازت نہ دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کہیں گم ہو گیا اور اب اس کے اشعار بھی اچھی طرح نہیں یاد رہے!

غرض ریاضؔ کی زندگی اپنے اخلاق و کردار کے اعتبار سے ایک کامل نمونہ تھی۔ ایسا نمونہ جس کی تقلید کی جا سکتی ہو لیکن جس پر حرف زنی نہیں کی جا سکتی!

(۱۲) شراب اور ریاضؔ!

شعرِ تر میرے چھلکتے ہوئے ساغر ہیں ریاضؔ
پھر بھی سب پوچھتے ہیں آپ نے ٹوپی کہ نہیں؟

جن لوگوں نے ریاضؔ کا کلام دیکھا ہی، جنھوں نے ان کے خمریات کا مطالعہ کیا ہی، جن کی نظروں سے شراب سے متعلق ان کی نازک خیالیاں اور بلند پروازیاں گزری ہیں، ان کا عام خیال یہی ہی کہ ریاضؔ بادۂ ناب کے متوالے تھے، ان پر ہر وقت نشہ چھایا رہتا تھا، ساغر و مینا ان کی زندگی کے رفیق تھے، ساقی و میخانہ ان کے امامِ راہ اور مرکزِ خیال تھے، لیکن کیا یہ واقعہ ہی؟ واقعات کا جواب نفی میں ہی۔

ریاضؔ نے شراب کے مضمون کو اُردو زبان میں اپنا لیا ہی۔ جو لوگ شراب پی پی کر شعر کہتے ہیں اور شعر کہہ کے شراب پیتے ہیں، ان کے ہاں بھی شراب کے مضامین میں وہ بے ساختگی، وہ ادائے بیان، وہ جذبات و ندرت نہیں ملے گی جو ریاضؔ کے ہاں نظر آتی ہی۔ اُردو زبان میں خمریات کو فن کی حیثیت سے فروغ دینے والے ریاضؔ ہی ہیں، لیکن یہ حقیقت ہی کہ ان کی زبان تک اس آتشِ سیال کا ایک قطرہ بھی نہیں گیا۔ اس زمانے میں بھی نہیں

جب وہ یکسر شباب و شعر بنے ہوئے تھے اور اس وقت بھی نہیں جب تقدیس اور ریاضؔ ہم معنی الفاظ ہو کر رہ گئے تھے۔ انھیں شراب سے اتنی ہی نفرت تھی جتنی ایک مرد مومن کو ہو سکتی ہے۔

وہ شاعر بھی تھے، رند مزاج بھی تھے، رنگیں طبع بھی تھے، سب کچھ تھے، لیکن سب سے پہلے مسلمان تھے۔ انھوں نے اپنی اس حیثیت کو کسی جذبے، کسی وقت اور کسی کیفیت کے ماتحت فنا نہیں ہونے دیا۔ یہی ان کی زندگی کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔

بعض "محققین" کا خیال ہے، ریاضؔ نے شراب کی جو کیفیتیں باندھی ہیں، وہ واقعی نہیں معلوم ہوتیں۔ ان سے صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ شراب پیتے نہیں، شراب سے کھیلتے ہیں۔ یہ تفریق وہ اس لیے کرتے ہیں کہ اپنی ہمہ دانی کے وقار کو وہ مجروح ہوتا ہوا دیکھتے ہیں۔ انھیں اس پر اچنبھا اور اچنبھے کے ساتھ غصہ آتا ہے کہ ہم نے شراب پی پی کے اپنا جگر خراب کر لیا، لیکن وہ مضامین ہمارے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آتے جو ریاضؔ کی اک ادنا جنبشِ لب پیدا کر دیتی ہے۔

سچ پوچھیے تو ان اصحاب کی یہ برہمی اور خفگی ایک حد تک بجا ہے، ورنہ اس جذبے سے قطع نظر کر کے

اگر دیکھا جائے تو ماننا پڑے گا کہ خمریات کا فن ریاضؔ نے ایجاد کیا اور انھی پر ختم ہو گیا۔

جو شخص یہ شعر کہہ سکتا ہو:۔

کیسی خوشامدیں ہیں کہ پی لوں بہار میں
بادل کے ٹکڑے سر پہ مرے چھائے جاتے ہیں

اس کے متعلق صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ جو کچھ کہتا تھا، کیفیات میں غرق ہو کر کہتا تھا، پیتا یا نہ پیتا یہ دوسری چیز ہے۔

بہرحال یہ ایک حقیقت ہے کہ ریاضؔ لذّتِ شراب سے کبھی آشنا نہیں ہوتے۔

خیّام الہند!

مولوی سُبحان اللہ خاں تحریر فرماتے ہیں:۔

"گورکھ پور کی جس صحبت میں ریاضؔ بلبلِ شیراز بنا ہوا تھا، وہ صحبت خوش باش، خوش پوش لوگوں کی تھی۔ عیش و انبساط میں اپنا وقت گزارنے والے لوگ اس صحبت میں مثلاً اگر دو درجن آدمی تھے تو ڈیڑھ درجن ضرور شرابی تھے۔

ریاضؔ کی شاعری اس مستی کے ماحول میں گام زن تھی لیکن وہ اس "شرابور" صحبت میں بھی ایک قطرہ شراب سے ناآشنا تھے مگر طبیعت کی شوخی اور شرارت؛ دوستوں

کی شراب نوشی، شاعری میں لطافت پیدا کرنے کی شراب نوشی ان سب نے مِل کر ریاضؔ کو خیام الہند بنا دیا۔"

شہادتِ مینا!

نوّاب اختر یار جنگ مینائی کا بیان ہے:۔

"حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑے پاک نفس اور سچے مسلمان تھے۔ ان کا رندانہ رنگ ان کی شاعری ہی تک تھا:

جو رنگ قال میں دیکھا وہ ان کا حال نہ تھا!

اللہ تعالا اپنے فضل سے اُس دنیا میں بھی ان کے درجے بلند کرے!"

مولوی سبحان اللہ خاں ایک اور سلسلے میں ارشاد فرماتے ہیں:

"ریاضؔ کا سراپا شاعری بن گیا تھا اور شاعری میں شراب بن گیا تھا۔ شراب ہی نہیں کبھی ساغر کبھی سبو، کبھی خم نظر آتا تھا۔ مَیں نے گھٹ کر کہا مَیں نے تو ان کو مےخانہ بنے چلتے دیکھا ہے۔ کہیں آپ کو یہ شبہہ نہ ہو جائے کہ جناب ریاضؔ مرحوم شرابی تھے، لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللہِ۔ ہر جاننے والا اور پورا گورکھ پور اور خیرآباد، قرآن لے کر دن اور رات کی تمام عمر کی صحبتوں کی بابت قسم کھانے کو تیار ہے کہ ریاضؔ مرحوم نے کبھی ایک بوند بھی شراب لب تک نہ آنے دی!"

یہ ایک ایسے شخص کی شہادت ہے: جو ان کا عزیز ترین دوست تھا، رازدار تھا، ان کی زندگی کے ہر ہر رُخ سے واقف تھا!

ایک لطیفہ!

عرصے کی بات ہے ریاضؔ صاحب ایک مرتبہ بھوپال سے واپس تشریف لارہے تھے۔ اتفاق سے مولانا راشد الخیری مرحوم بھی ہم سفر تھے۔ جاڑے کا موسم تھا، جھانسی کے اسٹیشن پر مولانا راشد الخیری نے انھیں چاے پیش کی۔ انھوں نے کچھ تکلف کیا۔ انھوں نے فرمایا "پی لیجیے" یہاں وہ چیز تو ہے نہیں جس کے آپ عادی ہیں!"

(۱۳) افکار و ہموم

سوزشِ باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں
دل محیطِ گریہ ولب آشنائے خندہ ہے! (غالب)

جب ریاضؔ اپنے والد کے زیرِ سایہ زندگی بسر کرتے رہے پھر بعد میں جب تک ریاض الاخبار نکلتا رہا، ریاضؔ کی مالی حالت بالکل قابلِ اطمینان تھی۔ جتنا ان کا خرچ تھا، اس سے کچھ زیادہ ان کی آمدنی تھی، لیکن ایک

حادثے سے متاثر ہو کر جب انھوں نے اپنی لٹریری سرگرمیاں ترک کر دیں۔ ریاض الاخبار بند کر دیا اور پبلک لائف سے الگ ہو کر خیرآباد میں خانہ نشین ہو گئے تو ان کی مالی پریشانیوں کا دور شروع ہوا۔

ریاست محمود آباد سے انھیں وظیفہ ملتا تھا، وہ اگر تنہا ہوتے تو یہ رقم ان کی اکیلی جان کے لیے بہت کافی تھی؛ لیکن جس زمانے میں وہ کماتے تھے لاولد رہے اور جب پانو توڑ کر گھر بیٹھ رہے تو خدا نے انھیں اولاد سے نوازنا شروع کیا۔ اپنی اولاد سے انھیں جتنی زیادہ محبت تھی، اس سے زیادہ اولاد کی تعلیم، تربیت اور مستقبل کی انھیں فکر تھی۔ اس فکر نے انھیں بہت پریشان کر رکھا تھا۔ سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ آدمی خوددار تھے۔ جو شخص اپنے سگے بھائیوں سے امداد کا طالب نہ ہوتا ہو وہ دوسروں سے امداد و اعانت کا کیوں کر طالب ہو سکتا تھا۔ اس مختصر رقم میں ان کا حوصلہ نہیں پورا ہوتا تھا اور وہ گھُٹ گھُٹ کر رہتے تھے۔

خیرآباد کی خاک اب انھیں اتنی محبوب تھی کہ وہ نقل مکان کرنے کو تیار نہیں تھے۔ اگر وہ لکھنؤ چلے جاتے یا کسی اور ریاست میں اس کے حسبِ طلب جانے پر آمادہ ہو جاتے تو ان کی مشکلیں بڑی حد تک

ختم ہو جاتیں لیکن وہ اس کے لیے کسی طرح تیار نہیں ہوتے تھے اور پچاس رُپے کے اندر اپنے تمام حوصلے پورے کرنا چاہتے تھے۔ یہ ممکن نہ تھا اس لیے دل پر ہمیشہ ایک بوجھ سا رہتا تھا۔

لیکن ان افکار و ہموم کے باوجود ان کی شگفتگی اور شگفتہ رُوئی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ مغموم بیٹھنا جانتے ہی نہ تھے۔ کیسا ہی غم ہو، کیسی ہی پریشانی ہو، کیسا ہی دُکھ ہو؛ ان کی بذلہ سنجی اور نکتہ آفرینی برابر قائم رہتی تھی۔ وہ خود خواہ کتنے ہی رنجیدہ اور افسردہ ہوں لیکن دوسروں کا رنج و غم دُور کرنے، ان میں مسرّت کی اُمنگ اور خوشی کی ترنگ پیدا کرنے میں وہ ہمیشہ چوکس رہتے تھے۔

نیازؔ کا بیان

جناب نیازؔ فتح پوری مدیر نگار تحریر فرماتے ہیں:۔

"ریاضؔ کو مَیں نے اس وقت دیکھا جب وہ ضعف و کہولت کے دوَر سے گزر رہے تھے لیکن باوجود اس کے کہ زمانہ موافق نہ تھا، حالات نے سخت دل گیر بنا رکھا تھا، ہجومِ افکار نے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ لیکن ریاضؔ باوجود سراپا غم والم ہونے کے دوسروں کے لیے یکسر بہار و شگفتگی تھے۔ آپ خواہ کتنے ہی

مغموم و ملول کیوں نہ ہوں لیکن یہ ممکن نہیں کہ ریاضؔ آپ کو مل جائیں اور تھوڑی دیر کے لیے آپ کسی اور عالَم میں نہ پہنچ جائیں۔ ان کی دل کش اور دِل نشین گفتگو، ان کا اندازِ بیان، ان کی لطیفہ بذلہ سنجیاں اور پھر سب سے بڑھ کر ان کا خلوص یہ معلوم ہوتا تھا کہ انسان کسی ایسی فضا میں پہنچ گیا ہو جہاں فردوس کی ہوا ہو۔ کوثر و سلسبیل کی روانی ہو اور طوبیٰ کے طیور کا ترنّم، بچّوں کے لیے ان کا وجود گہوارۂ استراحت، جوانوں کے لیے ان کی ہستی داستانِ حُسن و عشق اور ضعیفوں کے لیے ان کی ذات ایک برادرانہ آغوش تھی۔ یہ ممکن نہیں کہ کوئی شخص ریاضؔ سے ملے اور اپنے ذوق کو ان کے پاس سے ناآسودہ واپس لائے!"

نیازؔ صاحب کے مؤقلم نے ریاضؔ کی یہ بالکل صحیح تصویر کھینچی ہو!

ریاضؔ کے سب جاننے والے ان کی پریشانیوں سے واقف تھے اور سب کو حیرت تھی کہ جو شخص افکار اور ہموم میں اس درجہ گھرا ہوا ہو، وہ اتنا خندہ رُو اور شگفتہ مزاج کیسے رہ سکتا ہو۔ لیکن ریاضؔ کی کیفیت یہی تھی۔ اپنی اس آن اور وضع میں انھوں نے کبھی فرق نہیں آنے دیا!

بیانِ واقعہ

مولانا ظفرالملک صاحب علوی کا بیان ہے:۔

"مرحوم ریاضؔ کی زندگی بجائے خود ایک پُر درد کہانی تھی جس نے ان کے اشعار میں ایک خاص اثر پیدا کر دیا تھا اور اسے محض ان کا اعجازِ شاعری سمجھنا چاہیئے کہ نیرنگیِ دنیا کے دردناک و الم آگیں تجربات کے بعد بھی ان کے کلام میں یاس و قنوط کے بجائے تازگی، زندگی اور شگفتگی باقی رہی"۔

ریاضؔ کی وفات پر رسالۂ ساقیؔ کے مدیر شاہد احمد صاحب نے لکھا تھا:۔

"آخری عمر میں اتنی مہلت نہ ملی کہ ایک سال بھی فراغت سے شاعری کر سکتے۔ عجب عجب افکار میں مبتلا تھے۔ بہ قولِ خود:

دُنیا کی کاہشوں سے ہمیشہ رہا اُداس
پر آدمی ریاضؔ عجب دل لگی کا تھا!"

اگر یہ افکار و ہموم ان کی زندگی کو تلخ نہ بنا دیتے، انھیں ذہنی و دماغی اُلجھنوں میں نہ مبتلا نہ کر دیتے تو ان کی شاعری کی شگفتگی اور تازگی کا رنگ نہ معلوم کیا ہوتا؟

(۱۴) مہاراجا محمود آباد!

سر محمد علی خاں مہاراجا محمود آباد قدرت کی طرف سے عجیب دل و دماغ لے کر آئے تھے۔ وہ اگر تعلق دار نہ ہوتے تو عجیب نہیں کہ ایک اعلا درجے کے ادیب ہوتے۔ ادبی ذوق بھی ان کی فطرت میں داخل تھا اِس لیے ادیبوں اور شاعروں کی سرپرستی ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ خدا نے انھیں دولت دی تھی اور وہ اپنی دولت کا بڑا حصہ علمی و ادبی سرپرستی، محتاجوں اور مستحقوں کی حاجت روائی، ضرورت مندوں اور مفلوک الحال سفید پوشوں کی اعانت میں صرف کیا کرتے تھے۔

ریاضؔ کی شاعری اور ریاضؔ کی شخصیت کے وہ دل دادہ تھے۔

ریاض الاخبار!

ریاضؔ نے ریاض الاخبار لکھنؤ سے نہیں گورکھ پور سے نکالا تھا۔ یہ اخبار بڑی آب و تاب اور دھوم دھام نکلتا تھا۔ ایک عرصۂ دراز تک وہیں سے نکلتا رہا۔ جیسے جیسے ریاضؔ اور مہاراجا کے تعلقات بڑھتے گئے، ویسے ویسے مہاراجا کی یہ آرزو بڑھتی رہی کہ ریاضؔ گورکھ پور سے لکھنؤ آ جائیں۔

لیکن گورکھ پور ریاضؔ کا "گُل کدہ" بنا ہوا تھا۔ وہ کسی قیمت پر گورکھ پور چھوڑنے پر تیار نہیں ہوئے۔ یہ گورکھ پور کی کشش تھی کہ بڑی بڑی ریاستوں نے انھیں اپنے ہاں بیش قرار مشاعروں پر بلانا چاہا لیکن اُنھوں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا کہ وہ گورکھ پور چھوڑ کر کسی اور جگہ جا سکتے ہیں۔

پھر جب "صلحِ کُل" نکلا اور اس سلسلے میں حضرت ریاضؔ کی ذمّے داریوں کے ساتھ پریشانیوں میں اضافہ ہوا اور مہاراجا کا مخلصانہ اِصرار بھی حد سے تجاوز کر گیا تو انھیں مع ریاض الاخبار کے لکھنؤ آنا ہی پڑا، اب ریاضؔ جوان نہیں تھے، بوڑھے ہو چلے تھے۔ یہ ۱۹۰۸ء کا واقعہ ہے۔ لکھنؤ پہنچے تو انھوں نے فرمایا:

ریاضؔ تھی جو مقدر میں بازگشتِ شباب
جوان ہونے کو پیری میں لکھنؤ آئے!

مہاراجا کی سرپرستی میں ریاض الاخبار اسی شان سے لکھنؤ سے شائع ہونے لگا۔ لیکن:

بھلا گردش زمانے کی کسے دیتی ہے چین انشؔا

تھوڑے ہی عرصے کے بعد یہاں وہ واقعہ پیش آیا جس نے ریاضؔ کی زندگی میں انقلابِ عظیم پیدا کر دیا اور یک لخت انھوں نے پبلک زندگی سے قطع تعلق کر لیا۔ اب لکھنؤ میں بھی ان کا جی نہیں لگتا تھا۔ ریاض الاخبا

بند کیا اور خیرآباد جا کر بیٹھ رہے۔ ریاضؔ کو مہاراجا سے اور مہاراجا کو ریاضؔ سے وہی نسبت تھی جو سیف الدولہ سے متنبی کو۔ دونوں ایک دوسرے کا حد درجہ پاس و لحاظ رکھتے تھے۔ جب ریاضؔ نے خیرآباد کی مستقل اقامت اختیار کر لی تو بھی مہاراجا کی سرپرستیوں کا سلسلہ بند نہیں ہوا۔ انھوں نے ان کا ماہ وار وظیفہ مقرر کر دیا۔ ریاضؔ نے اس پر قناعت کی اور خانہ نشینی کی زندگی بسر کرنے لگے۔

وہ خیرآباد میں نسبتاً سکون کی زندگی بسر کر رہے تھے، لیکن مہاراجا سے ان کی وابستگی اور تعلق میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ کبھی کبھی لکھنؤ جاتے رہتے تھے، جب جاتے تھے، مہاراجا سے ضرور ملتے تھے۔ ریاضؔ اور مہاراجا کے تعلقات اس درجہ بڑھ گئے تھے کہ بہت جلد وہ بہت سے لوگوں کی نظر میں محسود بن گئے اور اس سے انھیں خاصا نقصان بھی پہنچا۔

ریاضؔ کی عقیدت!

جہاں تک ریاضؔ کا تعلق تھا، وہ بھی مہاراجا کے بے انتہا مدّاح و معترف تھے اس لیے نہیں کہ ان کی ریاست سے انھیں وظیفہ ملتا تھا۔ اگر وہ درباروں پر مدح و ثنا کا انحصار رکھتے تو رام پور اور حیدرآباد سے

کئی گنا زیادہ درماہہ مل سکتا تھا ان کی وصف وثنا جوش پر اس لیے تھی کہ وہ مہاراجا کی شخصیت سے متاثر تھے۔

ریاضؔ نے جب لکھنؤ کا قیام ترک کیا اور خیرآباد میں ڈیرا جمایا تو بھی مہاراجا صاحب کی طرف سے صلائے عام تھی جب چاہیں لکھنؤ آجائیں۔ لکھنؤ میں پھر مستقل قیام اختیار کرلیں۔ لکھنؤ کے مزید مصارف بھی مہاراجا کے ذمے، بچوں کی تعلیم کا بار بھی مہاراجا کے خزانۂ عامرہ پر، لیکن وطن کی خاک ایسی دامن گیر تھی کہ وہ اس ترغیب و تحریص کے باوجود ترکِ وطن پر آمادہ نہ ہوئے۔

حُسنِ طلب!

سنہ ۱۹۲۲ء میں خیرآباد اور اطراف میں شدید بارش ہوچکی۔ ریاضؔ کا آبائی مکان، جس پر وہ بلاشرکتِ غیرے قابض و متصرّف تھے، اس طوفان کو نہ سہہ سکا اور کئی جگہ سے منہدم ہوگیا، اس زمانے میں انھوں نے ایک "قطعۂ تہنیت خطاب" کے عنوان سے ایک نظم کہی جس میں اپنی اس پریشانی کا ذکر بھی بہت دِل چسپ اور لطیف انداز میں کیا ہے۔ سارا قطعہ اپنے اندر عجیب عجیب کمالات پنہاں رکھتا ہے۔ بہ قول حکیم برہم مدیر مشرق:

"اس قطعے کو پیشِ نظر کر لیجیے تو تشبیب، استعارات، تشبیہات، تلمیحات، تخییل و محاکات ودیگر اصنافِ شاعری کے پھولوں کا غیر فانی لہلہاتا ہوا باغ نظر آئے گا۔ حضرت ریاضؔ کا یہ بے بدل کمال ہے۔ اس قطعے میں لازوال عذوبت پیدا کر دی ہے۔ اگر بیان حقیقت منظور ہوا ہے تو شعروں کے ذریعے متحرک تصویر کھینچ دی ہے اور اگر ممدوح کی تعریف کی باری آگئی ہے تو شان وشوکت کا ایک طلسم باندھ دیا ہے۔ قطعہ کیا ہے، کرشمہ ہائے لطفِ سخن کا طلسم کدہ ہے یا بولتی تصویروں کا ایک مرقعۂ دل کش ہے"!

آئیے برہم صاحب کے اس دعوے کو ذرا پرکھنے کی کوشش کریں:-

آسماں سے بادۂ گل رنگ لائی ہے بہار
ابر سے ٹکرا رہی ہے آج کاشانے کی چھت
ہم بغل مینا سے مے کش ہو رہے ہیں، عید ہے
آئیں واعظ کے فرشتے تو ابھی بن جائے گت
ہے خوشی رتبہ بڑھا سرکار سے سرکار کا
کے سی، اس، آئی، ہوئے آقائے عالی منزلت
آئینہ بردار تیرے سطوت و جاہ و جلال
اے فریدوں فر، سکندر رتبہ، دارا منزلت

عہد میں تیرے نظر آتے ہیں کیسے کام یاب
صیغہ ہائے انتظام و صیغہ ہائے معدلت

گھر بھی رہنے کو نہیں سرکار کے در کے سوا
اور ہو زیرِ نگیں میرے سخن کی مملکت

ذات بیتی کیا کہوں یئیں رات بھی برسات کی
ابرِ باراں بن گیا ہو جھک کے میرے گھر کی چھت

بھول بیٹھے مفلسی میں ہم مے و معشوق کو
شوقِ عصیاں کے عوض ہو دل میں ہو خوفِ معصیت

ایک دن زاہد کی دعوت کر کے پچھتانا پڑا   وقت پر کرنا پڑی بے مائگی سے مع

شکر ہو ورد و وظائف میں بسر ہوتی ہو خوب   شکر ہو گھر بیٹھے ہوتا ہو وظیفہ مرح

پانو لٹکائے ہوئے ہوں قبر میں پروا نہیں
کیسی دُنیا فکر ہو بن جائے میری آخرت

دور جام و سلسبیل کوثر و تسنیم ہو
اب زباں پر رات دن ہو حمد و نعت و منقبت

ابرِ نیساں سے سوا دستِ کرم سرکار کا
سب لکیریں ہاتھ کی ہیں جوڑے جود و مکرمت

مصرعِ تاریخ یہ ہو بہر القاب حضور
کے، سی، اس، آئی لقب سرِ راجا کیواں مرتبت!

یہ پورا قطعہ نہیں ہو؛ اس کے چند اشعار ہیں
ریاضؔ قصیدہ گو شاعر نہیں تھے۔ قصیدے کے لازمی
اجزا شکوہِ بیان اور شان دار الفاظ ہوتے ہیں۔ اس

التزام کو ملحوظ رکھنے کے باوجود ریاضؔ کی وہ خاص ادا اور شوخی کے جلوے بھی اس میں صاف نظر آرہے ہیں!

ممدوح کا انتقال

۱۹۳۱ء کے محرم میں مجالسِ محرم کے سلسلے میں مہاراجا صاحب لکھنؤ سے محمود آباد گئے ہوتے تھے۔ دردِ دل کا دورہ پڑا اور فوراً اس جہانِ فانی سے رحلت فرما گئے۔ ریاضؔ کو اس حادثے کا جتنا صدمہ ہوتا، کم تھا۔ انھوں نے ایک طویل نظم میں تاریخِ وفات نکالی۔ یہ نظم ان کے قلبِ محزوں کے جذبات وتاثرات کا آئینہ ہی۔ اتنی گنجایش کہاں کہ ساری نظم دی جا سکے، خلاصہ درج کیا جاتا ہی:۔

چشمِ تر بہت میں جلوۂ رنگیں
سر تر بہت بہارِ باغِ جناں
دردِ اسلام خوں چکاں دل میں
اثرات اس کے رنگِ رخ سے عیاں
قوم کے واسطے سراپا درد
ہمہ تن ملک کے لیے رگِ جاں
ہائے وہ آنکھ اشک سے لبریز
موج در موج جیسے بحرِ رواں
خاکساری میں وہ عروج، وہ اوج

لیں قدم طرہ ہائے تاج کیاں
کھل کے داد و دہش میں حاتم طے
اور پوشیدہ "دستِ رزق رساں!"
"دست رزق رساں" ایک اچھوتی ترکیب ہے!
موجِ آبِ گہر اُٹھے جس سے
ہاتھ کی ہر لکیر جوئے رواں
مرثیہ پڑھنے میں خود اپنی نظیر
اور کہنے میں بے عدیلِ جہاں
قبر پُر نور کا وفور ہے آج
ذرہ ذرہ ہے نیرِ تاباں
سایہ گستر ہے دامنِ زہرا
کہہ رہی ہے یہ پاکیِ داماں
بعد رحلت بھی زندۂ جاوید
چھپ کے زیرِ زمیں بھی جلوہ عیاں

یہ بھی بیانِ واقعہ تھا! مہاراجا کی وفات نے ریاضؔ کو لازوال صدمے میں مبتلا کر دیا تھا!

لکھنؤ ہائے لکھنؤ نہ رہا
اب وہ صحبت کہاں وہ لطف کہاں

اس ایک شعر میں ریاضؔ نے قیصر باغ اور ٹیلہ پہلیں کی بزم آرائیوں اور کیف انگیزیوں کا پورا مرثیہ کہہ ڈالا۔

بے کسوں کا ہی چارہ ساز اب کون
اب غریبوں کا دِل نواز کہاں
یادِ ایامِ لطفِ شعر و سخن
اب وہ ساحرؔ کہاں ریاضؔ کہاں

ساحرؔ ہمارا جا مرحوم کا تخلص تھا۔

سرِ تربت بہ صنعت منقوط

بنے یہ شعر شمع نور افشاں
دھوم ہی دھوم خلد میں آئے
سر محمد علی محمد خاں !!
۱۳۵۰ ھ

مصرعۂ تاریخ کتنا برجستہ اور بے ساختہ ہی!

(۱۵) دوست احباب!

خوش ہو گئے ریاضؔ سے بھی ملنا
کیا باغ و بہار آدمی ہی!

جس طرح درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہی، اسی طرح آدمی اپنے حلقۂ احباب سے پہچانا جاتا ہی۔ ایک آدمی جس طرح کے لوگوں میں اُٹھتا بیٹھتا ہی، اس سے اس کی سیرت، کردار اور شخصیت کا صحیح اندازہ ہوسکتا ہی۔ بعض لوگ اتنے زیادہ ملنسار

ہوتے ہیں کہ ہر آدمی ان کا دوست بن جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کی طبیعت اور مزاج کو اس کے حلقۂ احباب کے ذریعے نہیں پہچانا جا سکتا، بلکہ اسی کی سیرت کو حکم بنانا پڑتا ہے۔

ریاضؔ یوں تو بڑے ملنسار، یارباش اور بااخلاق آدمی تھے، لیکن دوستی قائم کرنے میں محتاط تھے، اور جسے دوست بنا لیتے تھے، اسے پھر نباہتے بھی خوب تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے ان سے بھی پہلے زمانے کے لوگ اپنی دوستی اور وضع داری کو نباہتے تھے۔

ریاضؔ کا حلقۂ احباب نہ بحرِ بے پایاں کی طرح وسیع تھا نہ جوئے کم آب کی طرح تنگ اور محدود، چند لوگ تھے جن سے انھیں اختصاص تھا، اور یہی لوگ ان کے دوست تھے۔

ریاضؔ کو سب سے زیادہ تعلق خاطر مولوی سُبحان اللہ خاں مرحوم سے تھا۔ مولوی صاحب بھی دیوانہ وار ان سے محبت کرتے تھے۔ خلوص و محبّت میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ لیکن :-

تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی!

کا نمونہ تھے۔

ریاضؔ نے کوئی شعر کہا، سُنا، پھڑک اُٹھے اور بہ قولِ خود کئی کئی دِن تک اس کے اثر اور رُوح سے "بے تاب" ہیں۔ ان کی بے تابی کا نقشہ الفاظ میں نہیں کھینچا جا سکتا، اس کا تعلق صرف دیکھنے سے تھا، ریاضؔ بھی ان کے ساتھ

بے تاب ہو رہے ہیں۔ اس "بے تابی" میں وہ برابر کی چوٹ چلتی تھی کہ اس کا نقشہ مانیؔ اور بہزاد کا مؤقلم بھی نہیں کھینچ سکتا۔ ریاضؔ کی کوئی غزل سُنی اور اس کی تشریح میں منہمک ہو گئے۔ ان کا خیال تھا، شاعر جو کچھ کہتا ہے ضروری نہیں ہے کہ وہ یہ بھی سمجھ لے کہ اس نے کہا کیا ہے؟ ایسے موقع پر وہ ریاضؔ کا شعر سُن کر ان سے پوچھتے تھے "کچھ سمجھے؟" ریاضؔ "نہیں سمجھے" کے سوا کیا کہہ سکتے تھے۔ اس کی مولوی صاحب کی طرف سے تائید ہوتی "واقعی نہیں سمجھے ہوں گے"! اب مولوی صاحب اپنی پوری ذہنی و دماغی کاوش سے کام لے کر اس کا مفہوم ریاضؔ کو سمجھا رہے ہیں، وہ ریاضؔ کی شراب کو شرابِ حقیقت سمجھنے سے انکار کرتے تھے، انھیں اس میں وہی رنگ نظر آتا تھا جو بعض اصحاب کی ذہانت حافظؔ کے کلام میں دیکھتی تھی، اور اس مسئلے کو وہ اس وقت اور حُسن سے ثابت کرتے تھے کہ ریاضؔ کو بھی بادلِ ناخواستہ قائل ہو جانا پڑتا تھا۔ ریاضؔ کا ایک شعر ہے:ؔ

نسخہ بیاضِ ساقیِ کوثر سے مل گیا
گھر بیٹھے اب تو بادۂ کوثر بنائیں گے

اس کی انھوں نے ایسی لاجواب مذہبی توجیہہ کی ہے کہ ان کے ذہن کی رسائی کی داد دینا ہی پڑتی ہے۔ ریاضؔ کا ایک اور شعر ہے۔

گُل مرقع ہیں ترے چاک گریبانوں کے
شکل معشوقوں کی انداز ہیں دیوانوں کے

اس شعر کو انھوں نے نعت کا شعر ثابت کر دیا۔ اور ریاضؔ کو بھی قائل ہو جانا پڑا۔

کسی ضروری کام سے ریاضؔ دو ایک روز کے لیے گورکھپور گئے ہیں، مولوی صاحب نے دو چار مہینے روک لیا، نہ مولوی صاحب آنے کی اجازت دیتے ہیں، نہ وہ آتے ہیں:

در پہ بیٹھے ہیں ترے بے زنجیر
ہائے کس طرح کی پابندی ہے!

گھر کا کام بگڑ رہا ہے، طلبی کے خطوط آ رہے ہیں، مگر ریاضؔ اپنی جگہ سے نہیں ہلتے، اس لیے کہ وہ مولوی صاحب کی مرضی کا احترام کرتے تھے۔ قاضی تلمذ حسین صاحب نے صحیح فرمایا:-

"حضرت مرحوم کی زندگی کا بیش تر حصہ گورکھ پور میں گزرا اور گورکھ پور کے تمام ہندو مسلمان شرفا سے ان کے گہرے تعلقات رہے، مگر جو اختصاص مولانا سبحان اللہ کے ساتھ رہا، وہ شاید کسی دوسرے کے ساتھ نہیں رہا!"

جب تک ریاضؔ زندہ رہے، مولوی صاحب کے ساتھ ان کے وہی تعلقات رہے جو یوم آغاز میں تھے۔

لکھنؤ کے ایک رئیس چودھری شفیق الزماں صاحب سے ریاضؔ کے بے حد گہرے عزیزانہ تعلقات تھے۔ ایک زمانہ تھا کہ یہ بہت بڑے زمیں دار تھے۔ بعد میں ان کی جائیداد کا بہت بڑا حصہ برباد ہو گیا، لیکن ریاضؔ کے تعلقات اسی

شدّت اور خلوص کے ساتھ آخر تک قائم رہے۔

چودھری صاحب قدیم وضع وتہذیب کا پیکر ہیں۔ ریاض نے انھی کے بارے میں کہا تھا:۔

ریاض ان حسینوں نے دولت تو لے لی
مُروّت نہ لی کچھ شفیق الزّماں سے !

میرٹھ کے ایک قدیم شریف خاندان کے فرد مولوی انعام اللہ خاں لکھنؤ میں منصرم کمشنری تھے۔ عارف تخلص تھا، ریاض کے شیدائیوں میں تھے۔ ریاض بھی انھیں بہت مانتے تھے۔ جب تک انعام اللہ خاں صاحب پنشن یاب ہوکر اپنے وطن نہ چلے گئے اس وقت تک ریاض لکھنؤ میں جب آتے، انھی کے ہاں ٹھیرتے، لکھنؤ میں بیسیوں ان کے دوست، احباب، عزیز، شناسا تھے۔ سب ریاض کو اپنے ہاں ٹھیرانے کے متمنّی رہتے تھے، اِصرار کرتے تھے، گِلہ شکوہ کرتے تھے، خفا بھی ہوجاتے تھے، لیکن ریاض نے اپنے اس عزیز دوست کے گھر کو اپنا گھر بنا لیا تھا۔ اسے ہمیشہ اپنا ہی سمجھا۔

قاضی سید الیاس حسین صاحب سیتاپور کے ایک علمی اور مذہبی خاندان کے ممتاز فرد ہیں، ریاض سے ان کی قرابت بھی تھی۔ سارا وقت مطالعہ اور بالخصوص تاریخ کے مطالعے میں صرف کرتے ہیں۔ فارسی زبان پر وہ عبور ہے جس کا دعوا کوئی اہلِ زبان ہی کر سکتا ہے۔ شعروشاعری سے بھی دل چسپی ہے۔ بڑے صاف گو اور کھرے آدمی ہیں، امانت و

دیانت تو اُن پر ختم ہی، ریاض انہیں بہت مانتے تھے۔ اتفاق
سے ایک کام کے سلسلے میں انھوں نے خیرآباد کی سکونت
بھی اختیار کرلی، ریاض نے بڑے اصرار سے اپنے ہاں
انھیں ٹھیرایا۔

فرصت کے اوقات وہ قاضی صاحب ہی کے پاس صَرف
کرتے تھے، ان کی سُن رہے ہیں، اپنی سُنا رہے ہیں۔ ان
سے تعلقات کی جو وضع قائم ہوئی، وہ آخر وقت تک رہی۔

وصل بلگرامی صاحب سے شروع میں تعلقات کچھ زیادہ
اچھے نہ تھے، جب وہ لکھنؤ میں آئے اور انھوں نے مُرقّع
نکالا اور ریاض کی اخلاقی امداد کے طالب ہوئے تو انھوں
نے وصل صاحب کی وہ مدد کی کہ کیا اس زمانے میں سگا بھائی
کرے گا۔ مرقّع کے دفتر کو انھوں نے اپنا صدر دفتر بنا لیا۔ اس
کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ اسے مرجعیت اور مرکزیت حاصل
ہوگئی۔ وصل صاحب بھی ریاض کے آرام اور آسایش کا بہت
خیال رکھتے تھے، آخر میں تو اتنے عقیدت مند ہوگئے تھے
کہ انھیں اپنا مُرشد سمجھنے لگے تھے۔

گورکھپور کے موجودہ لوگوں میں قاضی تلمذ حسین صاحب
ایم۔اے سے بڑے گہرے مراسم تھے، بالکل وہی تعلقات جو
ایک بزرگ اور ایک خورد میں ہوتے ہیں۔ قاضی صاحب بھی
اخلاص کا مجسمہ ہیں، انھوں نے اپنی دوستی کو اس طرح نباہا کہ
ریاض کی رحلت کے بعد ان کا طویل اور ضخیم دیوان ہر طرح

کی دُشواریاں سہہ کے بڑی شان و شوکت سے شائع کرا دیا۔

مولوی محمد فاروق صاحب دیوانہ ام۔اس۔سی (علیگ) سابق پروفیسر مسلم یونی ورسٹی سے بھی ان کے تعلّقات حد سے زیادہ بڑھے ہوئے تھے۔ فاروق صاحب کی اِنشا پردازی کے بھی وہ بڑے مدّاح تھے۔ فاروق صاحب عرصے تک مولانا محمد علی کے ساتھ ہمدرد میں کام کر چکے ہیں۔ اب عرصے سے گوشہ نشین ہیں، لیکن اب بھی ہر علم دوست ان کے نامِ نامی سے واقف ہو۔

نیاز فتح پوری صاحب جب بھوپال سے لکھنؤ آئے تو ان سے بھی شناسائی ہوئی، ربط اور اُنس بڑھا اور آخر میں اس نے دوستی کی صورت اختیار کر لی، جو پورے شباب کے ساتھ ہمیشہ قائم رہی۔

سر عزیز الدین مرحوم (دیوانِ ریاست دتیا) اور ان کے چھوٹے بھائی قاضی خلیل الدین صاحب (دیوانِ ریاست پنّا) سے بھی ان کے حد درجہ بے تکلّفانہ مراسم تھے۔ بچپن سے جو تعلّقات قائم ہوئے، وہ بُڑھاپے تک قائم رہے۔

لکھنؤ کے خان بہادر احمد حسین صاحب رضوی مالک کارخانہ احمد حسین دل دار حسین سے تو ان کے تعلّقات اپنائیت کے حدُود سے بھی کہیں آگے بڑھ گئے تھے۔

وطن میں، یعنی خیرآباد میں ان کے بچپن کے دوست حافظ نظام احمد صاحب سے ان کی جو دوستی قائم ہوئی اور جس استحکام کے ساتھ وہ قائم رہی، اس کی نظیر ملنی مشکل ہو۔

نواب بشیر احمد صاحب مرحوم اور ان کے صاحب زادے نواب ظہیر احمد صاحب رئیس و آنریری مجسٹریٹ خیرآباد سے بھی ان کے تعلقات "من و تو" کے حدود سے کہیں آگے نکل چکے تھے۔ اسی طرح حکیم عابد علی صاحب کوثر اور ان کے فرزندِ ارجمند حکیم احمد علی صاحب سے ان کے یک ساں تعلقات تھے۔ یہ تمیز کرنا مشکل تھا کہ وہ باپ کے زیادہ گہرے دوست ہیں یا بیٹے کے! ریاض سے دوستی کے لیے عمر کی قید نہیں تھی اسی لیے ان کے دوستوں کی فہرست میں کہیں کہیں باپ بیٹے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

حکیم انور حسین صاحب حکم سے بعض مراحل پر کچھ تلخی بھی پیدا ہوئی۔ لیکن چوں کہ وہ حسنِ نیت پر مبنی تھی اس لیے رفع بھی بہت جلد ہوگئی اور پھر ان دونوں کے قابلِ رشک تعلقات قائم ہوگئے۔ حکیم صاحب قبلہ انھیں ہمیشہ اپنا بزرگ سمجھتے رہے لیکن ریاض انھیں "دوست" بنا چکے تھے۔ خیرآباد کے ایک اور رئیس عدّو میاں سے بھی ان کے بڑے گہرے تعلقات تھے!

یہ سب اصحاب مختلف اور متضاد طبائع کے بزرگ ہیں لیکن ریاض ان سب کے دوست تھے، یہ سب ریاض کے گہرے دوست تھے۔ ریاض میں سب سے بڑی خصوصیت یہی تھی کہ وہ ہر مذاق اور ہر مزاج کے آدمی سے بشرطے کہ وہ کچھ قدر رکھتا ہو، دوستی پیدا کر لیتے تھے اور اسے برابر نباہتے رہتے

تھے! جس محفل میں وہ چلے گئے جانِ محفل بن گئے، جس دوست سے ملنے گئے اس کی بالیدگیِ رُوح و دماغ کا سامان اپنے ساتھ لیتے گئے۔

اپنے تمام دوستوں کے وہ دُکھ سُکھ کے ساتھی تھے۔ ان کی خوشی کو اپنی خوشی سمجھتے تھے۔ ان کے غم کو اپنا غم خیال کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ دوست بھی ان پر اپنی جان نثار کرتے تھے۔ وہ بوڑھے تھے، کم زور تھے، بلکہ از کار رفتہ ہو چکے تھے۔ با ایں ہمہ کسی دوست کے ہاں خوشی یا غمی کی تقریب ہو، اپنے نظامِ اوقات میں تبدیلی کر کے، اپنے آرام میں خلل ڈال کے ضرور پہنچتے تھے اور اس میں برابر کا حصّہ لیتے تھے!

(۱۶) ریاضؔ گھر کے اندر!

بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ گھر کے باہر ان کی حاضر جوابی، برجستہ گوئی، بذلہ سنجی اور گُل افشانیِ گفتار سے باغ و بہار کا سا منظر قائم رہتا ہے۔ آپ ان سے ملیے تو معلوم ہو گا ان سے بڑھ کر زندہ دل اور خوش طبع آدمی ملنا مشکل ہے۔ ہر غم میں خوشی کا پہلو نکال لیں گے، ہر خوشی کو قہقہہ زار بنا دیں گے۔ لیکن جب گھر میں پہنچیں گے تو یک سر بدل جائیں گے۔ چہرے پر خشونت کے آثار، آنکھوں سے قہر و غضب آشکار۔ جو

سامنے آیا اسے ڈانٹ دیا، کوئی بات خلافِ مرضی ہوئی اور برس پڑے، کسی نے سرگوشی کی اور چہرہ ان کا تمتما اُٹھا، کسی کو احکام کی خلاف ورزی کرتے دیکھا اور رستم و اسفندیار کا نقشِ ثانی بن گئے۔ ایسے لوگ جب تک گھر میں نہیں رہتے ہیں چہل پہل رہتی ہے، لیکن جب وہ اپنے کاشانے میں قدم رنجہ فرماتے ہیں تو ایک عجیب ہیبت ناک سنّاٹا چھا جاتا ہے۔ ان کے گھر میں قدم رکھتے ہی در و دیوار لرزنے لگتے ہیں۔ بچے سہم جاتے ہیں، گھر والے متردّد ہو جاتے ہیں، فضا سے اور ماحول سے خود بہ خود آواز آنے لگتی ہے:-

کس شیر کی آمد ہے کہ "گھر" کانپ رہا ہے
"گھر" ایک طرف چرخ کہن کانپ رہا ہے!

ریاض ان لوگوں میں نہیں تھے۔

وہ جتنے زیادہ زندہ دل اور خوش مزاج گھر سے باہر تھے اس سے کہیں زیادہ پُرتکلف اور سراپا مسرت گھر میں تھے، وہ جب گھر میں بیٹھتے تھے تو ایک خاص قسم کی رونق اور چہل پہل ان کے دم سے قائم رہتی تھی، نہ ڈانٹ نہ ڈپٹ، نہ لڑائی نہ جھگڑا، نہ ہنگامہ نہ شورش، انھیں ان چیزوں سے واسطہ ہی نہیں تھا۔ بیوی سے، بچوں سے، عزیزوں سے، رشتے داروں سے، ملازموں سے سب سے ان کا برتاؤ لطف و محبت کا تھا۔ نہ وہ کسی کو جھڑکتے تھے، نہ کسی پر خفا ہوتے تھے، سراپا بہار بنے ہوتے تھے۔

زندگی کے بالکل آخر دنوں میں غصہ بڑھ گیا تھا، بعض دفعہ تو بات بات پر بگڑ بیٹھتے تھے لیکن ان کا یہ غصہ اور بگڑنا، دہشت خیز اور ہول ناک کسی معنی میں نہ تھا، بلکہ اس میں بھی لطف و مسرت کے پہلو نکل آتے تھے۔ مثلاً کسی نے ان کا قلم غائب کر دیا، یا ان کے کاغذ جنھیں وہ بڑے اہتمام سے چھپا چھپا کے رکھتے تھے، اڑا لیے۔ وہ کوئی رسالہ یا کتاب پڑھتے پڑھتے کسی کام سے گئے اور نشانی کے طور پر اس کے چند صفحے موڑ گئے، واپس آئے تو اس کا پتا نہیں، اس طرح کی باتوں پر ان کا برہم ہونا قدرتی تھا، چناں چہ وہ غصّے اور خفگی کا اظہار بھی بڑی بے باکی سے کرتے تھے۔ عین اسی حالت میں کسی نے دوسرے موضوع پر انھیں متوجہ کر دیا، لیجیے غصہ ختم، ان کے غصّے کی ایک دل چسپ خصوصیت یہ تھی کہ وہ کسی خاص شخص پر نہیں آتا تھا۔ یعنی زید، عمر، بکر کسی کو مخاطب کر کے یا اس کا نام لے کے یا اُسے متّہم کر کے وہ اپنی برہمی کا اظہار نہیں کرتے تھے، ان کا غصہ عام ہوتا تھا، اس لیے خطاب بھی عام ہوتا تھا: "لوگ ایسا کرتے ہیں" "ان لوگوں نے پریشان کر دیا ہے!" "لاؤ قلم، توڑ دوں ہمیشہ کے لیے چھٹّی ہو جاتے" اس اندازِ خاص کا اثر یہ ہوتا تھا کہ ہر شخص — بعض دفعہ اصل مجرم بھی — جواب دہی اور احتساب کے اندیشے سے بے پروا ہو کر ان کے غصّے کو ٹھنڈا کرنے کی اور ان کی گم شدہ چیزوں کے

ڈھونڈنے کی تدبیروں پر عمل کرنے لگتا تھا۔

بچّوں سے تعلّق

چھوٹے بچّوں سے انھیں بڑا اُنس تھا، اپنے بچّوں کو بھی بہت چاہتے تھے اور دُوسروں کے بچّوں سے بھی بڑی شیفتگی کا اظہار کرتے تھے۔ ہمارے گھر میں خاندان کے بڑے لوگ اولاد سے اور بچّوں سے محبت ضرور کرتے ہیں، مگر عام طور پر شیر خوار بچّوں سے مجتنب رہتے ہیں۔ بچّہ جتنا بڑھتا جائے گا، ان کی دل چسپی بھی اس سے بڑھتی جائے گی۔ جتنا چھوٹا اور اسی اعتبار سے "خطرناک" ہوگا اتنے ہی اس سے دُور رہیں گے مثلاً وہ بے وجہ بھی رونے لگے گا، جب چاہے گا، پیشاب کر دے گا۔ کبھی تو اس حد سے اور دو چار قدم بھی آگے بڑھ جاتے گا، دودھ اُگل دے گا۔ یہ سب وہ خطرے ہیں، جن سے عافیت کی صورت یہی ہو کہ الگ رہا جائے پھر جیسے جیسے یہ خطرے کم ہوتے جاتے ہیں میل ملاپ میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہو۔

لیکن ریاضؔ ان باتوں کا کچھ بہت زیادہ خیال نہیں رکھتے تھے، وہ بچّوں کو گود میں لیتے تھے، انھیں لوریاں دیتے تھے، انھیں بہلاتے ہوئے گھر سے احاطے تک چلے جاتے تھے اور کوئی تکلّف یا جھجک نہیں محسوس کرتے تھے۔

ایک دِل چسپ واقعہ!

ریاض کی چھوٹی لڑکی شمع، ان کی اور سارے خاندان کی بڑی چہیتی تھی۔ گھر میں اپنے بڑوں کی زبان سے بار بار یہ سُن چکی تھی کہ اس کے باپ "بڑے آدمی" ہیں۔ اکثر گھر کے لڑکے اور بزرگ سال بھر میں ایک مرتبہ ضرور وطن آتے تھے اور اچھی خاصی رونق رہتی تھی۔ اسی زمانے میں کبھی کبھی ریاض کی شخصیت اور شاعری اور کمال پر بھی گفتگو چھڑ جاتی، شمع کی سمجھ میں ناسمجھی اور کم عمری کی وجہ سے اور باتیں تو آتی نہیں تھیں، بس یہ لفظ اس کے دماغ میں بیٹھ گیا تھا کہ ابا "بڑے آدمی" ہیں۔

کتی دن سے کسی چیز کی وہ ان سے فرمائش کر رہی تھی، وہ وعدے کرتے تھے اور ٹال ٹال جاتے تھے۔ ایک روز وہ اچکن وغیرہ سنبھال کر باہر جانے کی تیاری کرنے لگے۔ وہ آکر ان کے پاس بیٹھ گئی، اس امید میں کہ شاید اپنے وعدے کی تجدید خود ہی کر دیں۔ انھوں نے اچکن پہنی، ٹوپی سر پر رکھی اور جانے لگے، آگے آگے وہ پیچھے پیچھے شمع، جب مردانہ کے دروازے کے قریب پہنچے تو اس نے پھر اپنی فرمایش کو دُہرایا، انھوں نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا گردن ہلا دی، جس سے اقراری اور انکاری دونوں مفہوم نِکل سکتے تھے۔ شمع جل ہی تو گئی، بڑی بے ساختگی سے اس نے فوراً کہا

"بڑے آدمی کیا ہو گئے ہیں اِترانے لگے ہیں، سیدھے مُنھ جواب بھی نہیں دیتے" ایک سانس میں یہ سب باتیں وہ کہہ گئی۔

یہ سُن کر وہ پلٹے، شمع کے اس برجستہ طنز پر سارا گھر گشت زا زعفران بنا ہوا تھا، خود ریاض صاحب کا بھی عجیب حال تھا، اس کے قریب آتے، پیار کیا، دِلاسا دیا اور جس چیز کی وہ فرمایش کر رہی تھی، دوسرا کام چھوڑ کر پہلے اس کی تعمیل کی۔

"بڑے آدمی" اور "اِترانے" والا فقرہ ایک عرصے تک گھر میں، گھر سے محلّے میں، محلّے سے ریاض کے دوستوں کے ہاں گھومتا رہا، ریاض صاحب کا کوئی دوست آتا، شمع دروازے پر ہوتی تو اس سے پہلا سوال یہی کرتا "تمھارے ابّا اب اِتراتے تو نہیں ہیں" وہ بے چاری جھیپ کر گھر میں بھاگ جاتی ایک عرصے تک وہ نہیں سمجھی کہ اس کے اس معصومانہ اور بے ساختہ فقرے کی آخر اس قدر غیر معمولی داد کیوں دی جا رہی ہے اور لوگ اسی کو کیوں اس قدر یاد رکھے ہوئے ہیں۔

بچّوں کے نام!

ہمارے گھر میں نام کے ساتھ "عرف" کا اضافہ کچھ ضروری نہیں ہے۔ خود ریاض صاحب کا اور ان کے بھائی بہن کا کوئی عُرف نہیں تھا۔ اسی طرح ہم لوگوں کا بھی کوئی عُرف نہیں رکھا گیا، لیکن اپنے بچّوں کے عرف ریاض صاحب

نے رکھے تھے، ہر ہر عرف سے ان کی جدّت پسندی اور ندرتِ خیال کا اظہار ہوتا ہی۔

نواسیوں اور لڑکیوں کے عُرف تھے: قمر قمر، انجمن، شمع، ضیا، کہکشاں۔ لڑکوں کے عُرف تھے: انجم، نجم، ضو، قمر۔ ہر عُرف میں "رعایتِ لفظی" پوُرے طور پر موجود تھی۔ ہر عرف ایک دوُسرے سے مربوط تھا۔ پہلا عُرف انھوں نے ایک مفہوم کو پیشِ نظر رکھ کر مقرر کیا۔ اب جتنے عرف ہوں گے، سب میں پہلے عُرف کی رعایت ضرور ملحوظ رہے گی۔

اسی طرح جو نام انھوں نے اپنے بچّوں کے تجویز کیے تھے، وہ بھی اس مناسبت اور التزام سے خالی نہیں تھے۔ نشاط، انبساط، مسرّت، مسرور، ریاضؔ سے مرتاض، امتیاز!

(۱۷) دین داری اور مذہبیّت

وہی ریاضؔ جو تھے بُت پرست و بادہ پرست
خُدا کی یاد میں بیٹھے ہیں سر جُھکاتے ہوتے!

ریاضؔ کا خاندان مذہبی خاندان تھا۔ ان کے جدِامجد ایک بڑے خُدا رسیدہ بُزرگ تھے۔ والد بھی بڑے مذہبی شخص تھے۔ وہ اگرچہ پولیس میں مُلازم تھے، لیکن اس ملازمت میں انھوں نے اپنا دامن نجاست سے پاک رکھّا۔ مذہب پر ان کا عقیدہ ہی مستحکم نہیں تھا بلکہ عمل بھی

نہایت سختی سے تھا۔

ایسے خاندان اور اس ماحول میں ریاضؔ نے آنکھیں کھولیں، مذہب کا اثر ان پر ہمیشہ غالب رہا۔ جوانی کے زمانے میں ارکان و احکامِ مذہب پر انھوں نے سختی سے عمل نہیں کیا۔ اگرچہ عہدِ شباب میں بھی حدودِ شرعی سے آگے نہیں بڑھے۔ لیکن جیسے جیسے ان میں پختگی آتی گئی، وہ پکّے مذہبی بنتے گئے۔ اور ارکان واحکام پر بھی پوری سختی سے عمل کرنے لگے۔

اعتدال و توسط!

مذہب کے معاملے میں اعتدال وتوسط کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ اگر انسان ملّائے مسجد بن کر رہ جائے تو نہ مذہب کے لیے وہ باعثِ فخر ہوسکتا ہے نہ اپنی شخصیت کو کامل بنا سکتا ہے۔ اسی طرح اگر وہ اتنا زیادہ آزاد رَو ہو جائے کہ مذہب، اس کی تعلیم اور اس کے احکام کو سرِ پائے حقارت سے ٹھکرا دے تو بھی اس کی زندگی ناکام ہے۔

ریاضؔ کی سب سے بڑی خصوصیت یہی تھی کہ انھوں نے مذہب کی رُوح کو سمجھ لیا تھا اس لیے سخت ترین مذہبی رنگ میں رنگ جانے کے بعد بھی وہ اعتدال وتوسّط کی حد سے باہر نہیں نکلے، مذہبی ہونے کے باوجود نہ وہ اتنے خوش عقیدہ

تھے کہ "بڑے پیر صاحب" کی نیاز کو جزوِ مذہب سمجھتے، نہ اتنے آزاد خیال تھے کہ نماز روزے کو بھی دور روا پابندیوں سے تعبیر کرتے۔ انھوں نے اپنے مذہب سے ان تمام اجزا کو نکال دیا تھا جو مذہب میں داخل کر لیے گئے ہیں لیکن جن کا مذہب سے کوئی تعلق یا واسطہ نہیں ہے اور ان تمام چیزوں کو شامل کر لیا تھا جو مذہب کے دائرے میں داخل ہیں لیکن غلط مذہبیت کے غیر معمولی غلو نے ان کی اہمیت اور قدر کم کر دی ہے۔

تعزیہ اور مجلس!

میں کسی جگہ کہہ چکا ہوں کہ ہمارا خاندان آج سے دو نسل پہلے تک شیعوں اور سنیوں کا مجموعہ تھا۔ سُنی سُنی رہتا تھا اور شیعہ شیعہ لیکن آپس کی رشتے داری اور قرابت کا سلسلہ بھی برابر جاری رہتا تھا۔ ریاض کے والد کٹر سُنی تھے اور ان کی والدہ کٹر شیعہ تھیں، دونوں اپنے مذہب پر سختی سے عمل کرتے تھے، لیکن ایک دوسرے
بھی تھے۔

اس اختلاط کا نتیجہ یہ تھا کہ انفرادی طور پر اپنے مذہب کی پابندی کے باوجود کچھ باتیں شیعوں کی سنیوں نے لے لی تھیں، کچھ باتیں سنیوں کی شیعوں نے لے لی تھیں۔

ریاض کے گھر میں ایک امام باڑہ بھی تھا، محرم میں تعزیہ بھی رکھا جاتا تھا اور شاندار مجالسِ عزا بھی منعقد ہوتی تھیں۔

جن میں شیعہ اور سُنّی دونوں شریک ہوتے تھے۔
جب تک ریاضؔ کے والدین زندہ رہے، ان مراسم پر پوری شدت سے عمل ہوتا رہا۔ اسی طرح "بڑے پیر صاحب" کی گیارھویں بھی خاصے اہتمام سے ہوتی تھی، لیکن جب ریاضؔ گھر کے "بڑے" بنے اور اپنے والد کے قائم مقام ہوئے تو انھوں نے ان مراسم کو خاندان کی خواتین اور بعض عزیزوں کی مخالفت کے باوجود یہ یک قلم بند کر دیا اور ہرگز ان کے اجرا پر نہیں راضی ہوئے۔ اب نہ مجلسیں ہوتی تھیں، نہ تعزیہ اُٹھایا جاتا تھا، نہ بڑے پیر صاحب کی گیارھویں منائی جاتی تھی۔
اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ریاضؔ ان بزرگوں کی عظمت کے مُنکر تھے، یا ان کا دل اکابرِ اسلام کی عقیدت سے خالی تھا، ہرگز نہیں، وہ حضرت امام حسینؓ سے اتنی ہی محبّت رکھتے تھے جتنی ایک راسخ العقیدہ مسلمان رکھ سکتا ہے۔ محرّم کے زمانے میں وہ حضرات حسنینؓ اور اہلِ بیتِ اطہار کی دُوسری مبارک ہستیوں کے فضائل و مناقب خود بیان کرتے تھے، دُوسروں سے سُنتے تھے لیکن وہ اسے پسند نہیں کرتے تھے کہ تعزیہ رکھا جائے، مجلس برپا کی جائے۔ اس لیے کہ اس طرح کوئی صحیح مذہبی رُوح نہیں پیدا ہوتی۔ انھیں حضرت غوث اعظم جیلانیؒ سے بھی بڑی عقیدت تھی، لیکن اس عقیدت کا اظہار وہ "گیارھویں شریف" کر کے اور نیاز دلوا کے نہیں کیا کرتے تھے۔ ان کی مذہبیت مراسم سے بیگانہ تھی، حقائق کی جویا تھی،

وہ مذہب کے نام پر کوئی ایسی حرکت نہیں کرتے تھے جس کا مذہب سے تعلق نہ ہو۔

بیعت!

ریاؔض کے زمانے میں حضرت حاجی وارث علی شاہ کا بڑا شہرہ تھا، وہ تھے بھی عجیب بزرگ، ان کی کشش کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے انگریزی تعلیم یافتہ، تفریح مآب، مغرب زدہ، اربابِ ثروت صاحبانِ جاہ و جلال ان کے آگے دست بستہ حاضر رہتے تھے۔ کبھی جوتا نہیں پہنا، کبھی تخت، کرسی یا چارپائی استعمال نہیں کی۔ عمر بھر مجرّد رہے۔ خود بہت بڑے زمیں دار تھے۔ اپنی جایداد پر اپنا حق نہیں جتایا، نہ حصّہ لیا۔ شخصیت کا یہ عالم تھا کہ جسٹس شرف الدین جیسے لوگ مثل چاکرانِ کم ترین ہمہ وقت دست بستہ موجود رہتے تھے۔ حاجی صاحب کے فرقِ عادت اور کرامت کے واقعات مشہور ہیں۔ ان سے قطع نظر کر کے بھی اگر دیکھا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ حاجی صاحب کی شخصیت بہت بلند پایہ شخصیت تھی۔ ریاؔض کا دل بھی ادھر کھنچا اور وہ حاجی صاحب سے بیعت ہو گئے۔

ریاؔض کو حاجی صاحب سے بڑی عقیدت تھی، فرماتے ہیں:-

نگاہِ فیض سے تیری عجب نہیں وارث
ریاؔض سا سگِ دنیا بھی آدمی ہو جائے!

حاجی صاحب کی مدح میں انھوں نے کئی نظمیں بھی کہی ہیں

جن سے ان کے وفورِ عقیدت و محبّت کا اظہار ہوتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

آنکھیں کھُل جائیں جو ظاہر ہو مقامِ وارث
کان ہو جائیں جو سُن لے کوئی نامِ وارث

وہ بھی اس طرح انھیں یاد نشیمن نہ چمن
طائرِ دل ہیں ہزاروں تہِ دامِ وارث

ہو قیامت نہ کہیں پائے نظر سے پامال
میری آنکھوں میں ہے اندازِ خرامِ وارث

بوئے گُل جا بھی یہاں کام نہیں ہے تیرا
کہ بسا اور ہی بو سے ہے مشامِ وارث

شُروع میں تو ریاضؔ کی عقیدت حدِّ اعتدال سے متجاوز تھی لیکن بہت جلد ان کی عقیدت شرعی حدُود کے اندر قائم ہو گئی۔

حاجی صاحب بہرحال ایک بُزرگ تھے، نبیؑ یا پیغمبر نہیں تھے۔ ایک مسلمان کا فرض ہے کہ وہ ان احکام کی تعمیل کرے جو شرع سے نہ ٹکراتے ہوں، اگر کوئی ایسا حکم ہو تو اسے نظرانداز کر دے، ان سے اتنی ہی عقیدت رکھے جتنی خُدا اور رسول کے بعد کی جاسکتی ہے۔ اس سے زیادہ محبت کا اظہار گمراہی بھی ہے اور خطاکاری بھی، بدقسمتی سے اکثر صوفیا کے معتقد اور حلقہ بگوش اپنے مُرشدوں اور پیروں کو:

بعد از خدا بزرگ توئی قِصّہ مختصر

کا نمونہ بنا لیتے ہیں۔ یہ مبالغہ نہیں، واقعہ ہی حاجی صاحب کے متعدد عقیدت کیش انھیں "خدا" سمجھتے ہیں اور ان کی تصویر کو پوجتے ہیں، غرض بہت سی گمراہیاں ہیں جو عقیدت اور عشقِ مرشد کے نام پر ہو رہی ہیں۔ کوئی وارثی اگر گر پڑے تو اس کی زبان سے "یا وارث" نکلے گا۔ مرتے وقت بھی یہی کلمہ پڑھتا ہوا اس دنیا سے رخصت ہو گا۔ میں نے ایک صاحب کو دیکھا کہ ایک حادثے سے وہ نیم جاں ہو گئے۔ ہم سب لوگ ان کی زندگی سے مایوس ہو گئے۔ سخت چوٹ آئی تھی، ہوش و حواس معطل ہو چکے تھے، لیکن ان کے لب چل رہے تھے اور "یا وارث" کی تلاوت کر رہے تھے۔

ریاض ان معتقدین میں نہیں تھے۔ وہ اپنے مرشد کو ایک انسان سمجھتے تھے، ایک قابلِ تقلید انسان، بس اس سے زیادہ کچھ نہیں، نہ وہ اپنے مرشد کو مثیلِ پیمبر سمجھتے تھے نہ ہم شکل خدا۔ خدا کا بندہ اور پیغمبر کا امتی سمجھتے تھے۔ "یا وارث" کا نعرہ بھی نہیں لگاتے تھے۔ ان سب باتوں کو وہ شرع کے خلاف سمجھتے تھے اور ان سے مجتنب رہتے تھے۔

حاجی صاحب کی ذاتِ گرامی سے متعلق جو خلافِ قیاس اور خلافِ فطرت اور ساتھ ہی غیر مستند "کرامتیں" مشہور ہیں، انھیں بھی ریاض نہیں مانتے تھے۔ غرض ان کی اسلامیت اور مذہبیت ہر عقیدے اور مسلک پر حالی میں غالب رہتی تھی۔

صوم وصلاۃ!

میں نے ہوش کی آنکھیں کھولیں تو ریاض۔ بوڑھے ہو چکے تھے۔ میں کم از کم اپنی زندگی بھر کی شہادت دے سکتا ہوں کہ وہ صوم وصلاۃ کے نہایت پابند تھے۔ شاید ہی ان کی نماز کبھی قضا ہوتی ہو۔ نماز وہ جلدی جلدی نہیں پڑھتے تھے، ٹھیر ٹھیر کر، بڑے خضوع وخشوع سے، دُعا بھی دیر تک مانگتے رہتے تھے۔ رات کو انھیں نیند کم آتی تھی اس لیے موقع ملتا تھا تو تہجد بھی پڑھ لیتے تھے۔ فجر کی نماز ہمیشہ وقت پر ادا کرتے تھے۔

بوڑھے تھے، ضعیف تھے، کمزور تھے، لیکن کیا مجال کہ ایک روزہ بھی قضا ہو جاتے۔ اس پیرانہ سالی میں رمضان گرمی میں آیا۔ مئی جون کی گرمی! لیکن وہ پورے استقلال اور عزیمت کے ساتھ روزہ رکھتے تھے۔ تراویح میں شرکت کرتے تھے، ہر روز کئی کئی پارے قرآن شریف کے پڑھ ڈالتے تھے۔ اس معمول میں انھوں نے کبھی فرق نہیں آنے دیا۔ ذوقِ تلاوت کا یہ عالم تھا کہ بعض دفعہ ایک ایک دن میں انھوں نے دس دس پاروں کی تلاوت کرلی، سال کے باقی دنوں میں نماز تو وہ پابندی سے پڑھتے تھے لیکن تلاوتِ کلام مجید کا زیادہ التزام نہیں تھا مگر رمضان کا مہینہ آیا اور انھوں نے رحل رکھی اور جزدان کھولا، اب وہ ہیں اور گھنٹوں اور پہروں

تلاوت!

انھی گرمی کے رمضانوں میں ایک بار اشعارِ ذیل انھوں نے کہے تھے اور مزے لے لے کر سناتے تھے:۔

روزہ رکھ کر بلا کے دن کاٹے ہیں
مَے سے دامن بچا کے دن کاٹے ہیں
مے خانے میں ہم تشنہ لبوں نے ساقی
سینے سے سبو لگا کے دن کاٹے ہیں

یہ وقت وہ ہی کہ خُم سبو پر پی لیں
پا جائیں تو جھک کے حوضِ کوثر پی لیں
خُم کی ترے خیر! کہ دے ای پیرِ مغاں
روزہ رکھا ہی، سانس بھر کر پی لیں!

صوم میں لوٹتے ہیں روز تلاوت کے مزے
بڑھ کے نعمت سے ہیں اللہ کی رحمت کے مزے
وقتِ افطار پہنچ جاتے ہیں مسجد میں ریاضؔ
گھر میں اللہ کے آجاتے ہیں دعوت کے مزے

رندِ ناکام کو کچھ نشہ سا ہو جاتا ہی
ہاں یونہی نام کو کچھ نشہ سا ہو جاتا ہی

صدقے اِس لذّتِ افطار، پسِ توبہ بھی
بے پیے شام کو کچھ نشہ سا ہو جاتا ہے

(۱۸) آپ بیتی

سُنائی کچھ کہیں سے کچھ کہیں سے!

سُن کر مرا فسانہ انھیں لُطف آ گیا
سُنتا ہوں اب تو روز طلب قصہ خواں کی ہے!

ریاضؔ اپنی زندگی کے واقعات بڑے بڑے مزے لے لے کر سُنایا کرتے تھے، وہ بلبلِ ہزار داستاں کی طرح چہکتے تھے اور سُننے والے دم بہ خود سُنا کرتے تھے۔ ایک تو ان کا طرزِ بیان، دُوسرے واقعات کی جاذبیت، ایک سماں بندھ جاتا تھا، جس نے ان کی زبان سے دو چار واقعات سُن لیے، اس کی تمنّا یہی رہتی تھی کہ وہ کہے جائیں، کہتے جائیں، رات ختم ہو جاتے تو مضائقہ نہیں، دن گزر جاتے تو پروا نہیں، ان کی داستان ختم نہ ہو۔ ایک کہانی ختم ہوئی کہ دوسری کی فرمایش شروع ہو گئی۔ خود انھیں بھی اپنے دل چسپ واقعاتِ زندگی بیان کرنے میں لُطف آتا تھا۔ اگر وہ مگن ہوں اور فرمایش کر دیجیے تو بالکل نہیں ٹالتے تھے، فوراً شروع کر دیتے تھے۔ اگر طبیعت کچھ مضمحل اور افسردہ

ہو تو ان کا "عذرِ لنگ" کامیاب رہتا تھا!

نیاز صاحب نے اصرار کیا کہ 'نگار' میں اپنے زندگی کے حالات لکھیں۔ انھوں نے اس فرمایش کی تعمیل کی، لیکن یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک نہیں چلا پھر بھی 'نگار' کے کئی نمبروں میں "ریاض اپنے آئینے میں!" شائع ہوتا رہا۔

جو کچھ شائع ہوا، وہ بہت کم تھا، پھر بھی بہت تھا، یہ ممکن نہیں کہ وہ سب کا سب درج کر دیا جائے۔ اس ناتمام آپ بیتی کے کچھ حصّے اختصار اور ایجاز کے ساتھ درج کیے جاتے ہیں۔ اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہو کہ ریاضؔ کے طرزِ تحریر کا بھی اندازہ ہو جائے گا۔ ملاحظہ ہو:-

افسانۂ ریش!

"لکھنؤ میں کسی تقریبِ سرکاری کے ذریعے سے کچھ والیانِ ملک بھی آئے تھے۔ داروغہ عبّاس علی مرحوم انجنیر کے دولت خانے پر، جس کا اب نشان تک نہیں ہے، چند مقتدر نوّابین و روٴسائے شہر تشریف فرما تھے۔ منشی نول کشور آں جہانی (مالک وبانی نول کشور پریس لکھنؤ) بھی موجود تھے اور میں بھی! کہ ایک رئیس بااختیار مع مختصر اسٹاف کے مُرغِ زرّیں بنے ہوئے آتے نظر آئے۔ اطلاع کے ساتھ ہی سب حضرات تعظیماً استقبال کے لیے بہ عجلت بڑھے۔ دیکھا کہ ریش دونوں جانب پائے پر چڑھی ہوئی، شکل مشیتن، چہرہ غضب ناک، نہ سلام میں

خود سبقت کی، نہ سلام کا جواب دیا۔ زبان پر لکھنؤ کا نام اور صدہا صلواتیں، لعنت اور پھٹکار کی بار بار تکرار، اس طرح مقامِ نشست تک تشریف لائے اور باوصف تلخ گوئی اعزاز کے ساتھ بٹھائے گئے، مگر گفتار اور کردار اور لہجے میں فرق نہ آیا، مزاج پُرسی کی جُرأت کون کر سکتا تھا؟ وہ البتہ سخن ہائے درشت سے مزاج پُرسی فرمائے جاتے تھے۔

کچھ دیر بعد جب زبان تالو سے لگی تو ایک سن رسیدہ، گرم و سرد دیدہ نواب صاحب نے بہ ادب عرض کیا لکھنؤ سے برافروختگی کا سبب معلوم ہو تو ہم بھی ہم نوا ہونے کی جُرأت کریں۔ فرمایا یہ کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ اسلامی شہر مگر جسے دیکھیے داڑھی صاف، مسلمان اور غیر مسلمان میں امتیاز نہیں، نہ مصافحے اور معانقے کا موقع، نہ سلام علیک کا، ساتھ ہی پھر لعنت کی تکرار، سلسلہ ٹوٹنے پر مسن نواب صاحب نے عرض کیا برافروختگی کا سبب تو معلوم ہو گیا مگر حضور نے خود سبب نہ دریافت فرمایا۔ بہ ادب عرض کرتا ہوں، سنیے:

غدر سے پہلے میں بھی اور سب مسلمانانِ لکھنؤ بھی ریش کے رکھ رکھاؤ میں آپ ہی کے مقلد تھے۔ ایک روز میں خط بنوا رہا تھا، آئینے پر نظر تھی، اطلاع پر اطلاع مسجدوں، امام باڑوں کے منہدم کیے جانے اور بے احتیاطی برتنے کی آرہی تھی۔ دفعتاً یہ اطلاع ملی کہ نواب آصف الدولہ کا مشہور امام باڑہ اور اس کی وسیع و حسین مسجد گھوڑوں

کا اصطبل بنا دی گئی، نہ روک تھام کی طاقت تھی، نہ انتقام کی۔ میں نے مشتعل ہوکر خاص نزاش سے کہا کہ ریش رکھ کر مسلمان صورت رہوں اور یہ خبریں سُنوں، تو اسے صاف کردے، اس کے بعد ہی رئیس صاحب کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا "لعنت ہے اس ڈاڑھی پر، پھٹکار ہے اس ڈاڑھی پر!"

جواب میں خاموشی تھی اور سناٹا! وہ سین اس وقت تک خیال کے ساتھ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ مُحسن نوّاب صاحب کے وقتی جواب سے بہتر جواب ایسے کج خُلق رئیس کے لیے کیا ہوسکتا تھا!

اعتراف!

"غازی پور میں شاہ احمداللہ مرحوم سب جج اور شاہ امجداللہ مرحوم منصف کے دولت خانے پر چند معزّز حضرات بی۔اے، ایم۔اے پاس تشریف فرما تھے۔ ایشیائی شاعری کے متعلق کسی قدر بُرے پہلو کو لیے ہوتے اظہارِ خیال ہو رہا تھا۔

میں نے عرض کیا میر انیس مرحوم و مغفور کے نیچرل مناظر کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ میں امیر مینائی کا ایک شعر سُنانا چاہتا ہوں شاید وہ اس صحبت میں درجۂ قبولیت حاصل کرے اور آپ حضرات اس سے بہتر یا اس کے برابر کسی انگریزی شعر کے ترجمے سے مجھے ممنون فرمائیں۔

اجازت ملنے پر مَیں نے یہ شعر سُنایا:-

لچک ہو شاخوں میں، جُنبش ہوا سے پھُولوں میں
بہار جھُول رہی ہو خوشی کے جھُولوں میں!

مَیں نہیں کہہ سکتا، سُننے والوں پر کب تک وجد کی کیفیت طاری رہی، کبھی کبھی شعرا کے قلم سے ایسے شعر نکل جاتے ہیں جو مغربی مذاق سے خراجِ تحسین حاصل کرتے ہیں۔

تقریباً تیس سال سے زیادہ زمانہ ہوا کہ میرا ایک شعر کسی ولایت کے اخبار میں کسی خاص وجہ سے درج ہو گیا جسے 'پانیر' نے بھی اور 'سول اینڈ ملٹری گزٹ' نے بھی لیا۔ یہ اتفاق ہے کہ 'سول اینڈ ملٹری گزٹ' (لاہور) کا وہ انگریزی ترجمہ خان بہادر سیّد ناصر علی صاحب حال پنشنر انسپکٹر نمک، مالک 'صلائے عام' دہلی کی نظر سے گزرا، ممدوح نے وہ شعر اور اس کا نوٹ تراش کر مجھے بھیج دیا اور اس کے ساتھ جو الفاظ مجھے لکھے مَیں انھیں مایۂ ناز سمجھا، متعدد خطوط بھی انگریزی داں حضرات کے میرے پاس آئے اور خاص الفاظ سے میری عزّت افزائی کی گئی۔

برسبیلِ تذکرہ وہ شعر ذیل میں درج کیے دیتا ہوں، ممکن ہے آپ کو بھی پسند آئے اور پسند فرمانے میں میرے لیے اخلاقی رعایت سے کام نہ لیا جائے:-

عالمِ ہُو میں کچھ آواز سی آجاتی ہے
چُپکے چُپکے کوئی کہتا ہے فسانہ دِل کا!"

دربارِ قیصری!

"جس زمانے میں ریاض الاخبار ہفتے وار اور "گل کدۂ ریاض" ماہ وار خیرآباد سے شائع ہوتا تھا اور جس کے مطبع کا تاریخی نام "لمعۂ رخشاں" تھا، اعلاحضرت نواب کلب علی خاں بہادر خلد آشیاں نے مجھے میرے اُستاد حضرت امیر مینائی مرحوم و مغفور کے ذریعے سے یاد فرمایا۔ میں اس وقت دربارِ قیصری (۱۸۷۷ء) میں شرکت کے لیے دہلی جانے کو شدت سے بے تاب تھا۔ اس پہلے دربارِ قیصری میں تمام اخبارنویس ہر صوبے سے مدعو کیے گئے تھے، ان کا کمپ خاص تھا، خیمے بہ کمال تزئین و تکلف نصب تھے، دو ایڈیٹروں کے لیے ایک خیمہ، ضروری فرنیچر و اسباب آرام کے ساتھ مخصوص تھا۔ کھانے اور ناشتے کے لیے خاص سرکاری اہتمام تھا۔ پُر تکلف چائے ہر وقت تیار رہتی تھی، چمن بندیاں اعلا پیمانے پر تا حدِ نظر ہر طرف تھیں۔ میں بھی، منشی نظام احمد مرحوم مالک ریاض الاخبار بھی دہلی گئے۔ کمپ کے سوا مولانا ابوالمنصور مرحوم امام فنِ مناظرہ کے دولت خانے پر بھی مہمان بننا پڑا، شب گزاری کا اتفاق وہیں ہوتا، کمپ میں "پنجابی اخبار" لاہور کا خیمہ ہماری شرکت میں تھا۔ مولانا مرحوم کے بڑے صاحب زادے خان بہادر سید ناصر علی صاحب غالباً موجود نہ تھے، بعد کو آ گئے، آپ کے چھوٹے بھائی سید نصرت علی صاحب مالک نصرت الاخبار دہلی کا زیادہ ساتھ رہتا۔ مولانائے مرحوم

کی طرف سے مہمان نوازی کا بار انھی پر تھا!

دن تو والیانِ ملک کے عالی شان، پُر فضا فردوسی کیمپوں میں گزرتا جو دہلی کے باہر کوسوں تک پھیلے ہوتے تھے۔ ہر کیمپ میں لہلہاتے ہوتے چمن زار، سجے ہوتے بازار، ان کی وضع وقطع، ان کی آراستگی، یہ بھولا ہوا خواب کہاں تک بیان کرسکتا ہوں؟ تمام اڈیٹرانِ اخبار میری ہی طرح کیمپوں کی گل گشت میں رہ کر بہ قدرِ مراتب نفع اندوز ہوتے۔

اسی گل گشت میں ظہیر وانور مرحوم سے بھی شرفِ نیاز حاصل ہوا۔ میری باریابی نواب مردان علی خاں صاحب بہادر خیرپور (سندھ) کے حضور میں بہ امتیازِ خاص ہوتی تھی۔ مگر ملے صرف دوسو رُپے، نواب صاحب اور تمام درباری فارسی زبان کا استعمال کرتے تھے۔ خان قلات کے کیمپ میں بھی دو ایک اخبار نویس پہنچے۔ میر قلات نے جب دریافت کیا کہ کون لوگ ہیں؟ تو کہنے والے نے کہا "گھروالا" میر صاحب ان کو گورکن سمجھے تنغّص پیدا ہوا اور وہ کیمپ باہر کردیے گئے۔

مجھے مہاراجا کشمیر کے کیمپ میں جانے کا اتفاق ا س بنا پر ہوا تھا کہ مہاراجا اس سے پیش تر جب رونق افروزِ لکھنؤ تھے تو سیٹھ سیتارام صاحب تعلقہ دار بسواں، جن کے روابط مہاراجا سے تھے، مجھے بھی اپنے ہم راہ لے گئے تھے۔ مگر اس وقت مہاراجا بہ عزمِ واپسی سوار ہو رہے تھے۔ سرسری شرفِ تعارف حاصل ہوسکا، دربارِ دہلی کی تقریب میں سیٹھ صاحب

موصوف بھی تشریف فرماتے دہلی تھے۔ مجھے بھی مہاراجا کے کیمپ میں ہم راہ لے گئے۔

درباری کیمپ کے قریب پہنچ کر ہم نے ایک دیکھا کہ شمس العلما مولانا عبدالحق صاحب علامۂ خیرآبادی کسی قدر منغض آ رہے ہیں، کشمیر کے ایک اعلا افسر بھی لجاجت کناں ساتھ ہیں۔ مولانا اسی تنغض کے ساتھ فنس پر سوار ہو گئے، ہم لوگ ایڈی کانگ کے خیمے میں چلے آئے۔ ہر طرف خاموشی تھی، سیٹھ صاحب نے استفسار فرمایا کیا واقعہ ہی؟

جواب ملا، اس وقت مہاراجا سے ملاقات نہیں ہو سکتی واقعہ یہ پیش آگیا ہو کہ شمس العلما کے تشریف لانے کے واسطے یہ وقت مقرر کیا گیا تھا، وہ تشریف لائے، مہاراجا نے براہِ تعظیم گوشۂ مسند پر جگہ دی، مزاج پُرسی فرمائی، ساتھ ہی حکم دیا کہ ولی عہد کے اتالیق مولانا صاحب کو بھی تکلیف دو، وہ بھی تشریف لائے۔ مہاراجا نے انھیں بھی براہِ تعظیم شمس العلما کے مقابل گوشۂ مسند پر جگہ دی۔ ممکن ہی شمس العلما کی نازک مزاجی نے اسے پسند نہ کیا ہو، مہاراجا نے فرمایا مجھے مدت سے آرزو تھی کہ ایسے بلند پایہ علما کا کسی مسئلے پر مناظرہ دیکھوں۔ یہ سنتے ہی شمس العلما نے برافروختگی کے ساتھ کہا "مہاراجا! آپ نے مُرغ اور بٹیر کی پالیاں دیکھی ہوں گی علما کی یہ شان نہیں ہی!" ساتھ ہی اُٹھ کھڑے ہوئے، مہاراجا کو عرق آگیا۔ شمس العلما کے روانہ ہوتے ہی مہاراجا نے افسرِ اعلا کو بہ ندامت کچھ ایسا فرمایا، وہ شمس العلما

کے ہم راہ لجاجت کناں فنس تک آئے، شمس العلما نے جواب کچھ نہیں دیا، سوار ہو گئے۔ ہم لوگ بھی بغیر ملاقات واپس آئے۔ مہاراجا پر اس ناگوار واقعے کا زیادہ اثر تھا۔

مَیں شمس العلما کی خدمت میں ان کی فرودگاہ پر برابر جایا کرتا تھا۔ مجھے معلوم ہؤا دوسرے روز مہاراجا نے افسرِ اعلا کے ذریعے سے گیارہ پارچے کا خلعت اور نقد دو ہزار رُپے معذرت کے ساتھ شمس العلما کی خدمت میں بھیجے۔ انھوں نے کہا آپ میری طرف سے معذرت اور اظہارِ افسوس اس وقتی اتفاق پر کیجیے گا۔ مجھے افسوس ہے کہ مہاراجا نے براہ قدردانی خلعت و نقد سے عزّت افزائی کی مگر مَیں اس کے قبول کرنے سے معذور ہوں، کیوں کہ مَیں رئیس رام پور کا ملازم ہوں، اس کی اجازت و منظوری کی ضرورت ہے۔ افسرِ اعلا مع خلعت وزر نقد واپس گئے۔

یہ پرچہ نوّاب مشتاق علی خاں بہادر ولی عہد رام پور کو اپنے کیمپ میں گزرا، خلد آشیاں بیماری کی وجہ سے دہلی آنے اور دربار قیصری میں شرکت سے معذور تھے۔ پرچہ گزرنے پر خلد آشیاں کو اس واقعے کی اطّلاع تار پر دی گئی، تار ہی پر جواب آیا، ہماری طرف سے گیارہ پارچے کا خلعت اور نقد دو ہزار دو!

شمس العلما جو کسی بات پر مدار المہام رام پور سے برہم ہو کر دہلی اس غرض سے آئے تھے کہ واپس نہ جائیں اور

کسی ریاست میں ملازمت کرلیں اس قدر افزائی پر دربارِ قیصری کے بعد رام پور چلے آئے اور پھر خلد آشیاں سے کبھی جُدا نہ ہوئے۔[1]

---

[1] اس موقع پر نامناسب نہ ہوگا اگر کچھ تعارف مولانا کا کر دیا جائے۔

خیرآباد میں ایک بزرگ مولانا فضل امام صاحب تھے جو منطق و فلسفے کے مُسلّم و مستند امام تھے۔ مدارسِ عربیہ کے درسِ نظامی میں ان کی متعدد کتابیں سبقاً سبقاً اور درساً درساً پڑھائی جاتی ہیں فضل امام صاحب کے صاحب زادے مولانا فضل حق صاحب تھے۔ یہ:

اگر پدر نتواند پسر تمام کُند

کے مصداق تھے۔ اپنے وقت کے بوعلی سینا اور فارابی تھے۔ علم وفضل میں ان کا پایہ بڑا بلند تھا۔ یہ بہادر شاہ کے عہد میں دہلی میں تھے اور ایک بلند پایہ منصب (غالباً میر منشی) پر فائز تھے۔ غالبؔ سے ان کے بڑے گہرے مراسم تھے۔ غالبؔ کے متعلق ان کا یہ قول مشہور ہے کہ "یہ شخص اتنا گہرا ہے کہ اس کے مبلغ علم کا پتا نہیں چلتا" غالبؔ کا جو دیوان اس وقت شائع و ذائع ہے، اس کا یہ اختصار مولانا فضل حق کی ہدایت اور نگاہِ نقد کا نتیجہ ہے۔

غدر میں انھوں نے انگریزوں کا ساتھ نہیں دیا، گرفتار ہوتے، انگریزی عدالت میں مقدمہ چلا۔ مشہور ہے انگریز جج ان کے علم و فضل سے اس درجہ متاثر تھا کہ اس نے کہا۔ جو الزامات آپ پر عائد کیے گئے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۵ پر)

اوّل سر سالار جنگ بہادر بھی نابالغ فرماں روائے دکن اعلاحضرت میر محبوب علی خاں کی معیّت میں رونق افروز اپنے شاہی کمپ میں تھے، وہیں ہم لوگوں کو ایڈیٹر صاحب " جریدۂ روزگار" مدراس اور حیدرآبادی عفو صاحب وغیرہ سے بار بار ملنے کا اتفاق ہوا،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۲)

ہیں اگر آپ ان سے انکار کر دیں تو میں تمام شہادتوں کو جو آپ کے خلاف پیش ہوتی ہیں مسترد کر دوں گا۔ انھوں نے جواب دیا" یہی توشۂ آخرت ہی اس سے کیوں کر دست بردار ہو جاؤں۔ الزامات صحیح ہیں، میں مجرم ہوں۔"

بہ ہر حال مقدمہ چلا۔ ساری جایداد بہ حق ملک معظّم ضبط کر لی گئی، القاب وخطاب سے محروم کر دیے گئے اور حبسِ دوام بہ عبورِ دریائے شور کی سزا ہوتی۔ فلسفی اور منطقی لوگ ادب سے زیادہ ذوق نہیں رکھتے، لیکن یہ عربی زبان کے بلند پایہ ادیب تھے۔ انھوں نے انڈمان کے زمانۂ اسیری میں ایک " قصیدۂ غدریہ" کہا تھا، جس میں غدر کے اسباب وعوامل کو بہ زبانِ شعر بیان کیا تھا۔ وہ قصیدہ ضبط ہو گیا، شاید اب تک ضبط ہی، میں نے بعض لوگوں کے پاس اسے مخطوطہ کی حیثیت میں دیکھا ہی۔ فلسفہ ومنطق پر ان کی ہی بعض کتابیں نصابِ درس میں شامل ہیں اور مدارسِ عربیہ میں پڑھائی جاتی ہیں۔

مولانا فضل حق نے خیرآباد میں ایک عالی شان اور فلک شکوہ محل بھی تعمیر کیا تھا۔ سنگِ سُرخ جن سے دہلی کے لال قلعے کی زیب وزینت اب تک قائم ہی، مولانا نے اپنے خیرآبادی محل میں بھی استعمال کیے تھے۔ یہ مکان بھی حکومت نے ضبط کر لیا تھا اور ویران پڑا رہتا تھا، میں نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۴ پر)

دن میں سوا ناشتے کے کچھ کھانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا، مل کر جلد واپس ہونے کا قصد تھا۔ ۸ بجے شب کو واپسی کی اجازت چاہی، مگر فرش پر دسترخوان بچھ چکا تھا۔ پہلے مجھ سے اصرار کیا گیا مگر میں نے معذرت کی، جب نظام احمد سے کہا گیا، وہ بے تکلف دسترخوان پر نظر آتے، میری طرف مڑ کر بھی نہ دیکھا کہ میں اشارے سے کچھ کام لیتا، میرے لیے صبر کے سوا چارہ کیا تھا۔ کھانے کے ساتھ سُرخ، سبز، مختلف رنگ کی مدراسی شیر بنی بھی تھی۔ نظام احمد مرحوم نے اس کے لیے بھی اشارہ کیا، قہر گرسنہ برجانِ گرسنہ، دسترخوان ختم ہوا تو خواب گاہ کے اندر میزوں کی طرف طشتریاں جاتی نظر پڑیں۔

کچھ دیر کے بعد میں نے اجازت چاہی، بزرگ ممدوح نے فرمایا شہر بہت دور ہے، رات زیادہ گئی ہے، واپس نہیں جا سکتے۔ میں کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ نظام احمد مرحوم نے منظور کر لیا، خواب گاہ میں سامانِ استراحت ہو گیا، سب حضرات

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۶)

کوئی بات ناگوار ہوئی اور انھوں نے رختِ سفر باندھا۔ مزاج میں نفاست بہت تھی، لکھ لُٹ تھے، بہت رُپیہ کمایا لیکن اسے پاس نہ رکھا اِدھر آیا، اُدھر خرچ۔

حاضر جواب اور بذلہ سنج بھی تھے۔ ایک دفعہ نواب کلب علی خاں نے باتوں باتوں میں کہا "مولانا آج میں نے نلی کی ہڈی اپنے دانتوں سے توڑ لی" سارے دربار سے حبذا اور مرحبا کا شور بلند ہوا۔ مولانا نے فرمایا "آپ واقعی اسم با مسمّا ہیں!"

ایک روز ہم لوگوں کو گشت میں شام ہوگئی، شہر کو واپس آتے ہوئے پرنس آف ارکاٹ مدراس کے کیمپ میں جانے کا اتفاق ہوا۔ نواب بشیر احمد خاں بہادر خیرآبادی خویش پرنس آف ارکاٹ پرنس کے ہم راہ شرکتِ دربار کی غرض سے آتے ہوئے تھے، ممدوح ہمارے اور نظام احمد مرحوم کے قریبی بزرگ عزیز تھے،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۱)

اسے دیکھا تھا نہایت عالی شان مکان تھا۔ مغلیہ طرزِ تعمیر درو دیوار سے آشکار، اس میں ایک بہت بڑا تہ خانہ بھی تھا، بارہ دری، دالان در دالان، فوارہ، ایک خوش نما پارک، دیوار و در پر خوش نما بیلیں۔ یہ مکان حکومت نے اپنے ایک منظورِ نظر تعلقہ دار کو دے دیا تھا، کوئی آٹھ دس برس ہوئے یہ منہدم کر دیا گیا اور اس کا سامان کوڑیوں کے مول بک گیا۔ پھاٹک اتنا بڑا تھا کہ بہ یک وقت دو ہاتھی گزر سکتے تھے۔ کاش یہ عالی شان مکان حکومت کے محکمۂ آثارِ قدیمہ کی تحویل میں دے دیا جاتا تو ایک یادگار تو رہتی۔ اب تو وہاں ہل چل رہے ہیں۔

مولانا فضل حق کے صاحب زادے مولانا عبدالحق صاحب تھے۔ یہ بھی اپنے علم و فضل میں یگانہ تھے۔ باپ اور دادا کی بنائی ہوئی علمی عمارت کو ان کی صنعت کاریوں نے اور زیادہ باغ و بہار بنا دیا تھا۔ مولانا عبدالحق اپنے فن کے امام مانے جاتے ہیں، بڑے نازک دماغ اور تیکھے مزاج کے آدمی تھے، بات بات میں بگڑ جاتے تھے۔ نواب کلب علی خاں فرماں روائے رام پور ان کے شاگرد تھے اور معتقد بھی۔ وہ ان کی منتیں اور خوشامدیں کرکے اپنے ہاں رکھتے تھے، لیکن انھیں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۳ پر)

آرام فرمانے لگے۔

مَیں گرسنگی کی شدت میں کروٹیں بدل رہا تھا، نیند کا کیا ذکر، روشنی کم کر دی گئی تھی، مجھے کچھ سہارا تھا تو رنگین شیرینی کی طشتری کا۔ جب ہر طرف سے نفیرِ خواب بلند ہوئی، مَیں اُٹھا اور دبے پاؤں میز کے قریب پہنچ کر ہاتھ بڑھایا، ڈلی کا محسوس ہونا تھا کہ وہ مُنھ کے اندر پہنچ گئی، مَیں چاہتا یہ تھا کہ زبان پر پہنچنے سے پہلے حلق میں اُتر جائے، مگر وہ کم بخت سانپ کے مُنھ کی چھچھوندر بن گئی، نہ اُگلنے کی نہ نگلنے کی، رقیق شئے ہوتی تو آپ ہی تلخ کا دھوکا کھاتے، یہ شیرینی کی ڈلی نہ تھی، صابن کی بٹی تھی۔ میری مصیبت کا پورا لُطف اُٹھانا ہو تو کچھ دیر کے لیے صابن کی ٹکیہ مُنھ میں رکھ کر کام و دہن کو ممنون کیجیے۔ رومال سے صاف ہوکر وہ چیز وہیں گئی جہاں سے اٹھائی گئی تھی، پانی کی تلاش میں کسی کی آنکھ کھل جانے کا اندیشہ تھا، رومال کی کارفرمائی مُنھ کے اندر بھی رہی، ہم اس آسانی سے پلنگ تک نہ پہنچ سکے جس آسانی سے وہ چیز مُنھ تک پہنچی تھی۔ اب صابن اپنی جگہ پر تھا مگر اس کی لذت زبان پر۔

سب حضرات پابندِ نماز تھے، نمازِ فجر ادا کی، ساتھ ہی چائے مع بسکٹ وغیرہ آگئی۔ مَیں نے دو چار گھونٹ پی کر بسکٹ اتنے زیادہ پیالی میں ڈالے کہ بزرگ ممدوح کو میری طرف توجہ ہوگئی۔ دوسری پیالی بڑھا کر کہا "اب بسکٹ اس

میں ڈالے جائیں!" نظام احمد مرحوم کو ہنسی آ گئی جو معنی خیز تھی۔ استفسار پر انھوں نے کہا آپ تمام دن بھوکے رہے تھے پھر بھی شب کو کھانے میں تکلف کیا، واپسی کا بھی سہارا ٹوٹا، چاے میں تکلف رخصت ہوگیا، آپ بسکٹ سے زیادہ بے تکلف ہوگئے۔

میں دل میں خوش تھا کہ خدا نے صابن کے واقعے کا پردہ رکھ لیا!

کیا صابن کا واقعہ اچھّے شعر سے کم ہی؟ اب میں دربارِ قیصری کا ذکر چھوڑتا ہوں، اس کے لیے بوستانِ خیال کی ضخامت درکار ہی، کم بخت کی یاد، یادِ جوانی سے کم نہیں۔ یہی کہتے ہوتے وہاں رہے اور یہی کہتے ہوتے واپس آتے:

دربارِ قیصری کے عجب رنگ ڈھنگ ہیں
دہلی ہو اور ہم ہیں، بتانِ فرنگ ہیں!"

رام پور کی بزم آرائیاں

"میں دہلی سے آگرہ آیا، میرے والدِ ماجد مولوی سیّد طفیل احمد کوتوال آگرہ تھے۔ دو چار روز ٹھیر کر براہ مرادآباد رام پور پہنچا، استاد مرحوم نے سرکاری مہمان بننے نہ دیا اپنے ہاں ٹھیرایا، سرکار سے اجازت لے لی تھی، دوسرے روز جناب داغؔ، جناب منیرؔ اور بعض شعرا مجھ سے ملنے آتے، میں بھی سب حضرات کی خدمت میں تا قیام حاضر ہوتا رہا وہ سب حضرات بھی تشریف لاتے رہے۔ جانؔ صاحب مشہور ریختی گو روزانہ آتے تھے۔ یہی

زمانہ تھا کہ سرکار کا فارسی دیوان لسان الملک وزیر ایران کی اصلاح سے مزین، دو معزز سفیروں کی معرفت رام پور آیا تھا۔ سفیر سرکاری مہمان تھے، ہر طرف اصلاحِ دیوان کا چرچا تھا۔ خلد آشیاں کا شغف خاطر بڑھا ہوا تھا، مَیں بہ رسمِ دیرینہ نوّاب آفتاب الدولہ قلق سے جا کر ملا، جناب اؔسیر موجود نہ تھے۔

شعرا، علما، فضلا و دیگر ممتاز حضرات روزانہ دربار میں جاتے، دربار کا وقت ایک بجے سے چار بجے تک تھا، دربار ہال سے ملا ہوا ایک کمرہ اُستاد مرحوم کے لیے عوارض کی وجہ سے مخصوص تھا درباری نشست گاہ سے کچھ دُور مصاحب منزل کی عمارت تھی، سب حضرات وہاں موجود رہتے۔ سرکار جسے یاد فرماتے، چوب دار نام لے کر دربار ہال کے آخری دروازے سے پکارتا "حضور یاد فرماتے ہیں!" یہ سلسلہ دیر تک جاری رہتا۔

خلد آشیاں کا رُعب ہر ہستی پر بہت زیادہ اثر انداز تھا۔ البتہ شمس العلما مولانا عبدالحق علامہ خیرآبادی اس سے مستثنیٰ تھے۔ مَیں بھی مصاحب منزل میں وقت سے کچھ پہلے حاضر ہوا۔ جناب داؔغ، جناب منؔیر، علامہ خیرآبادی، نیز دو چار صاحب اور تشریف فرما تھے، آنے کا سلسلہ جاری تھا، مصافحہ و معانقہ و مزاج پُرسی کے بعد جناب داؔغ نے بہ اصرار کچھ سُنانے کے لیے مجھ سے ایما فرمایا بہ تعمیلِ ارشاد مَیں نے یہ مطلع پڑھا:-

ہنگامِ نزع گریہ یہاں بے کسی کا تھا
تم ہنس پڑے یہ کون سا موقع ہنسی کا تھا

تحسین و آفرین کی آواز ہر سمت سے ہمت افزائی کے لیے آئی؛ اس طرح ہر شعر کی داد مجھے ملی۔ اس زمین میں ایک شعر ایسا تھا جو بعض حضرات کو یاد رہ گیا:

یہ اپنی وضع اور یہ دشنامِ مے فروش
سُن کر جو پی گئے یہ مزا مفلسی کا تھا!

اب یاد فرمائی کا سلسلہ شروع ہو گیا، آواز آئی " مولانا عبدالحق صاحب کو حضور یاد فرماتے ہیں!" اسی طرح منیرؔ و داغؔ و دیگر حضرات تشریف لے گئے۔ ۳۰، ۳۲ کے بعد میرا نمبر آیا. خس خانے میں بیرونی روشنی سے آتے گونہ تکلّف ہوتا تھا، مَیں اس دروازے پر پہنچا " نگہ رُوبرُو" کی صدا بلند ہوتی، آواز کے ساتھ ہی مجھے سلام کے لیے جھکنا پڑا۔ درباری سب آداب اُستاد مرحوم سے دریافت کرکے نقشِ دل کر چکا تھا. سرکار کی نشست تقریباً وسط حال میں مسہری پر تکیوں کے سہارے تھی.

ایک صف مسہری کے رُوبرُو جنوب میں اُستاد مرحوم سے شروع ہو کر کسی اور پر ختم ہوئی ہو۔ دونوں صفوں کے مابین کچھ جگہ چھوٹی ہوئی تھی جس سے "نگہ روبرو" کی منزل طے کر کے مجھے نذر دینے مسہری کی طرف بہ کمالِ ادب دست بستہ نیچی نظر کیے خس خانے کی خوش گوار کم کم روشنی میں سنگِ مرمر کے خنک فرش پر سے گزرنا پڑا۔ نذر پیش کی، قبول ہوئی، واپسی میں بھی رُخ خُلد آشیاں کی طرف تھا۔ خدا نے بخیر و خوبی منیرؔ کے برابر نشست کی. مشکل آسان کی، زانو شکستہ، دست بستہ

نیچی نگہ کیے بیٹھ گیا۔

سرکار نے فرمایا "ریاضؔ تم نے آنے میں بہت دیر کی" معذرت کے الفاظ ختم ہونے پر داغؔ سے فرمایا "ہمارا کچھ کلام ریاضؔ کو سناؤ!" جناب داغؔ نے اپنے قامت سے زیادہ کشیدہ وبلند آواز سے اپنے مخصوص انداز میں سرکار کے اشعار سنائے کبھی حضور خود قافیہ وردیف اور کسی غزل کا مصرع داغؔ صاحب کو بتا دیتے۔ جس طرز خاص سے اشعار کی داد دی جاتی تھی، اس نے حضور کو اس قدر لطف اندوز کیا کہ خود حضور اپنے شعر سنانے لگے۔ دیر تک یہ رنگ قائم رہنے کے بعد ارشاد فرمایا "ریاضؔ تم کو فارسی کا بھی شوق ہے؟" سنتے ہی روح مائل پرواز نظر آئی، اس لیے کہ اصلاحی دیوان فارسی دیکھنے کا استاد مرحوم نے کچھ موقع اپنے دولت خانے پر دے دیا تھا، جس میں بہ کثرت عربی وفارسی کے لغت، بندشیں خاص، بلند مطالب، زبان بدلی ہوئی۔ مجھے جواباً عرض کرنا پڑا "حضور کے فارسی کلام کا بہت مشتاق ہوں!" حضور نے استاد مرحوم سے بہ اظہارِ قافیہ مخصوص قصیدہ سنانے کی فرمایش کی۔ چوب دار دیوان لایا، استاد مرحوم نے اپنے خاص انداز میں بلند آواز سے مطلع پڑھا۔ مجھے اتنا موقع مل گیا تھا کہ منیرؔ مرحوم سے اشارہ کرسکوں، روشن ضمیر منیرؔ یقیناً میرا مفہوم سمجھ گئے۔ آپ نے اس وضاحت سے لفظ لفظ کی تعریف کی کہ مجھے منیرؔ کے ساتھ ہم نوا رہنے میں زیادہ دقت نہیں پیش آئی۔ قصیدہ ختم ہونے پر زیادہ

وقت گزر جانے سے پہلے بعد دیگرے حضرات رخصت ہونے لگے۔ میں بھی اسی سلسلے میں اپنی قیام گاہ تک پہنچ گیا۔ درباری نشست جس کا اتفاق پھر بھی ہونے والا تھا، ایسی نہ تھی کہ میں اسے بھول سکوں، میں جاتے ہی بیمار ہو گیا اور مثنوی صحت بھی قائم نہ رکھ سکا۔

دوسرے روز اُستاد مرحوم نے دربار سے واپس آنے پر سرکار کی ایک غزل تضمین کے لیے عطا فرمائی، اور بہ ایمائے سرکاری اسی طرح میں غزل کہنے کے لیے ارشاد فرمایا۔ بیماری نے حاضریِ دربار سے مطمئن کر کے مجھے فکر کا اچھا موقع دے دیا۔ غزل بھی کہی، مصرعے بھی لگائے۔

میں تو عذرِ بیماری سے سرکار میں نہ جا سکا، اُستاد مرحوم نے تضمین بھی پیش کی اور غزل بھی۔ وقتِ حضوری سرکار نے مجھ سے ارشاد کیا اگر مشقِ سخن جاری رہی تو مجھ سے گوے سبقت لے جاؤ گے۔

اشعار مندرجہ ذیل حاضرین کو بھی سنائے گئے۔ منیر و داغ نے بھی مجھ سے تعریف کی۔ یہ دونوں شعر لوگوں کو یاد بھی ہو گئے خصوصاً دوسرا شعر، وہ شعر یہ ہیں:

جس کا تمام خلق نے رکھا ہے خضر نام
بھٹکا ہوا یہ کوئی مرا نامہ بر نہ ہو

باہم شبِ وصال دکھائے ہیں کیا مزے
وہ بھی یہ کہہ رہے ہیں الٰہی سحر نہ ہو

خلد آشیاں نے چاہا میں رام پور سے واپس نہ جاؤں، ماہوار بھی تجویز فرمادی۔ اُستاد مرحوم نے مجھ سے مشورہ فرماکر اخبار و پریس کی وجہ سے فوراً تعمیلِ ارشاد میں میری طرف سے اظہارِ معذرت اور چند روز کے بعد وعدۂ حاضری کا اظہار فرمایا۔

جس روز میں رخصتی سلام کو جانے والا تھا، اس سے ایک دن پیشتر اُستاد مرحوم نے افسردگی کے ساتھ مجھ سے فرمایا کہ شمس العلما اور داغ صاحب نے ذکر آنے پر سرکار سے عرض کیا کہ دیوان ناظم کی مطبوعہ جلدیں بہ احتیاط کتب خانے میں مدت سے رکھی ہوئی ہیں اگر ریاض کو مرحمت فرمائی جائیں تو پریس و اخبار کی وجہ سے وہ بہت کافی طور پر نفع اندوز ہوسکیں گے۔ سرکار نے بھی یہ تجویز پسند فرمائی، میں نے استاد مرحوم سے عرض کیا کہ خیرآباد ایسا مقام ہے جہاں کاغذ بھی آسانی سے فراہم نہیں ہوسکتا۔ اُستاد مرحوم نے فرمایا آپ ہی سرکار میں بہ وقتِ رخصت عرض کریں۔ میں خود کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھتا تھا۔

میں نہایت افسردگی کے ساتھ دوسرے دن سلامِ رخصت کی غرض سے حاضرِ دربار ہوا۔ سرکار نے بہ لطفِ خاص ارشاد فرمایا کہ ریاست کو ہمیشہ اپنا گھر سمجھو اور حسبِ وعدہ تا امکان "بے نظیر" کے میلے سے کچھ قبل آجاؤ۔ میں نے عزت افزائی پر دلی شکریہ ادا کیا کچھ غدر کا ذکر اور ریاست کے خدمات بیان فرمائے۔ ساتھ ہی یہ بھی ارشاد ہوا کہ ریاض الاخبار میں

اس کا ذکر نہ آنے پائے۔ آخر میں حسبِ ایما چوب دار ایک کشتی حضور کے روبرو لایا، مجھے بھی قریب جانا پڑا۔ حضور نے خلعتِ دوشالہ اپنے دستِ مبارک سے میرے زیبِ دوش کیا۔ مقررہ آدابِ دربار کے موافق بہ ادب سلام کر کے جب مکان کو روانہ ہوا تو بے ساختہ یہ شعر موزوں ہو گیا:

ریاضؔ اس درجہ وہ نوّاب کی بخشش پہ عاشق تھی
لپٹ کر رہ گئی تقدیر خلعت کے دوشالے میں

اُستاد مرحوم دربار میں آج تشریف نہیں لے گئے تھے، منتظر تھے کہ کاغذ خیرآباد میں نہ فروخت ہونے کی معذرت کا کیا نتیجہ ہوا۔ اُستاد مرحوم سے زیادہ جناب مفتی طالب حسین صاحب برادرِ معظم امیر مینائی مرحوم جو غالباً اس وقت مفتیِ عدالت تھے اور جامع کمالات بھی، میرے نتیجۂ رخصت کے منتظر تھے۔ میری واپسی پر خلعتِ دوشالہ عطا ہونے سے بہت خوش ہوئے۔ یہ اگر ہو ہی رہا تھا کہ گیارہ چوب دار وردی پوش مع جمع دار کے کشتیاں سر بند لیے ہوئے آئے۔ جمع دار نے اُستاد مرحوم سے عرض کیا سرکار نے ریاضؔ کے لیے یہ کشتیاں بھیجی ہیں، ہر کشتی میں دس یا پندرہ جلدیں دیوان ناظم کی تھیں اور ایک کشتی میں پارچہ اور دو سو رُپے نقد کے ساتھ کسی چیز کے لینے میں مجھے کیا عذر ہو سکتا تھا۔ استاد مرحوم مع موجودین بہت خوش ہوئے۔ چوب داروں کو استاد مرحوم نے زرِ انعام دے کر رخصت کیا اور مجھے زردار بنا کر۔

بہرحال یہ ظاہر کر چکا ہوں کہ دیوانِ ناظم کی کئی نسخہ جلدیں جو خلد آشیاں نے مجھے مرحمت فرمائیں، وہ شمس العلما اور جناب داغ کی تحریک و تائید کا نتیجہ نہیں۔ ممکن ہے مجھے زیادہ فائدہ پہنچنے کے خیال سے یہ تحریک پیش کی گئی ہو، بہ ذہنِ خود میں سمجھتا تھا کہ شمس العلما مجھ سے گونہ کشیدہ ہیں، داغ صاحب کو بہ اعتبارِ مراسم تائید کے سوا چارہ نہ تھا!

ایک "سنسنی خیز" واقعہ!

شمس العلما کی کشیدگی کا خیال مجھے اس بنا پر تھا کہ شمس العلما کے عمِ بزرگ جناب مولوی منظر حسین صاحب شوخ جو ترکِ وطن کر کے اجمیر شریف میں آستانۂ مبارک پر ہمیشہ کے لیے جاگزیں ہو چکے تھے، ان کی دخترِ نیک اختر کی نسبت قبلہ حافظ عنایت احمد مرحوم خیرآبادی مشہور وکیل دہلی کے ساتھ کئی سال ہوئے ان کی زوجہ مرحومہ نے کر دی تھی۔ شمس العلما نے بہ حالتِ لاعلمی اپنے عمِ بزرگ سے فوری منظوری کی اپنی شادی کے لیے تحریک کی۔ یہ تحریک منظور ہو کر عقد رومال پر کسی خاص مسئلے کے تحت بہ مقامِ اجمیر ہو گیا۔

لڑکی ماں کے پاس خیرآباد یا رسوی ضلع بارہ بنکی میں مدت مدید سے تھی۔ ماں کو جب عقدِ صبیہ کا حال معلوم ہوا تو وہ خاندانی مراسم کی بنا پر فوراً فرنگی محل چلی گئیں۔ وہیں سے حافظ عنایت اللہ مرحوم وکیل دہلی کو طلب کیا اور خیرآباد سے دیگر اعزا کو یہاں

سے مجھے اور نظام احمد مرحوم کو بھیجا گیا۔ ہم دونوں بھی بہ مقام فرنگی محل اسی مکان میں ٹھیرے جہاں بزمِ عروسی برپا تھی، دوسری شب کو مراسمِ عقد عمل میں آئے۔ مولانا عبد الرزاق[1] قدس سرہ العزیز فرنگی محلی نے نکاح پڑھایا۔ مبارک سلامت کے ساتھ وقت گزر گیا۔

شمس العلما بھی کسی ذریعے سے خبر پاتے ہی لکھنؤ آئے اور سٹی مجسٹریٹ کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا۔ ناکح اور گواہ وغیرہ بھی شوہر کے ساتھ مدعا علیہم قرار پائے۔ سمن جاری ہوئے، تاریخ مقرر ہوئی۔ ہر طرف یہی شور، یہی چرچا، علما و عمائد لکھنؤ سب آتش زیر پا۔ مولانا عبد الرزاق فرنگی محلی اس پائے کے بزرگ کہ لکھنؤ کے سوا بیرون جات میں بھی شدید اثر تھا۔ دقت یہ تھی کہ شمس العلما کا درجہ بھی بلادِ ہند اور دیگر ممالکِ اسلامیہ میں مسلّمہ تھا۔

اس زمانے میں مولوی یعقوب صاحب فرنگی محلی کی ادارت و ملکیت میں لکھنؤ سے ہفتے وار "کارنامہ" شائع ہوتا تھا جس میں اس مقدمے کے متعلق کچھ مضامین شائع ہوئے جن کی سرخی تھی "دو مُلّا میں مرغی حرام!" صلح کی تمام کوششیں بے نتیجہ رہیں۔ تاریخ پر عدالت میں ہجوم تھا۔ مدعا علیہم کی جانب سے وکلا نے ایک محضر پیش کیا جس پر تمام علما نے جو درجات کتب کے ساتھ عقد کے ناجائز اور غیر صحیح ہونے پر دستخط کیے تھے۔

---

[1] مولانا عبد الباری فرنگی محلی کے والد بزرگوار

وکلا نے زور دیا کہ استغاثہ خارج کیا جائے۔ شمس العلما نے بہ جواب عدالت کے رُوبرُو مختصر و دل نشین تقریر کی اور عدالت کو یہ سمجھا دیا کہ جن علما نے محضر میں استغاثے کے خلاف حوالے دیے ہیں، میں ان سے دو چار مختصر سوال کروں گا۔ عدالت جوابات کے ساتھ انھیں قلم بند کر کے فیصلہ فرما دے۔ اتفاق کہ صرف محضر پر بہ امید آیندہ تاریخ اکتفا کی گئی تھی، کوئی حاضر نہ ہوا تھا۔ وکلا نے عدالت سے چاہا کہ علما کو حاضری کی تکلیف نہ دی جائے مگر عذرات نامسموع ہو کر قطعی تاریخ بہ اجرائے سمن مقرر کر دی گئی۔ (عدالت علما کی بحث کو کب ہاتھ سے جانے دیتی تھی!) بلند پایہ علما عدالت میں جانا نہیں چاہتے تھے، خصوصاً مولانا عبدالرزاق فرنگی محلی جن کا عدالت میں جانا لکھنؤ کیا ہندستان نہیں گوارا کر سکتا تھا۔ اس تاریخ کی شہرت تمام لکھنؤ میں بلکہ دُور دُور اضلاع غیر و بیرُون جات میں ہو گئی تھی۔ ہر شخص عدالت میں وہ سماں دیکھنا چاہتا تھا جو پورب کے گنوار پچاس برس پہلے ہائی کورٹ الہ آباد کی شان دار عمارت، وکلا و بیرسٹروں وغیرہ کے کرّ و فر سے مرعوب ہو کر دیہات میں دادِ خوش بیانی دیا کرتے تھے۔ مثلاً شان دار ملبوس کے ذکر میں "اُدھر سے آئے ہمارا ڈبلو سر پر باندھے کتات" (کتات کنایہ از دستار) ڈبلو = وکیل۔ پھر عدالت کے رُوبرُو ان کی گرج اور کڑک جو مشاق آلھا گانے والوں کو نصیب نہیں۔ مثلاً اس کا یہ آخری فقرہ:

"پھاٹے لاگ چڑمی چوئے لاگ انکار ٹپ ٹپ ٹپ
(بجلی) (ٹپکنے لگے)

الفاظ کا گھٹاؤ بڑھاؤ اور موقع سے ٹھیراؤ جس موثر انداز میں عظمت وجلال اور شان وشوکت پیدا کرتا تھا، اس کا بیان دُشوار ہی۔

اس مقدمے کی وجہ سے سٹی مجسٹریٹ کی عدالت کو ہائی کورٹ کا درجہ حاصل ہونے والا تھا اور کیوں نہ ہوتا ایک طرف نہ صرف علماے فرنگی محل بلکہ تمام علماے لکھنؤ، پھر دہلی اور لکھنؤ کے وکلا کی ایک اثر انداز جماعت ان کے علاوہ۔ دوسری طرف شمس العلما خیرآبادی جو اور علوم کے علاوہ منطق بیں خود اپنی نظیر ہوسکتے تھے۔ ذہانت، ذکاوت، حافظہ، ہر بات خداداد، خوش بیانی کا وہ عالم کہ سننے والا محو۔ان کی تائید بیں اور جو حضرات ہوں، مجھے علم نہیں۔معاملہ بھی نازک، مسئلہ بھی نازک۔

شمس العلما کو کچھ بھی علم ہوتا کہ مولوی حافظ عنایت اللہ وکیل سے لڑکی کئی سال سے منسوب ہی تو باوصف اس کے کہ شمس العلما کی اہلیہ کے انتقال ہوجانے سے عقد کی ضرورت تھی مگر وہ کبھی ادھر ملتفت نہ ہوتے اسی طرح اہلیہ مولوی مظفر حسین کو اس کا علم ہوتا کہ شمس العلما کا عقد صحیح وجائز طور پر ہوچکا ہی تو وہ دخترِ نیک اختر کے عقد بیں عجلت سے کام نہ لیتیں اب فریقین کے لیے "سنگ آمد و سخت آمد" کا معاملہ تھا۔

سٹی مجسٹریٹ کی عدالت تاریخ پر تھیٹر اور سینما بننے والی تھی۔
علماے فرنگی محل و عملۂ شہر کی طرف سے چند باا ثر متقدر حضرات و اکابر شہر اور متعدد گرامی نامے لے کر رام پور پہنچے اور نواب کلب علی خاں بہادر مرحوم کے حضور میں باریاب ہوتے۔ باوصف اس کے کہ خلد آشیاں اپنے اُستاد کے مرثیے اور نازک مزاجی کا بہت ہی لحاظ رکھتے تھے، مگر وعدہ فرما کر سب کو مطمئن کر دیا اور شمس العلما علامہ خیرآبادی کو بہ عجلت تمام خاص طریقے سے طلب فرما کر اپنی آرزو براری کا وعدہ لیا، پھر ارشاد فرمایا کہ رفیقِ زندگی جن شرائط کے ساتھ مطلوب ہو، اس کا انتظام و اہتمام ریاست کے ذمے ہو۔ تمام کارروائی صیغۂ راز میں رہی اور تاریخ پر صلح نامہ یا استغاثے سے دست برداری عدالت میں داخل ہوگئی؛

حوریاں رقص کناں ساغرِ مستانہ زدند

یہ اسباب تھے جن کی بنا پر میں شمس العلما کی نسبت غلط فہمی میں مبتلا ہوا۔ مجھے تسلیم ہو کہ شمس العلما کی تحریک اور جناب داغ کی تائید نیک نیتی سے تھی۔ مگر مجھے بہ اعتبار تعدادِ زر نقصان پہنچا اور گو خلد آشیاں نے اپنے دستِ مبارک سے خلعتی دوشالہ میرے زیبِ دوش فرما کر مجھے گراں دوش کیا۔ اور زرِ نقد بھی شان دار طریقے سے بھیجا مگر میں "بروکتا بےچند" کا ہر طرح مصداق رہا!

خود دار شاعر!

"کارنامۂ لکھنؤ" نے جس عنوان کے ماتحت مضامین شائع کیے یہ تو ہو سکتا ہے کہ اڈیٹر ریاض الاخبار و گل کدۂ ریاض کا ان سے لگاؤ نہ ہو صرف بزم عقد لکھنؤ میں میری شرکت کم و بیش آزادگی کے لیے کافی سمجھی جا سکتی تھی۔ بہرحال آں چہ گزشت گزشت، یہ صحیح ہے کہ شمس العلما اور جناب داغ کے تعلقات تا حیات مجھ سے کمال شگفتہ رہے اور دونوں مقتدر ہستیاں ہمیشہ مجھے ایک شاگرد عزیز کا ہم مرتبہ سمجھتی رہیں، بلکہ ایک مرتبہ جب شمس العلما حیدرآباد دکن سے وظیفہ یاب ہو کر خیرآباد واپس تشریف لاتے، تو میری زبان سے برسبیلِ تذکرہ ایک واقعہ سن کر دیر تک کفِ افسوس ملتے رہے اور بار بار یہ فرماتے تھے کہ داغ صاحب سے یہ غلطی کیوں کر سرزد ہوئی؟

واقعہ یہ تھا کہ گل چیں جب لکھنؤ سے گورکھپور منتقل ہوا اس کا تعلق مجھ سے اور ریاض الاخبار پریس سے ہو گیا۔ یٹر نے یہ التزام کیا کہ مصرع طرح ہر مرتبہ کسی اُستاد یا ایسے ممتاز شعرا سے لیا جائے جو وقیع ہوں۔ اس التزام سے کئی نمبر گل چیں کے بہت کامیاب نکل چکے تھے۔ اس سلسلے میں اُستاد مرحوم کو تکلیف دی گئی اور جناب امیرمینائی نے یہ مصرعہ لطف فرمایا:-

کنی ہیرے کی نیلم میں جڑی ہے!

جب یہ مصرع شائع کیا گیا تو گل چیں میں مصرع طرح پر مصرع بہم پہنچانے کی بھی فرمایش کی گئی۔ ابھی اس طرح میں ناتمام دو تین نمبر نکلے تھے کہ اعلاحضرت میر محبوب علی خاں مرحوم خسروِ دکن بالقاب کو اس طرف توجہ ہوئی۔ اعلاحضرت کی غزل کا یہ مصرع اس قدر مقبول و شہرت پذیر ہؤا کہ تمام ہندستان پر چھا گیا اور گویا وہی مصرع طرح قرار پا گیا:

یہ چوٹی کس لیے پیچھے پڑی ہے!

متعدد شعرائے نامی نے اس مصرع پر مصرعے لگائے۔ شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو جس نے اس زمین میں پوری قوت سے فکر نہ کی ہو۔ گل چیں کے نمبر ایک سال تک اس طرح میں نکلتے رہے۔

جب خسروِ دکن نے غزل کہی اور اس مصرع نے ہر طرف دُور دُور شہرت حاصل کی تو دکن سے ابراہیم صاحب خانساماں کا خط ان کے پیش دست کا لکھا ہؤا میرے نام آیا، جس میں تحریر تھا "میں تمھارے لیے کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دُوں گا۔ تم یہاں آنے کے لیے تیار رہو، بہت جلد اعلاحضرت تمھیں یاد فرمائیں گے اور تین مصرع طرح گل چیں کے لیے اعلاحضرت نے مرحمت فرمائے ہیں، ان کو نمبروار شائع کرتے رہنا۔"

مجھے سطحی تحریر اور تم تم کی تکرار خط میں گراں گزری۔ میں ابراہیم صاحب خانساماں سے واقف نہ تھا، نہ ان کے پیش دست سے۔ میں نے جناب داغ کو نیازنامہ بھیجا اور اس کے ساتھ ابراہیم صاحب کے خط کی نقل بھیج کر اعلاحضرت کے عطیہ

طرحی مصرعوں کی اشاعت کے لیے ممدوح کی راے دریافت کی۔
ممدوح نے تحریر فرمایا جواباً لکھ دیجیے جب تک اُستادِ اعلاحضرت کی وساطت سے مصرعے نہ آئیں گے، گل چیں اشاعت سے قاصر رہے گا۔

اس کا اثر جو کچھ ہونا چاہیئے تھا ظاہر ہی!

شمس العلما دستِ افسوس مل کر اس واقعے کو جناب داغ کی غلطی اور میری انتہائی بدنصیبی پر محمول کرتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ ابراہیم صاحب کے اقتدار و اختیار کا بھی تفصیل کے ساتھ ذکر فرماتے تھے۔ مَیں دل ہی دل میں کہتا:۔

چشمِ ما بسیار ازیں خواب پریشاں دیدہ است!

جناب شمس العلما کی سابقہ نوازشوں اور اس برتاؤ سے مَیں کبھی گمان بھی نہیں کر سکتا کہ ان کی طبعِ نازک پر میرے کسی فعل سے گرانی پیدا ہوتی ہو گی۔ بہ فرض ایسا ہوا بھی ہو تو چند ساعت کے لیے خفیف اثر ممکن ہی۔ سی طرح جناب داغ کی نسبت مَیں شمس العلما کا ہم خیال بن کر ان کی غلطی بھی اپنے متعلق نہیں تسلیم کر سکتا۔ جناب داغ تاحیات نہایت کشادہ دلی سے ریاض الاخبار کے پردے میں میری امداد فرمانا اپنی وضع میں داخل سمجھتے تھے۔ ممدوح کے ہر نوازش نامے میں حرف حرف سے محبت ٹپکتی تھی، بلکہ بین السطور سے بھی محبت کے چشمے اُبلتے تھے۔"

نوّاب آفتاب الدّولہ بہادر قلقؔ

"میں جس زمانے میں خلد آشیاں کا طلبیدہ رام پور گیا تھا جناب داغؔ کا پہلا دیوان "گلزار داغؔ" زیرِ نگرانی امیرؔ مینائی طبع ہو رہا تھا۔ جلالؔ و تسلیمؔ جب تک لکھنؤ میں تھے، تسلیم سہسوانی اور صبا البتہ رام پور میں تشریف رکھتے تھے۔ لکھنؤ میں تسلیم لکھنوی اور اشرف ہمیشہ ایک دُوسرے کے ساتھ رہتے، کتابت میں دونوں ہم پیشہ، دونوں نول کشور آں جہانی کی نظر میں وقیع، دونوں کو نسیمؔ دہلوی سے تلمذ، باوضع بھی خلیق بھی، سراپا عجز بھی، کبھی کبھی شمس لکھنوی بھی ان کے ہم راہ نظر آ جاتے۔ مشتری طوائف مشہور شاعرہ ان کی شاگرد تھی۔ اس کی شاگرد شمسؔ کی شہرت کو چار چاند لگا دیے تھے۔ زہرہؔ ہمشیر مشتری بھی ان کی شاگرد تھی۔ یہ لوگ واقعی مرتبے کے تھے۔ صحیح ہو یا غلط مندرجہ ذیل شعر میں نے شمسؔ کے نام سے سُنا تھا:-

جینے نہ دیں گی آنکھیں تری دل رُبا مجھے
ان کھڑکیوں سے جھانک رہی ہے قضا مجھے

نوّاب آفتاب الدولہ بہادر قلقؔ میرے جانے پر رام پور میں موجود تھے۔ قیامِ لکھنؤ کے زمانے میں بار بار ان سے ملا تھا، گو وہ زمانہ عشرت کا تھا مگر آن بان، پابندیِ وضع، خودداری ان کا حصّہ تھی۔

امیرؔ مینائی کی وساطت سے خلد آشیاں نے آپ کو رام پور

طلب فرمالیا تھا واپس آنے پر کچھ عرصے کے بعد میں نے سنا کہ سرکاری مشاعرے میں وقت مقرّرہ پر نہ پہنچنے سے بعض معزّز شعرا معتوب ہوئے۔ بغیر شرکتِ مشاعرہ واپس آنا پڑا، معمولاً بھی روزانہ دربار میں یاد فرمائی نہ ہوتی۔ دو چار روز کے بعد معذرت آمیز عرض داشتیں پیش ہونے پر سرکار نے عفو سے کام لیا۔ سب حضرات باریاب ہونے لگے۔ قلق نے نہ عرض داشت بھیجی، نہ کسی کی وساطت سے عذرخواہی کی۔ سرکار نے پوچھا تو معلوم ہوا قیام گاہ پر بغیر شرکتِ مشاعرہ واپس جاتے ہی لکھنؤ روانہ ہوگئے۔

حسبِ ایمائے سرکار، امیر و داغ نے محبت نامے بھیجے، عفو کا یقین دلایا، سب کے جواب آتے رہے مگر قلق نہ آئے۔ بہ ایمائے سرکار تنخواہ لکھنؤ جانے لگی۔ کئی مہینے کے بعد خلد آشیاں کی دستخطی تحریر پہنچنے پر اس طرح آئے گویا گئے نہ تھے، گو لکھنؤ وہ اپنی پہلی حالت کی بازگشت کے ساتھ واپس ہوئے تھے، پھر بھی اپنی بات رکھی!"

منیر شکوہ آبادی

"میں منشی اسماعیل حسین صاحب منیر شکوہ آبادی سے جب ملنے جاتا یا وہ تشریف لاتے میری درخواست پر کچھ سناتے ضرور۔ ہر سنگلاخ زمین میں خاک اُڑانا ان کا حصہ تھا ورنہ قادر وہ ہر رنگ پر تھے۔ غزل میں بہت شعر کہتے تھے، زود گوئی میں عجب نہیں امیر کے بعد ان کا درجہ ہو۔ مجھے ان کی دو

غزلوں کے دو شعر اب بھی یاد ہیں اور ایک زبان کا بھی، زبان پر بعض کے نزدیک قادر نہ تھے، میں نے ان کی کسی لغزش کا ذکر کسی سے سنا نہیں۔ مرزا دبیر پر نساخ کے اعتراضوں کا جواب انھوں نے دیا ہے۔ وہ رسالہ بھی شائع ہو گیا ہے مگر میں رسالہ دیکھے بغیر کچھ نہیں کہ سکتا۔ فرماتے ہیں:۔

داغِ سجدہ ہے جبیں میں داغ میں خاکِ سجود
خطِ قسمت کی شکن میں گل ہے گل میں خاک ہے

اس میں "شکن" قافیہ ہے "گل ہے گل میں خاک ہے"۔ ردیف۔

غُلّے ہماری خاک کے ہیں اُن کے ہاتھ میں
اس وصل مختصر کی بھی دُشمن غلیل ہے

رشک کے شاگرد تھے، ان کا تتبع مایۂ ناز تھا۔ رعایتِ لفظی کے ساتھ اسی رنگ کے شعر زیادہ ان کے دیوانوں میں ہیں۔

ہاتھوں سے ناپتے ہیں راہِ جنوں
آستینوں میں کوس پڑتے ہیں"

(۱۹) گوشہ نشینی اور اِستغنا!

ریاض ایسا گیا گزرا نہیں جو شان جانے دے
گدائی کے لیے وہ لے کے جامِ جم نکلتا ہے!

فطرت کی طرف سے ریاض ایک خاص طبیعت لے کر آئے تھے۔ وہ مشہور تھے لیکن شہرت سے انھیں نفرت تھی۔

وہ بزم و انجمن میں بلائے جاتے تھے۔ لیکن وہ:

دُنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یارب!

گھر کر اپنے گوشۂ قناعت میں چلے جاتے تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اتنے مشہور ہو چکے تھے کہ شہرت سے اب ان کا جی بھر گیا تھا۔ بزم و انجمن میں اس قدر زیادہ شرکت کر چکے تھے کہ اب اس ہنگامہ آرائی سے ان کی طبیعت سیر ہو چکی تھی ؎

اب مجھے پیرِ خرابات کا ہو حکم ریاضؔ
جا کے آباد کروں مسجدِ ویراں کوئی!

اب ان کا واقعی یہی جی چاہتا تھا۔

ایک زمانہ تھا کہ انھیں رُپے کی زیادہ ضرورت نہیں تھی لیکن سیم و زر ان کے قدم لیتا تھا۔ پھر وہ دَور آیا کہ انھیں رُپے کی ضرورت تھی لیکن وہ عنقا کا حکم رکھتا تھا۔ کسی دَور میں بھی انھوں نے زر پرستی کو اپنا شعار نہیں بنایا۔ رُپے پر بے تابانہ نہیں گرے، اپنی خودداری، اپنی شان، اپنی آن میں انھوں نے کبھی فرق نہیں آنے دیا۔

وہ اپنے گوشۂ عزلت کو قصر و ایوان پر ترجیح دیتے تھے، وہ اپنی نانِ جویں کو الوانِ نعمت سے بہتر سمجھتے تھے، وہ اپنی دلق و بوریے کو مسند اور کرسی سے عزیز رکھتے تھے۔ انھیں اپنے پھٹے پُرانے کپڑے زرق برق لباس سے زیادہ مرغوب تھے۔ وہ اگر کسب و طلب کے لیے بڑھتے بھی تھے

تو پیچھے لوٹنے کے بہانے ڈھونڈتے رہتے تھے۔ اور ذرا سا حیلہ ملنے پر فوراً رجعت پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ سچ تو یہ ہی وہ بڑے مستغنی اور بے پروا مزاج کے آدمی تھے، وہ ہرگز کسی سے کبھی کسی لالچ اور طمع کے تحت نہیں ملتے تھے، اسی لیے ملنے جاتے بھی نہیں تھے. کوئی ملنے آیا تو تپاک سے ملے، نہ آیا تو اپنے گھر بیٹھے رہے — اور:

جہاں ہم خشتِ خُم رکھ دیں بنائے کعبہ پڑتی ہی
جہاں ساغر پٹک دیں چشمۂ زمزم نکلتا ہی

کا نعرہ لگاتے رہتے!

گوشہ نشینی!

ریاضؔ کی وفات کے بعد ان کے ایک "استاد بھائی" نے لکھنؤ کے روزنامۂ حقیقت میں اپنے تاثرات شائع کرائے تھے. انھوں نے فرمایا تھا:۔

"آپ کے اخلاق نے ایک عالَم کو گرویدہ بنا لیا تھا۔ گوشہ نشینی خاص طور پر پسند طبیعت تھی۔ نام آوری اور شہرت کے خواہاں ابتدا سے نہ رہے۔ ادھر اُدھر تلاشِ معاش میں سرگرداں نہیں رہے۔ مزاج میں مروّت وقناعت بے حد تھی!

دوست احباب کی فرمایش اور اصرار پر مشاعرے کی طرح پر غزل ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ (اکثر) غزل نذرِ احباب ہو گئی یا کسی شاگرد نے حاصل کر لی!"

یہ الفاظ مداحانہ شاعری سے تعلق نہیں رکھتے ہیں۔ یہ ریاض کی زندگی کی اصلی تصویر ہے۔

آن بان!

مولوی سبحان اللہ خاں تحریر فرماتے ہیں:

"ریاض کا لٹریچر اور ریاض کا قلم اتنا بے پناہ ہو گیا تھا کہ جس ضلع کے حاکم کے متعلق ایک نوٹ لکھ دیا، اس کا آدمی دوڑتا ہوا ریاض تک پہنچتا ہے اور منتیں خوشامدیں کرتا ہے، جس ریاست کے متعلق ایک ایڈیٹوریل لکھ دیا تو فرسٹ کلاس کے اخراجات کے ساتھ وہاں کا کوئی معزز آدمی لینے آیا اور بارہا اس مستغنی المزاج شخص نے اس کو ٹھکرا دیا۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے ریاض "بلیک میلنگ" کے خوگر نہیں تھے بلکہ انھیں اس سے نفرت تھی۔ ریاستوں کے بارے میں تو اب تک ایسے صحافی موجود ہیں جنھوں نے اپنا ذریعۂ معاش بھی بنا لیا ہے کہ موقع ہوا تو مخالفت کر دی۔ امید ہوئی تو حمایت میں قصیدہ شائع کر دیا۔ مولوی صاحب کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ لکھتے تھے، آزادانہ طور پر لکھتے تھے اور لکھنے کے بعد نہ صرف نتائج سے بے پروا رہتے تھے، بلکہ "دست غیب" کے بھی منتظر نہیں رہتے تھے، اور:

مردے از غیب بروں آید و کارے بکند

والا معاملہ پیش بھی آیا تو ان کی خوددار اور مستغنی طبیعت اس

"حسنِ اتفاق" سے فایدہ اُٹھانے سے گریز کرتی تھی۔

ریاستوں کی پیش کش!

ریاضؔ طبعاً بڑے غیور اور نازک مزاج تھے، اسی لیے مواقع ملنے کے بعد بھی وہ ریاستوں کی ملازمت سے احتراز کرتے تھے، ہمارے شعرا کا ایک بڑا طبقہ صرف ریاستوں ہی کی قدر دانی اور ذرہ نوازی پر جی رہا ہے۔ ریاضؔ کے زمانے میں تو خاص طور پر ریاستیں شاعروں کا ملجا وماوا بنی ہوئی تھیں، جس کا برطانوی ہند سے جی گھبرایا، ایک انگڑائی لی اور کسی ریاست کا رُخ کیا۔ ریاضؔ کے زمانے کے تمام مشہور شعرا کسی نہ کسی ریاست سے وابستگی رکھتے تھے۔ خود ان کے استاد حضرت امیر مینائی رام پور میں موجود تھے، اور بھی ان کے ذرائع تھے۔ یہی وجہ تھی کہ بارہا وقیع ریاستوں کی طرف سے انھیں پیش کش کی گئی، لیکن انھوں نے ہمیشہ بہ لطائف الحیل ٹال دیا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ انھیں رُپے کی ضرورت نہیں تھی یا وہ ملازمت سے رُوگرداں تھے۔

بات اصل یہ تھی کہ وہ دربار کی پابندیوں، وہاں کے آداب، طرزِ نشست اور "غلامی" سے نفور تھے، اسی لیے وہ گھاٹے اور ٹوٹے میں رہے۔

سید عقیل احمد صاحب فرماتے ہیں:

"نوّاب کلب علی خاں کے دربار میں جہاں منیرؔ، عروجؔ، بحرؔ، آغا ہجو ہندیؔ، قلقؔ، امیرؔ، داغؔ اور جلالؔ وغیرہ مشاہیرِ فن

جمع تھے، آپ کی طلبی ہوئی۔ نوّاب صاحب نے خود فرمائش کر کے کلام سُنا اور سنایا، کلام سُن کر حادرجہ محظوظ ہوئے، خلعت اور زرنقد سے سرفراز کیا، اور قیام کے لیے بھی عندیہ ظاہر کیا، مگر آپ جس طرح حیدرآباد کی پابندی نہ برداشت کر سکے اسی طرح رام پور بھی ٹھیرنا نہ گوارا کر سکے۔

قیام لکھنؤ کے زمانے میں ہزہائی نس نواب حامد علی خاں بہادر رشکِ فرماں روائے رام پور کی طرف سے صاحب زادہ مصطفیٰ علی خاں بہادر مرحوم دو مرتبہ اس مقصد سے لکھنؤ آئے کہ ریاضؔ کو رام پور لے جائیں۔ تیسری مرتبہ ہزہائی نس نے راجا نوشاد علی خاں تعلقہ دار میلا رائے گنج سے فرمایا کہ آپ حضرت ریاضؔ کو لائیں مگر آپ پھر بھی نہ گئے۔"

پروفیسر امرناتھ جھا وائس چانسلر الہ آباد یونی ورسٹی اپنے ایک انگریزی مضمون میں لکھتے ہیں:۔

"ریاضؔ کے پاس اعانت کی پیش کش نظام حیدرآباد اور مہاراجا سرکشن پرشاد کے یہاں سے آئی، لیکن وہ مہاراجا محمود آباد ہی کی سرپرستی پر قانع رہے۔"

مولوی سُبحان اللہ صاحب کا بیان ہے:۔

"ریاضؔ مرحوم بے لاگ اور بے طمع شخص تھے۔ منشی امیر احمد مینائی جب رام پور میں نواب کلب علی خاں کے پیش کار تھے؛ اسی زمانے میں سیّد ریاض احمد صاحب کی شاعری جوان ہو رہی تھی۔ نواب کلب علی خاں ان کو اپنے درباریوں

میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ کئی بار ریاضؔ کو منشی امیر احمد صاحب مینائی نے رام پور بلایا اور یہ کہا کہ نوّاب صاحب یہ چاہتے ہیں، مگر یہ کوئی نہ کوئی بہانہ کرکے رام پور سے چلے آتے۔

نواب حامد علی خاں مرحوم فرماں روائے رام پور تمام عمر ریاضؔ کو بلاتے رہے اور اپنے درباریوں میں شامل کرنے کے مشتاق رہے، کئی بار ہزہائی نس کے بلانے پر رام پور گئے، مگر کبھی مستقل قیام کرنا نہیں چاہا، واپس چلے آئے۔

ایک مرتبہ سُلطان دکن میر محبوب علی خاں غفران مکان نے بھی ریاضؔ کے حیدرآباد میں رہنے کی خواہش کی تھی، جس کو ریاض صاحب نے ٹال دیا۔

مہاراجا سرکشن پرشاد ریاضؔ سے خالص محبّت اور عقیدت رکھتے تھے اور بے حد خواہش مند تھے کہ ان کو جیب وگریباں بناکر اپنے ساتھ رکھیں، مگر ریاضؔ مرحوم اتنے بے طمع اور قانع تھے کہ مہاراجا صاحب محمود آباد کی اولش نوازی اپنے لیے کافی سے زیادہ سمجھتے رہے۔"

نتیجہ!

اس استغنا سے ریاضؔ نے بے شبہہ اپنی شان قائم رکھی۔ اپنے تئیں گرنے نہیں دیا، لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ریاض الاخبار بند کرنے کے بعد سے ان کی ساری زندگی تمام تر پریشانیوں، ہجومِ افکار اور مالی دُشواریوں کا تکلیف دہ مُرقّع تھی۔ انھوں

نے جس مسرت، لیکن جس استقلال، عزیمت اور خودداری سے اپنی زندگی کے دن تیر کیے، دوسرے اس کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔
ریاض کے دیرینہ آشنا اور عزیز دوست قاضی تلمذ حسین صاحب نے کتنی سچی بات کہی :-
" ریاض الاخبار کے بند ہونے کے بعد حضرت مرحوم کے وسائلِ آمدنی بہت ہی محدود ہو گئے تھے۔ انھوں نے اپنی عمر کے آخری ۲۵ سال جس عسرت اور ساتھ ہی جس خودداری سے بسر کیے، وہ ان کی زندگی کا ایک ما بہ الامتیاز واقعہ ہے!"

(۲۰) دورِ پیری!

وہی شباب کی باتیں وہی شباب کا رنگ
تجھے ریاض بڑھاپے میں بھی جواں دیکھا!

ریاض ان قسمت ور لوگوں میں تھے جن کا بڑھاپا بھی بڑا شان دار تھا، وہ اگرچہ اپنے بڑھاپے میں جوانی کے ماتم گسار تھے۔

ریاض اب کہاں وہ جوانی کا عالم
گلے سے لگاتے جوانی جو ملتی!

لیکن جوانی کی یہ مرثیہ خوانی واقعی نہیں تھی، وہ بڑھاپے میں بھی جوان تھے، جوان رہے، جوان مرے، بڑھاپا اگر نام ہو بالوں کے سفید ہو جانے کا، چہرے پر جھرّیوں کے پڑ جانے کا، عمر کے زیادہ ہو جانے کا، تو ریاض بے شک بوڑھے تھے، اس لیے

کہ وفات کے وقت ان کی عمر ۸۱ سے متجاوز تھی، لیکن اگر جوانی نام ہے زندہ دلی، خوش مزاجی اور بے فکری کا تو ریاضؔ پر کبھی بڑھاپا نہیں طاری ہوا، ان میں اور بڑھاپے میں ہمیشہ وہ نسبت رہی جو دو متوازی خطوں میں ہوتی ہے۔ متوازی خط کبھی ایک دوسرے سے نہیں مل سکتے۔ ریاضؔ اور بڑھاپا، یہ دونوں متوازی خط تھے جو ہمیشہ ایک دوسرے سے جُدا رہے۔

بچّوں کا مجمع ہو تو وہ بالکل بچّہ تھے، ان کا لڑکا پتنگ اُڑاتا تھا، آپ اسے داؤ پیچ بتاتے تھے، اسے شطرنج کا شوق ہوا، آپ نے اسے ایسے ایسے "قلعے" بنانا سکھا دیے کہ بڑے بڑے شاطر اس بچّے سے مات کھا جاتے تھے۔ پتنگ کی ڈور، مانجھے اور اقسام پر ایسے "بصیرت افروز" معلومات پیش کرتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی۔

جوانوں کی مجلس ہو تو وہ بالکل جوان بن جاتے تھے۔ بڑھاپے نے اُن پر افسردگی نہیں طاری کی تھی، بزمِ جواناں میں وہ بلبلِ ہزار داستان کی طرح چہچہاتے تھے، وہ طوطیٔ شیریں مقال کی طرح اپنی ترنّم ریزیوں سے محظوظ کرتے تھے، وہ ایک شیوا بیان داستان گو کی طرح زندگی کے معرکے، عشق کی رزم آرائیاں، حُسن کی شیوا طرازیاں، عِلم اور ادب کے افسانے بیان کرتے تھے۔ ان کے افسانوں میں یاس و قنوط کا رنگ نہیں جھلکتا تھا، شکست خوردگی اور احساسِ کم تری کا جذبہ نہیں پیدا ہوتا تھا، بے مائگی اور ہیچ میرزی کی کیفیت

نہیں طاری ہوتی تھی۔ ان کے افسانے، ان کے قصے، ان کے واقعات ولولہ انگیز ہوتے تھے۔ سُنیے تو پُر لطف، سوچیے تو حیات آفریں، اُن کی مجلس کا بیٹھنے والا پست ہمت نہیں بلند حوصلہ ہو جاتا تھا، لوگ بُجھے ہوتے دل اور ٹوٹی ہوئی اُمید اور ہارے ہوئے حوصلے کے ساتھ ان کی مجلس میں آتے تھے مگر مُسکراتے ہوئے، رزم ہستی میں معرکہ آرائی کا جذبہ لیے ہوتے ان کا سامنے اور ان کے سے واقعات سے دو چار ہونے کا سودا لے کر اُٹھتے تھے۔

جب ان کی وفات ہوئی، مَیں روزنامۂ خلافت کا ایڈیٹر تھا، ان کی وفات پر مَیں نے ایک مقالۂ افتتاحیہ لکھا تھا:۔

"آج خم خانۂ ادب کے جرعہ نوش وقفِ ماتم ہیں کہ ان کا ساقیِ دریا دل چل بسا، بزمِ اُردو سوگ وار ہے کہ اس کا سرپرست اُٹھ گیا۔ اقلیمِ سخن سُونی ہے کہ اس کا تاج دار کُنجِ لحد میں پہنچ گیا۔ آہ! موت کے بے رحم ہاتھوں نے وہ شخصیت چھین لی جس کا کوئی جواب نہیں۔ ریاضؔ بزم نوشیں کا وہ آخری جرعہ کش اب اس عالم میں پہنچ گیا جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔

صبح تک وہ بھی نہ چھوڑی تُونے اے بادِ صبا
یادگارِ شمع تھی محفل میں پروانے کی خاک!

یہی پیرِ کہن سال ریاضؔ تھا جس کے حضور میں قدیم و جدید ہر طبقے کے سخن شناس خراجِ تحسین پیش کرتے تھے۔ پُرانوں

کے لیے وہ اسیر و امیر کا جانشین، داغ اور جلال کا ہمسر، زبان اور محاورے کا امام تھا، نئے لوگوں کے لیے اس کا کلام زندگی بخش، اس کے خمریات کیف آور اور اس کا اندازِ بیان سحر آفریں تھا۔ کون تھا جو کاشانۂ ریاض کا طواف ادب و عقیدت سے نہ کرتا ہو؟ اگلے لوگوں کی ایک وہی یادگار باقی رہ گئی تھی جسے دستِ اجل نے خاموش کر دیا؛

اک شمع تھی دلیلِ سحر سو خموش ہے!

دنیا آگے بڑھ چکی ہے، زبان میں تغیرات ہو چکے ہیں، بہت سے الفاظ متروک اور بہت سے متروک مستعمل ہونے لگے ہیں، ذوقِ ادب میں کافی تبدیلی ہو چکی ہے، شعر و سخن کا موضوع معیاری ہو چکا ہے، پھر بھی ریاض کو دیکھو وہ اپنی جگہ پر قائم تھا۔ وہ بھی اسے مانتے تھے جن کے لیے زبان سب کچھ ہے، اور وہ بھی اس سے عقیدت رکھتے تھے جو خیالات کی پرستش کرتے ہیں۔ ریاض کی ذات جامع الصفات تھی، وہ قدیم وضع داری کا ایک نمونہ تھا، شعر و سخن کا امام تھا، زبان و ادب کا ماہر تھا۔ علمِ مجلسی میں فرد اور داستانِ سلف کے بیان کرنے میں یگانہ تھا۔ باتیں کرتا تو منھ سے پھول جھڑتے، حاضرینِ مجلس اٹھنا چاہتے اور اٹھ نہ سکتے، وہ خاموش ہوتا تو تمنا ہوتی کچھ اور کہے چاہے ساری رات کیوں نہ بیت جائے!

ریاض کے کارنامے دنیا بھول چکی ہے، مگر تاریخِ ادب نہیں بھول سکتی۔

ریاضؔ گھر سے باہر ایک شیوا بیان شاعر، ایک باکمال نغز گو اور ایک مسلّمہ امامِ لغت تھا۔ گھر کی چار دیواری میں دیکھو تو بچّوں سے محبت کرنے والا، چھوٹوں پر شفقت کرنے والا، اولاد پر جان دینے والا، اعزّہ سے حُسنِ سلوک کرنے والا، سرپرستِ خاندان تھا، اس کی گھر کی زندگی میں نہ رُعب تھا نہ تمکنت، نہ جلال تھا نہ غیر معمولی سنجیدگی، صرف محبّت اور کچھ نہیں!

بچّوں کو کہانیاں سنانا، چھوٹوں کو داستانِ سلف سُنانا، گھر کے نوجوانوں کو دل چسپ واقعات سنانا اور انھی قصّہ کہانیوں میں غیر محسوس طور سے نصیحت و موعظت کے دفتر بیان کرڈالنا، وہاں سے اُٹھتے تو معلوم ہوتا ہم کیا ہیں اور ہمیں کیا ہونا چاہیے۔ اس کی کہانیاں درسِ عمل کی ضامن تھیں۔

خیرآباد کا ویرانہ ہی، گرمی کا موسم ہی، چاندنی رات ہی، شب کو کھانے سے فراغت کے بعد ہم سب چھوٹے باہر کے احاطے میں مجتمع ہوتے ہیں، تھوڑی دیر کے بعد حضرت قبلہ تشریف لاتے ہیں اور ایک آرام کُرسی پر جلوہ افروز ہوتے ہیں، ہم لوگوں کا اصرار ہی کہ وہ اپنی زندگی کے کچھ واقعات سنائیں، اور انھوں نے اپنی حیاتِ کام یاب کی داستان:

سنائی کچھ کہیں سے کچھ کہیں سے!

اندازِ بیان اتنا دل نشین کہ رات نصف سے زیادہ بیت گئی، مگر اپنے اشتیاق کا یہ عالم کہ جب داستان کا ایک باب ختم ہونے کو آیا، دُوسرے کی فرمایش کر دی، لیجیے اب پھر وہی

کوثر کی دُھلی ہوئی زبان ہو اور فضا کا سکوت!

دوسرے ان باتوں کا کیسے اندازہ کر سکتے ہیں۔ اس کا اندازہ تو ہم محرومانِ نعمت کو ہے۔ آہ کوئی ہم سے پوچھے کہ ہم نے کیا کھویا؟ کاشانۂ ریاضؔ ویران ہوگیا، نہیں سارا ہندستان ویران ہو گیا:

شاعری تھی ریاضؔ کے دم تک
اب کہاں لوگ اس طبیعت کے!"

صحت اور قوا

مَیں نے ہوش کی آنکھیں کھولیں تو ریاضؔ کو بوڑھا دیکھا، وہی سن سفید داڑھی، وہی نورانی چہرہ اپنے بچپن سے لے کر ان کی وفات تک مَیں نے جسمانی حیثیت سے ان میں کوئی تغیر نہیں دیکھا۔

عجیب قابلِ رشک صحت تھی۔ یوں معمولی زکام حرارت کی بات دوسری ہو لیکن مَیں نے اپنی زندگی میں انھیں کبھی علیل اور صاحبِ فراش نہیں دیکھا۔ بہ قولِ عقیل صاحب:

"اس ضعیفی میں بھی ان کی صحت کا یہ عالم تھا کہ اپنا پورا دیوان مسودوں سے خود ہی صاف کیا۔ ان سب خطوں کا جواب جو ملک کے ہر گوشے سے ہر روز ان کے نام آتے رہتے تھے، خود لکھتے تھے اور خوش نویسی اور انشا پردازی کے تمام شرائط کے ساتھ لکھتے تھے۔ وہ آخر عمر تک بغیر چشمہ لگائے لکھ لیتے تھے اور چاندنی میں پڑھ سکتے تھے۔"

صرف یہی نہیں ان کے دانت بھی آخر وقت تک سلامت تھے۔ گوشت خوب کھاتے تھے، کبھی پرہیز نہیں کیا۔ کبھی ان کے لیے الگ کھانا نہیں پکا۔ وہی روٹی، دال، گوشت، چاول۔ ہاضمہ اتنا اچھا تھا کہ وقت پر کھانا نہ ملے تو خفا ہو جاتے تھے۔ دن بھر محنت کرنا، رات گئے تک کام کرنا، مکان بنوانا تو دن دن بھر مزدوروں کے سر پر کھڑا رہنا، لکھنؤ جانا تو اسٹیشن تک بالعموم چکّر کے راستے سے پیدل جانا، برسات کے موسم میں اپنے ہاتھ سے اپنی چارپائی اٹھا کر صحن میں ڈالنا اور بغیر کسی کی مدد کے چارپائی کا اُٹھانا اور دالان میں پہنچ جانا، یہ ان کے معمولات تھے اور ان میں وہ جوانوں سے زیادہ چوکس تھے۔ کیوں نہ ہو اس کی وجہ بھی خود ہی بتا دی ہے۔ فرماتے ہیں:-

محتاط ریاضؔ آپ جوانی میں بہت ہیں
پیری میں بھی لوٹیں گے جوانی کا مزا آپ!

یہ حقیقت ہے انھوں نے رندمزاجی اور رنگین طبعی کے باوجود بڑی احتیاط کی زندگی بسر کی۔ یہ اسی کا انعام تھا کہ وہ بڑھاپے میں بھی جوان بنے رہے۔ بالکل یہی حال بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ان کے چھوٹے بھائی سید نیاز احمد صاحب کا تھا۔ انھوں نے تقریباً ۸۵ سال کی عمر پائی۔ لیکن آنکھ کبھی چشمے کی محتاج نہ ہوئی۔ دانت ان کا ایک بھی نہیں ٹوٹا، بدپرہیزی اور بے پروائی کے باوجود ہاضمہ بہت اچھا رہا۔ اصل بات یہ ہے کہ جن لوگوں کی اخلاقی زندگی بے داغ ہوتی

ہے اور جو حدود کے اندر بھی محتاط رہتے ہیں، وہ سو برس کی عمر میں بھی نوجوان ہی بنے رہتے ہیں۔

دِل چسپ بات!

یہ بھی ان کی بہترین صحت کا ثبوت ہے کہ زندگی کے بالکل آخری دور میں ان کی جو اولاد ہوئی، ماشاءاللہ صحت و تندرستی کے اعتبار سے قابلِ رشک رہی۔

نیاز صاحب فتح پوری کے نام ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:-

"۲۰ شوّال کا مضمون نثر میں سُنیے۔ مَیں باہر لکھ رہا تھا، اندر سے پیام آیا، ہسپتال کی دائی کو بُلوا دیجیے۔ آدمی گیا، دائی کے بدلے لیڈی ڈاکٹر آئی۔ ایک گھنٹے کے بعد وہ یہ کہتی ہوئی نکلی "ڈبل فیس" "ایک نہ شُد دو شُد" "بھائی بہن توام!" بچّوں کی تعداد بہ فضلہٖ نصف درجن سے اوپر، مجھے دیکھیے، میری عمر دیکھیے:

اس شیخِ کہن سال کی اللہ رے بزرگی
جنّت میں بھی یہ جا کے جواں ہو نہیں سکتا!"

دونوں بچّے خدا کے فضل سے اب تک موجود ہیں۔ نہ وہ ضعیف تھے، نہ ان کی اولاد ضعیف پیدا ہوئی۔ یہ واقعہ وفات سے کچھ ہی عرصہ پہلے کا ہے!

موت سے بے پروائی!

ہر شخص کو مرنا ہے۔ یہ وہ ناگزیر حقیقت ہے جس سے کسی کو مفر نہیں، لیکن کچھ لوگ وہ ہوتے ہیں جو موت کے دھڑکے سے نیم جان رہتے ہیں اور موت کے آنے سے پہلے کئی دفعہ مر چکتے ہیں۔ اور کچھ لوگ وہ ہوتے ہیں جو اس کا انتظار نہیں کرتے، اپنا کام کیے جاتے ہیں، اسے خاطر میں بھی نہیں لاتے اور جب موت آجاتی ہے تو رخصت ہو جاتے ہیں۔ ریاضؔ اسی آخری گروہ میں تھے، وہ اپنی زندگی کے بارے میں آخر تک پُرامید رہے لیکن جب موت آگئی تو ہنسی خوشی رخصت بھی ہو گئے۔

نشانِ مردِ مومن باتو گویم
چو مرگ آید تبسّم برلبِ اوست!

وہ واقعی ہنستے، مسکراتے، ایک مومنِ صادق کی طرح اس دُنیا سے روانہ ہوئے۔

سفر سے وحشت!

زندگی کے آخری دَور میں ریاضؔ کو چند باتوں سے بہت وحشت ہونے لگی تھی۔ وہ جلسے میں شرکت سے بہت احتراز کرتے تھے۔ مشاعرے میں شریک ہونا انھوں نے بالکل ترک کر دیا تھا۔ سفر سے بھی بہت گھبراتے تھے لیکن مولوی سبحان اللہ خاں

کی کشش انھیں گورکھ پور کے سفر پر، مولوی انعام اللہ خاں اور آخر میں دفتر مرقّع کی جاذبیّت انھیں لکھنؤ کے سفر پر مجبور کرتی رہتی تھی۔ سفر وہ کرتے تھے لیکن بہت بے دلی اور تکلیف کے ساتھ!

بات یہ تھی کہ سفر میں اور بالخصوص دورانِ سفر میں انھیں وہ آرام نہیں ملتا تھا جس کے وہ خوگر تھے اور مستحق بھی تھے۔ یہی وجہ تھی کہ سفر کا نام آیا اور وہ گھبرائے۔

عقیل صاحب کی روایت ہے:۔

"حضرت مرحوم سفر سے بہت گھبراتے تھے۔ برسوں مہاراجا محمود آباد سے ملنے لکھنؤ نہیں جا سکتے تھے۔ حتّٰی کہ مہاراجا مرحوم نے ایک مرتبہ ایک دوست سے یہ تک کہہ دیا کہ "ہیں ریاض کو اور ریاض مجھے آں جہانی سمجھتے ہیں!" حضرت مرحوم نے جب یہ لطیفہ سنا تو کہنے والے سے کہا کہ یہ "طالب اور مطلوب کے راز و نیاز ہیں"!

اسی سفر سے گھبرانے اور مہاراجا کی محبت سے متعلق ایک واقعہ سننے کے قابل ہے:

مہاراجا صاحب محمود آباد ایک مرتبہ لکھنؤ سے کلکتہ تشریف لے جا رہے تھے، حضرت مرحوم اندازہ کر کے ایسے وقت پر پہنچے کہ زیادہ ٹھیرنا نہ پڑے۔ مہاراجا نے اپنے موٹر میں آپ کو بٹھا لیا اور کہا اسٹیشن تک تو چلیے۔ اسٹیشن پہنچ کر مہاراجا ٹرین میں رونق افروز ہوئے اور آپ کو بھی یہ کہہ کر کہ ریل

چھوٹتے وقت اُتر جائے گا، اپنے پاس ہی بٹھائے رکھا۔ گاڑی چل دی اور مرحوم اُتر نہ سکے۔ اسی حالت میں کلکتہ پہنچے وہاں مہاراجا نے خاطر کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ پھر بھی ایک دن پوشیدہ اسٹیشن آئے اور حیدرآباد (واپس) آگئے!"

طرزِ سخن سرائی!

میں کہ چکا ہوں ریاضؔ مشاعروں میں شریک نہیں ہوتے تھے۔ اگر خاص اصرار سے شریک بھی ہو گئے تو کلام ہرگز نہیں سُناتے تھے۔ اس سے انھیں وحشت ہوتی تھی۔

لیکن گھر کے احاطے میں جب بیٹھے ہوں اور مگن ہوں تو کبھی کبھی بے فرمایش بھی اپنا تازہ یا پرانا کلام اپنے مخصوص انداز میں سناتے تھے۔ کبھی احباب کے مجمع میں بھی زبانِ سحرآفریں کو جنبش دیتے تھے۔ پڑھنے کا طرز بہت دل کش تھا۔ ماہرِ موسیقی شعرا کو وہ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ خود بھی اس سے گریز کرتے تھے۔ تحت اللفظ پڑھتے تھے۔ پڑھتے وقت ان کی آواز میں ایک خاص قسم کا شکوہ پیدا ہو جاتا تھا جسے گرج سے مشابہ کہہ سکتے ہیں۔ ہر لفظ الگ الگ، کوئی ناواقف بھی ہو تو اسے شعر کا مفہوم سمجھنے میں دشواری نہ ہو۔

ایک مرتبہ سیّد نیاز احمد صاحب بھوپال سے تشریف لائے ہوئے تھے، ان کے تشریف لاتے ہی ہمارے گھر کا

سنسان احاطہ ایک آباد اور پُر رونق محل سرا میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ ہر وقت ایک جمگھٹ سا رہتا تھا۔ گرمی کا موسم تھا، احاطے میں چارپائیاں اور کرسیاں پڑی ہوئی تھیں، تیس چالیس حضرات موجود تھے۔ ریاض صاحب بھی تشریف فرما تھے۔ سید محمد عسکری صاحب وسیم بھی شریکِ مجلس تھے۔ لوگوں نے نیاز صاحب سے کہا کہ وہ ریاض صاحب سے شعر سنانے کی فرمایش کریں۔ وہ یہ ہمت کہاں سے لاتے۔ کہنے لگے میری بھائی صاحب سے کہنے کی جرأت نہیں پڑتی۔ آخر اسی مجمع سے ایک "وفد" مرتب ہوا اور اس نے بہ صد اصرار و اشتیاق حضرت ریاض سے کلام سنانے کی فرمایش کی۔ اس وقت کچھ خوش تھے، راضی ہو گئے۔ کہنے لگے اگر وسیم اپنا کلام سنائیں تو میں بھی سناؤں گا۔ وسیم صاحب کو غزل سرائی پر آمادہ کرنا کیا مشکل تھا۔ بے چارے ہر شخص کے نیاز مند خصوصی، انھوں نے اس بے ضابطہ مشاعرے کا افتتاح کیا، پھر حضرت ریاض کی باری آئی، اپنے اشعار انھیں یاد نہیں رہتے تھے۔ اندر گئے، چارپائی کے پاس ایک تپائی رکھی تھی، اس پر کچھ منتشر اوراق، قلم (وہی کلک کا) دوات، کچھ خطوط، کچھ اخبار اور رسالے، تپائی کا جائزہ لیا، کچھ کاغذات اُٹھائے اور آکر مجلس میں بیٹھ گئے۔ وسیم صاحب کا دَور چل رہا تھا۔ اور وہ حاضرین سے خراجِ تحسین حاصل کر رہے تھے۔

ریاضؔ کی باری آئی، انھوں نے کاغذات دُرست کیے۔ حاضرینِ محفل سنبھل گئے۔ ریاضؔ کے سننے کا ہر شخص کو اشتیاق تھا آج حسنِ اتفاق سے یہ آرزو پوری ہو رہی تھی۔ ہر شخص ہمہ تن انتظار بنا ہوا تھا۔ ریاضؔ نے "مردانہ ترنّم" کے ساتھ سخن سرائی شروع کی :-

مَو نورِ خدا ہوتی دل عرشِ خدا ہوتا۔
تھوڑی سی جو پی لیتے کیا جانیے کیا ہوتا

ہم جا کے جو بھولے سے مسجد میں اذاں کہتے
بے دستِ برہمن بھی ناقوس بجا ہوتا

دن ہو یہ قیامت کا، ہم ہجر کے مارے ہیں
افسانہ ہمارا بھی تھوڑا سا سُنا ہوتا

خلوت گہِ دل میں تم چُپکے سے جو آجاتے
پردے میں سویدا کے کیا جانیے کیا ہوتا

لُطف آتے اسیری میں ہاں کاش قفس اپنا
پھولوں سے لدا ہوتا پھولوں سے بھرا ہوتا

اچھا تھا مِرے مالک یوں میری گزر جاتی
درگاہ تری ہوتی یہ دستِ دُعا ہوتا

رحمت سے ریاضؔ اس کی نھنے ساتھ فرشتے دو
اِک حور جو بڑھ جاتی تو اور مزا ہوتا!

ریاضؔ پڑھ رہے تھے اور ہر شخص دم بہ خود سُن رہا تھا۔ مقطع کی شوخی نے ایک عجیب سماں پیدا کر دیا تھا۔

غزل تمام ہوئی، ریاضؔ نے کاغذ موڑے لیکن پھر اصرار

ہتوا، آج وہ اصرار کی ہنربرائی پر آمادہ تھے۔ اب جو غزل سُنائی اس کا ایک ایک شعر تیر و نشتر تھا، کیف، اثر، گداز، سوز کی ایک عجیب کیفیت حاضرین پر طاری تھی، چند شعر درج ہیں:-

وہ کون ہے دنیا میں جسے غم نہیں ہوتا
کِس گھر میں خوشی ہوتی ہے ماتم نہیں ہوتا

ایسے بھی ہیں دُنیا میں جنھیں غم نہیں ہوتا
اِک غم ہے ہمارا جو کبھی کم نہیں ہوتا

تم جا کے چمن میں گُل و بلبل کو تو دیکھو
کیا لُطف تہِ چادرِ شبنم نہیں ہوتا

کیا سُرمہ بھری آنکھوں سے آنسو نہیں گرتے
کیا مہندی لگے ہاتھوں سے ماتم نہیں ہوتا

اُڑتی تھی وہ شے، آتی تھیں جنّت کی ہوائیں
اب رِندوں کا جمگھٹ سرِ زمزم نہیں ہوتا

یہ جان کے کیوں روئے گا کوئی سرِ تُربت
سبزے سے جُدا قطرۂ شبنم نہیں ہوتا

یہ شانِ گدا ہے درِ مےخانہ ہے ساقی
بھولے سے وہ ہم بزمِ کے و جم نہیں ہوتا

مایوسِ اثر اشکِ عنادل نہیں ہوتے
مانوسِ اثر گریۂ شبنم نہیں ہوتا

کچھ اور ہی ہوتی ہیں بگڑنے کی ادائیں
بننے میں سنورنے میں یہ عالم نہیں ہوتا

تسکین تو ہو جائے جو تو پھوٹ کے بہ جائے
یہ تجھ سے بھی اے دیدۂ پُرغم نہیں ہوتا
مٹتے ہوئے دیکھی ہے عجب حُسن کی تصویر
اب کوئی مرے مجھ کو ذرا غم نہیں ہوتا

(واقعہ!)

وہ بھی تو مٹے "جانِ جہاں" نام تھا جن کا
یہ نظمِ جہاں پھر بھی تو برہم نہیں ہوتا
کچھ بھی ہو ریاضؔ آنکھ میں آتے نہیں آنسو
مجھ کو تو کسی بات کا اب غم نہیں ہوتا!

ریاضؔ خاموش ہو گئے، لیکن حاضرین کی قوتِ گویائی بھی سلب ہو چکی تھی! مجلس برخاست ہوئی لیکن حسبِ معمول قہقہوں اور چہچہوں کی ترنم ریزیوں کے ساتھ نہیں بلکہ ایک اضمحلال اور افسردگی کے ساتھ!

ایک عرصۂ دراز کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ ریاضؔ نے (وہ مجمعِ احباب ہی سہی) اپنا کلام سنایا!

ڈاکٹر نادم سیتاپوری تحریر فرماتے ہیں:

"میں نے پوچھا کہ اب آپ نے شاعرے کے ساتھ شغلِ شعر و سخن بھی ترک کر دیا؟ فرمایا نہیں تو۔ کل ہی میں نے کچھ اشعار کہے ہیں۔ سنو! میں نے بسم اللہ کہ کر اشتیاقِ سماعت کا اظہار کیا۔ مرحوم نے چیدہ چیدہ متعدد اشعار سنائے۔ ایک شعر یاد رہ گیا جس کی جامعیت محتاجِ بیان نہیں۔ اس شعر کو مرحوم

نے عجب عبرت آگیں انداز میں پڑھا تھا۔ جو اب تک دِل سے محو نہیں ہوا:۔

موت سے بدتر بڑھاپا آئے گا
جان سے پیاری جوانی جائے گی!"

یہ شعر کتنی تلخ لیکن تاباں حقیقت کا سہل ممتنع کے انداز میں اظہار ہے؟

سراپا اور عام عادات

چلتے ہیں جب ریاضؔ تو کچھ جھومتے ہوئے
جیسے پیے ہوئے کوئی مست شراب ہو!

"کچھ جھومتے ہوئے" چلنا ریاضؔ کی وہ ادا تھی جو جوانی اور بڑھاپے ہر دوَر میں قائم رہی۔ ان کی ہر چیز میں ندرت تھی، وضع قطع، لباس، معاشرت، چال ڈھال، کوئی چیز بھی عام لوگوں کی سی نہ تھی۔ سب میں ان کی انفرادیت جھلکتی تھی!

رنگ گورا، قامت کشیدہ، آنکھیں بڑی بڑی، آواز نہ بلند نہ لپشت۔ باتیں بہت بہت سنبھل سنبھل کر کرتے تھے۔ قہقہہ مار کر کبھی نہیں ہنستے تھے۔ ایک ہلکا سا تبسّم ان کی انتہائی خوشی کا مظہر ہوتا تھا، چلتے تیز تھے لیکن "کچھ جھومتے ہوتے!" لکڑی کا سہارا لینے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ رات کو اگر کبھی کہیں جاتے تھے تو احتیاطاً لکڑی ہاتھ میں لے لیتے تھے۔

لباس بہت سادہ استعمال کرتے تھے۔ بڑے پائچے کا پاجامہ

بالعموم قمیص، کبھی کبھی کُرتا بھی پہن لیتے تھے۔ جس زمانے میں تحریکِ خلافت کا شباب تھا اور سارے گھر میں جبری طور پر گاڑھا رائج ہو گیا تھا۔ اس زمانے میں گاڑھے کے کئی کُرتے بنوائے تھے۔

بوٹ جوتا نہیں پہنتے تھے، ہمیشہ پمپ استعمال کرتے تھے۔ آگرہ کے پمپ انھیں بہت پسند تھے۔ کہتے تھے "یہ مضبوط بھی ہوتے ہیں اور خوب صورت بھی!" سید نیاز احمد صاحب جب تک آگرہ میں رہے، ان کے ایجنٹ بنے رہے۔ جب ان کا تبادلہ میرٹھ ہو گیا تو بھی کسی نہ کسی ذریعہ سے منگواتے رہتے تھے۔ آخر میں آگرہ کا التزام ختم ہو گیا تھا۔ خیر آباد یا سیتا پور سے خرید لیتے تھے۔

جاڑے میں ترکی ٹوپی استعمال کرتے تھے۔ گرمی میں بید کی بنی ہوئی گول ہوادار ٹوپی استعمال کرتے تھے، بڑی خوب صورت ہوتی تھی۔ ان کے علاوہ کسی اور کو یہ ٹوپی استعمال کرتے میں نے نہیں دیکھا۔ کنجیوں کا گچھا ہمیشہ کمر بند سے بندھا رہتا، پان کے زیادہ شائق نہیں تھے۔ "تمباکو" کھاتے تھے۔ یہ مخصوص اصطلاح ہے چھالیہ، الائچی، لونگ، کتھا، چونا، تمباکو۔ یہ مجموعہ "تمباکو" کہلاتا ہے!

سگریٹ اور حقے سے کبھی شغل نہیں کیا۔ ممکن ہے جوانی میں پیتے ہوں لیکن میں نے انھیں تفریحی طور پر بھی یہ چیزیں استعمال کرتے نہیں دیکھا۔ منشیات میں سے کسی چیز

سے کبھی سروکار نہیں رہا۔

نماز کے بڑے پابند تھے۔ حتی الامکان مسجد میں باجماعت ادا کرتے تھے۔ باتیں کر رہے ہیں، مجلس جمی ہوتی ہے، مغرب کی اذان سُنی اُٹھے اور "ابھی آتا ہوں" کہہ کر مسجد چلے گئے۔ مسجد گھر سے بہت قریب تھی۔

انگریزی بالکل نہیں جانتے تھے، لیکن ضروری چیزوں کے ترجمے کرا لیتے تھے اور جو کچھ اخذ کرنا ہوتا تھا، اخذ کر لیتے تھے۔ انگریزوں سے خفا بھی بہت تھے۔ وہ پکے مسلمان تھے۔ ہر اس تحریک سے ہمدردی رکھتے تھے جو ہندستان کی آزادی کی ضامن ہو، وطن پرست بالکل نہیں تھے، وطن پرور ضرور تھے۔ اخبارات کا مطالعہ پابندی سے کرتے تھے۔ جالبؔ صاحب مرحوم کے مقالاتِ ادارت بڑی توجہ سے پڑھتے تھے!

رات کو نیند کم آتی تھی۔ دن کو موقع مل جاتا تھا تو ضرور سوتے تھے!

(۲۱) علالت اور وفات

نشۂ مے سے جواں بنتے ہیں پیری میں ریاضؔ
وقت ہے توبہ کریں، اب قبر کا سامان کریں!

یوں تو عرصے سے ریاضؔ بہ قولِ خود "قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے۔ ۱۹۳۶ء میں ندوۃ العلما کے سالانہ جلسے کی شرکت

سے لیے صفی الملک حسام الملک شمس العلما نواب علی حسن خاں صاحب ناظم ندوۃ العلما نے انھیں شرکت کی دعوت دی تھی لیکن وہ تشریف نہیں لائے، ایک معذرتی خط بھیج دیا۔ لکھا تھا:

رات آخر وقت نازک ہو ریاضؔ
لو لگی ہو شمع کی اُمید سے!

لیکن ان کی عام صحت بحمداللہ بالکل اچھی تھی۔ اس واقعے کے آٹھ برس بعد ۱۹۳۴ء میں بھی ان کی عام صحت اور تندرستی کا وہی قابلِ اطمینان عالم تھا۔ انھیں دیکھنے والے کو یہ اندیشہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ اب رخت سفر مکمل ہو چکا ہے اور وہ اس جہان سے رخصت ہونے والے ہیں۔ لیکن جب وقت آ گیا تو صحت اور تندرستی کے باوجود زندگی کا سلسلہ قائم نہ رہ سکا اور ۲۸ جولائی ۱۹۳۴ء کو انھوں نے اپنی جان جاں آفریں کو سپرد کر دی!

ریاضؔ کی جوانی اور بڑھاپے کا تذکرہ جتنا طویل ہے، ان کی علالت اور وفات کا واقعہ اتنا ہی مختصر ہے۔ وہ مشکل سے دو روز بیمار رہے، مشکل سے چند گھنٹے صاحبِ فراش رہے۔ اتنی ہی مدت میں کام تمام ہو گیا۔

اچھے بھلے کھانا کھا کے اُٹھے، دست آتے، وہم بھی نہیں ہوا کہ یہ مرض الموت کا پیش خیمہ ہے۔ کمزوری بڑھ گئی، لیکن ان کی خوش دلی، مصروفیت، ملنے جلنے اور زنانے سے مردانے میں جانے اور لوگوں سے ملاقات کا سلسلہ برابر قائم رہا۔ باتوں

میں وہی شگفتگی اور شیرینی،

حقے میں آگئی ہو جناب ریاضؔ کے
پاکیزگی زباں کی ادائے بیاں کے ساتھ!

جو ان کا مخصوص امتیاز تھا۔

وفات سے چند گھنٹے پیش تر تک وہ باہر جاتے اور لوگوں سے ملتے رہے۔ دفعتاً طبیعت نے پلٹا کھایا، بدہضمی نے تخمے کی صورت اختیار کر لی۔ زبان بند ہو گئی۔ ہوش وحواس آخر وقت تک قائم رہے۔ اشارے سے قلم دوات کاغذ مانگتے تھے، گویا کچھ وصیت کرنا چاہتے تھے لیکن اس کا موقع بھی نہ ملا اور چند لمحوں میں وہ نورانی صورت بے جان ہو گئی۔

یہ خبر آگ کی طرح سارے قصبے میں پھیل گئی۔ لوگ جوق در جوق تعزیت اور تجہیز وتکفین کی شرکت کے لیے آنے لگے۔ خیرآباد کوئی بڑا شہر نہیں، ایک اوسط درجے کا قصبہ ہے۔ پھر بھی آدمیوں کا انبوہ در انبوہ جمع ہوگیا۔ بڑے اور چھوٹے، امیر اور غریب، وضیع اور شریف، ہر طبقے کے لوگ بہ تعدادِ کثیر موجود تھے۔

گھر سے چند قدم کے فاصلے پر خاندانی قبرستان ہے جسے "حظیرہ" کہا جاتا ہے، وہیں اپنے پدر بزرگوار اور دوسرے عزیزوں کے پہلو میں سپردِ خاک ہوئے۔ کل تک جس کی نواسنجیوں سے سارا ہندستان گونج رہا تھا آج وہ دو من خاک کے نیچے ہمیشگی کی نیند سو رہا تھا! آہ!

کل ہم نے تھے آنکھ سے آنسو ٹپک پڑے
بے شمع و گل ریاضؔ کی تربت چمن میں تھی

یہ اتنا بڑا حادثہ تھا جس سے سارا خیرآباد متاثر تھا اور گھر کی حالت تو معرض تحریر میں نہیں آسکتی۔ بچے بوڑھے۔ جوان، مرد، عورت، نوکر، ججمان، خادم سب کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی تھی۔ آج ان کا سایہ اُٹھا تو معلوم ہوا کتنی بڑی نعمت چھین لی گئی، کتنی بڑی دولت ہاتھ سے نکل گئی۔ ان کی غم نصیب اہلیہ کا ماتم، ان کے معصوم اور خورد سال بچوں کی گریہ وزاری، ان کی بھتیجی اور بھانجی کے اشکِ غم، ان کے بھائی اور نواسوں کی، بھتیجوں اور رشتے داروں کی سینہ کوبی، کون سنگ دِل تھا جو یہ منظر دیکھتا اور اس کی آنکھوں سے آنسو رواں نہ ہو جاتے:

آنا ہی یاد اب دلِ مرحوم ای ریاضؔ
بدخواہ وہ کسی کا نہ دشمن کسی کا تھا!

جو کسی کا بدخواہ اور دشمن نہ ہو، جو سب کا دوست اور ہم درد ہو، اس کی موت کس کے لیے دعوتِ ماتم نہ ہوگی۔

حلقۂ احباب میں بھی صفِ ماتم بچھی ہوئی تھی۔ وہ حلقہ آج ایک ایسی ہستی، ایک ایسی شخصیت سے محروم ہو گیا تھا جس کے دم قدم سے رونق تھی، چہل پہل تھی، بزم آرائیوں کا لطف اور مجلس طرازیوں کی لذت تھی ؎

جس انجمن میں بیٹھ گیا رونق آگئی   کچھ آدمی ریاضؔ عجب دل لگی کا تھا

ریاض کی وفات کے بعد ان کے برادرِ خورد سید نیاز احمد صاحب جو زندگی میں ان کے قوتِ بازو تھے، گھر کے بزرگ قرار پائے۔ جو جگہ ان کی وفات سے خالی ہوئی تھی، وہ پُر تو نہ ہوئی لیکن عادات اور صفات کے اشتراک نے وہ گھاؤ بڑی حد تک مندمل کر دیا۔ انھوں نے "بھائی صاحب!" کی جاری کی ہوئی ہر رسم باقی رکھی۔ ان کے کیے ہوئے ہر کام کو نباہا، ان کے قائم کیے ہوئے ہر اصول اور رواج کو قائم رکھا، کچھ دنوں کے بعد ایسا معلوم ہونے لگا نعمت چھنی تو لیکن ایک دوسری نعمت مل بھی گئی۔ اسی طرح آٹھ برس گزر گئے۔ اب معلوم ہوتا ہو آٹھ برس گزر گئے ورنہ کل تک تو ابھی کی بات معلوم ہوتی تھی۔ ایک وہ دن بھی آگیا، جب چھوٹا بھائی بھی بڑے بھائی سے جا ملا، اور بزرگی کی وہ جگہ ایسی خالی ہوئی کہ اب اس پر جو بھی بیٹھے گا، "کبر فی موت الکبرا،" کی معذرت سے اپنا کام شروع کرے گا۔

الہ آباد یونی ورسٹی کے وائس چانسلر پنڈت امرناتھ جھا نے ریاض پر اور ان کی زندگی پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ایک بات خوب لکھی تھی۔

انھوں نے فرمایا تھا:

"ریاض بڑی شان سے بوڑھے ہوئے۔ یہاں تک کہ پکے ہوئے پھل کی طرح آسانی سے ٹوٹ گئے۔ انھیں جھٹکے سے توڑنے کی ضرورت نہیں پڑی۔"

(۲۲) تاثراتِ اَلَم

تُم کہاں لے کے چلے ہو دلِ پُر داغ ریاضؔ
اس کو گُل دستۂ محفل نہ بنائے کوئی!

ادبی دنیا میں ریاضؔ کا ماتم بڑے جوش وخروش سے کیا گیا۔ اُردو زبان کے اخبارات نے تو اس حادثے پر بڑے بڑے مقالات لکھے۔ لیکن دوسری زبان کے اخبارات ورسائل میں بھی ریاضؔ کی وفات پر مضامین لکھے گئے، تعزیتی تجویزیں چھپیں۔

ہندستان کے طول وعرض میں ریاضؔ کا ماتم منایا گیا۔ مشکل سے کوئی بڑا شہر ایسا ہوگا، جہاں تعزیتی جلسے نہ ہوئے ہوں۔ مشکل سے اُردو زبان کا کوئی قابلِ ذکر رسالہ یا اخبار ایسا ہوگا جس نے ریاضؔ کی رحلت پر اپنے تاثراتِ غم والم کا جی کھول کر مظاہرہ نہ کیا ہو اور اس سانحے کو اُردو ادب کے لیے ناقابلِ تلافی نقصان سے نہ تعبیر کیا ہو۔ اس عالمگیر ماتم اور اظہارِ غم سے معلوم ہوتا ہو کہ ریاضؔ کی شخصیت کتنی محبوب اور کتنی مقبولِ عام تھی!

تعزیتی جلسے

ہندستان کے گوشے گوشے میں جو تعزیتی جلسے ہوئے، ان کی تفصیل کے لیے تو ایک دفتر چاہیے۔ البتہ چند خاص

جلسوں کا مختصر تذکرہ کیا جاتا ہے۔

لکھنؤ کی مشہور انجمن "بہارِ ادب" کا ایک جلسہ سید آل رضا صاحب ایڈوکیٹ کی کوٹھی پر حضرت صفی لکھنوی کی صدارت میں منعقد ہوا، جس میں ریاض کی وفات پر ایک ماتمی تجویز منظور ہوئی۔

لکھنؤ کی دوسری مشہور انجمن "سراج الادب" کے اہتمام سے بھی ایک جلسۂ تعزیت منعقد ہوا۔

مرزا پور ہائی اسکول میں گرجا شنکر صاحب اسسٹنٹ ہیڈ ماسٹر کی صدارت میں ایک زبردست جلسۂ تعزیت منعقد ہوا۔

گورکھ پور جو ریاض کا گہوارۂ تمنا تھا، کیوں کسی سے پیچھے رہتا، وہاں شہریانِ گورکھ پور کا ایک عظیم الشان جلسہ ۱۲ اگست ۳۴ء کو راے بہادر نرسنگ راؤ ایم۔ اے۔ ال۔ بی رئیس گورکھ پور کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس جلسے میں ریاض کی زندگی، کیرکٹر، حالات پر بڑی سیر حاصل تقریریں کی گئیں۔ ایک دوسری خصوصیت اس جلسے کی یہ تھی کہ اس میں بعض مشہور مقامی شعرا یعنی مرزا خادم حسین رئیس کپتان گنج، منشی ہری ہردت سنگھ خوشتر رئیس گورکھ پور، منشی بدری پرشاد قمر رئیس گورکھ پور اور بعض دوسرے شعرا نے اپنا تعزیتی کلام بھی سنایا۔

لکھنؤ میں ایک اور تعزیتی جلسہ "جامِ جہاں نما" کے دفتر میں حضرت افقر موہانی کی صدارت میں ہوا۔

بمبئی جیسے دور دراز مقام پر، جسے شعر و سخن سے کچھ زیادہ لگاؤ بھی نہیں ۲۵ ستمبر ۳۴ء کو ایک بڑا تعزیتی مشاعرہ

منعقد ہوا۔ میں اس میں شریک ہوا تھا۔ رات کے دس بجے سے صبح کے چار بجے تک مجلس جمی رہی، حاضرین کی کثرت کا یہ عالم تھا کہ تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ ملک کے مشہور شاعر حضرت محمود اسرائیلی نے اس مشاعرے کی صدارت کے فرائض انجام دیے تھے۔ یہ مشاعرہ "بزمِ مینائی" کی طرف سے منعقد کیا گیا تھا۔ عبدالرحمٰن اسٹریٹ کے میمن جماعت خانے واقع ملالی بلڈنگ میں یہ مشاعرہ ترتیب پایا تھا۔

ایک خصوصیت اُس مشاعرے کی یہ تھی کہ ملک کے طول و عرض سے درجنوں قطعاتِ تاریخ بھی موصول ہوئے تھے۔ جن میں حضرت جگر بسواتی، جناب احسن مارہروی، مولانا سیماب اکبرآبادی وغیرہ کے قطعات خاص طور پر قابلِ تذکرہ ہیں!

مدراس میں تو حضرت مرحوم کے لیے غائبانہ نمازِ جنازہ بھی پڑھی گئی۔ اس طرح کی اطلاعیں بعض اور مقامات سے بھی موصول ہوئیں۔

کلکتہ، الہ آباد۔ لاہور بنارس، جون پور، فیض آباد، رام پور، حیدرآباد، بھوپال، کان پور، بریلی، دہلی، میرٹھ، پشاور اور کشمیر تک سے جلسوں، تعزیتی مشاعروں اور ماتمی تجویزوں کی تفصیلات موصول ہوتی رہیں۔

تعزیت نامے!

وفات کی اطلاع شائع ہوتے ہی تعزیت ناموں کا

سلسلہ شروع ہوگیا۔ اطراف واکناف ہند سے بلا مبالغہ سیکڑوں تعزیتی خطوط اور تار موصول ہوتے ہوں گے۔

والدہ چاہتی تھیں اس حادثے کی اطلاع مجھے نہ دیے۔ میں پردیس میں ہوں، پریشان ہوں گا۔ لیکن یہ چیز ان کے روکے تو رُک نہیں سکتی تھی جس روز یہ حادثہ پیش آیا، گھر سے تو مجھے کوئی اطلاع نہیں ملی لیکن لکھنؤ سے میرے عزیز دوست مولانا محمد عمران خاں ندوی (فاضلِ ازہر) نے بہ ذریعۂ تار تعزیت کی۔ دوسرے تیسرے دن "حقیقت" آگیا اس سے پوری تفصیل معلوم ہو گئی۔

تمام تعزیتی خطوط اور تار درج نہیں کیے جا سکتے لیکن چند کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ یہ تاثرات زیادہ تر ان لوگوں کے ہیں جو مرحوم کے گہرے دوست تھے یا ان کے قدردان تھے۔ ان تعزیت ناموں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ لکھنے والے کے تاثرات کے ساتھ ساتھ ریاضؔ کی شخصیت کے بعض مستور جلوے سامنے آجاتے ہیں۔

فصاحت جنگ جلیلؔ نے اپنے تعزیت نامے میں حضرت مرحوم کے صاحب زادے کو لکھا:

"حضرت ریاضؔ کا واقعۂ رحلت معلوم ہوا، غم والم کا آسمان ٹوٹ پڑا، حواس جاتے رہے، افسوس اور ہزار افسوس کہ ہندستان کا ایسا باکمال شخص اُٹھ گیا۔ جس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ شاعری کا آفتاب غروب ہوگیا!"

ملک حبیب احمد صاحب سابق وزیرِ اعظم خیرپور سندھ نے نیاز احمد صاحب کے نام اپنے ایک تعزیتی خط میں تحریر فرمایا:

"ریاضؔ مرحوم کا ماتم تمام ہندستان کرے گا۔ فطرت ایسے لوگ پیدا کرنے میں بہت بخیل واقع ہوتی ہے۔ صدیوں کے بعد زمانہ ایک آدھ شخص ایسا پیدا کرتا ہے کہ حال و مستقبل اس کے ماتم میں سوگ وار ہو جاتے ہیں۔ اللہ اللہ آسمانِ علم و ادب کا کیسا درخشندہ ستارہ آنِ واحد میں غائب ہو گیا!"

چودھری شفیق الزّماں اور ریاضؔ طالب و مطلوب کی حیثیت رکھتے تھے۔ چودھری صاحب نے تعزیت نامے میں لکھا:

"پانیر میں یہ خبر پڑھ کر سکتہ ہو گیا۔ میرا تو یہ حال ہے جیسے موئے پر سو دُرّے۔ دُنیاوی زندگی عرصے سے ختم کر چکا، مگر اپنے ریاضؔ کے تعلّقات سے وابستہ تھا!"

مولوی انعام اللہ خاں منصرم کمشنری لکھنؤ سے بھی ریاضؔ کے بڑے گہرے عزیزانہ تعلّقات تھے۔ موصوف نے تعزیت نامہ تحریر فرمایا:

"بلبل ہے غم سے نالاں گُل چاک چاک دامن
اُٹھ چلیے اس چمن سے، یاں کی بُری ہوا ہے

میں نے نیشنل کال، دہلی میں حضرت ریاضؔ کی دائمی مفارقت دیکھ کر جو صدمہ اُٹھایا اس کا اظہار رسمیات عرفیہ سے متصوّر ہو گا۔ کیا کہوں میرا حال کیا ہوا؟ اب اُردو لٹریچر یتیم ہو گیا۔

اس فرشتہ صفت بزرگ کی نورانی صورت ہر وقت آنکھوں میں پھرتی ہے۔ کبھی کوئی صدمہ کسی دوست، آشنا، عزیز، قریب کی وفات کا میرے استقلال پر غالب نہیں آیا مگر حضرت ریاضؔ کی وفات کا صدمہ غالب آیا اور میں مغلوب ہو گیا۔ جب تک موت نہ آئے گی، بن جیے نہ بن پڑے گی۔ کاش ایک مرتبہ اپنی زندگی میں حضرت کے مزار ہی کی زیارت نصیب ہو جائے اور بس میں اپنی حالت کیا عرض کروں:

رعشہ ہے تن بدن میں ضعیفی ہے جوش پر
پیری کی ہے بہار کہ جھونکے خزاں کے ہیں!"

مولانا سید سلیمان صاحب ندوی نے راقم الحروف کو تحریر فرمایا:

"اخبارات سے حضرت ریاضؔ کی وفات کی خبر معلوم ہوئی۔ آپ کو اور آپ کے خاندان کو اس سے جو صدمہ پہنچا ظاہر ہے۔ خود دُنیائے سخن سے اس کا مسلّم تاج دار رخصت ہو گیا۔ افسوس اس کا ہے کہ ان کی زندگی میں اُن کا کلام نہ شائع ہو سکا۔ مرحوم آپ کے خاندان کے سرتاج تھے۔ مجھے امید ہے اسے یہ تاجِ عزّت آپ کی بدولت پھر حاصل ہو گا۔ شرط اپنے کام میں لگا رہنا اور دُھن کا پکّا ہونا ہے۔

مجھ سے مرحوم سے کئی بار ملاقات ہوئی۔ ان کے شاعرانہ فضائل کے ساتھ ان کے اخلاقی محاسن بھی کچھ کم نہ تھے۔ معارفؔ میں ان کی وفات پر ایک مختصر سا شذرہ نُبیرۂ قلم

ہوا ہے۔ چاہتا ہوں کہ آپ ان کی سوانح اور شاعری پر ایک مفصل مضمون معارف میں لکھیں!"

حضرت مرحوم کی وفات پر برادر محترم سید عقیل احمد صاحب نے مجھے ایک مکتوبِ غم لکھا تھا:-

"میں تمھیں یہ سطریں لکھ رہا ہوں اور ان کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہے۔ وہ ان کی پیاری پیاری اور دل پر اثر کرنے والی باتیں، وہ ان کی دلچسپ و دل کش عجیب آپ بیتی، وہ اُن کے عالمِ جوانی کے رندانہ مگر اولوالعزمانہ کارنامے، وہ اُن کے عالمِ ضعیفی کے نوجوانوں کو شرمانے والے حوصلے، وہ اُن کی ہمت، وہ اُن کا استقلال، وہ ان کی ادب و شعر پر تقریریں، جن کے درمیان اسیر سے لے کر آمیر تک اور مصطفےٰ آباد (رام پور) سے لے کر حیدرآباد کی خود ان کے مُنھ سے کھینچی ہوئی اور بولتی ہوئی تصویریں، وہ ان کی واقفیت اور سیاست جو سرسیّد تا محمد علی خود ان کی آنکھوں کی دیکھی ہوئی، اس لیے سمجھی ہوئی بلکہ برتی ہوئی، وہ اُن کی خندہ روئی اور شگفتہ خوئی، وہ ان کی گفتگو جیسے ساون کی جھڑی، وہی ہلکا ہلکا تاہم تدبھم دل کو ٹھنڈک، رُوح کو تازگی بخشنے والا اثر، طبیعت کیسی ہی منغص ہو، مزاج کیسا ہی مضمحل ہو، ان کا سامنا ہوا اور افسردگی و پژمردگی شگفتگی اور خندیدگی سے بدل گئی!

تم آؤ گے تو دیکھو گے وہی گھر ہے اور وہی گردو فر، وہی تخت ہے اور اس پر وہی ان کا گاگ کا قلم اور مصطفائی روشنائی

وہی منتشر بے لکھے اوراق ہیں اور وہی کہیں کہیں کچھ لکھے ہوئے کاغذ، وہی قم قم ہو وہی انجم، وہی انجمن ہو وہی نجم، وہی شمع ہو وہی قمر، وہی کہکشاں ہو وہی نیلوفر، وہی غنچہ ہو وہی غنیا (حضرت مرحوم کے بچّوں، بچیوں، نواسوں اور نواسیوں کے عرفی نام!) یہ سب اعضا و جوارح تو موجود ہیں مگر رُوح نہیں!

" ریاضؔ افسوس تم گھر میں نہیں ہو"

" وہی گھر ہو، وہی سامان سب ہو!"!

ان حضرات کے علاوہ قاضی سر عزیز الدین وزیرِ اعظم ریاست دتیا، جناب وصلؔ بلگرامی، حاجی اصطفا خاں مالک کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجرِ عطر، خواجہ عبدالرؤف عشرتؔ، لالہ بم بہادر شاہ اور گورکھ پور کے بہت سے عمائد و شرفا کی طرف سے مکاتیبِ تعزیت موصول ہوتے!

(۲۳) سرشکِ غم!

مرثیے، قطعاتِ تاریخ!

بہت نہ رونے پہ یہ نہ سمجھو کہ کم ہو جوشِ سرشک دل میں
یہ آنسوؤں کی کمی نہیں ہو، رعایتِ ظرفِ آستیں ہو!

ریاضؔ کی موت:

عجب اک سانحہ سا ہو گیا تھا!

مقرّروں نے تقریریں کیں اور خطابت کے دریا بہا دیے، انشا پردازوں نے خیالات لکھے اور سوز و گداز کی ایک نئی دنیا بسا دی۔ شعرا نے مرثیے اور قطعات تاریخ لکھے اور اپنے تاثراتِ غم والم کا مظاہرہ کیا۔ ان کی شخصیت ایسی ہی ہمہ گیر اور وسیع الاثر تھی۔

اگر سب مرثیوں کو اور قطعات تاریخ کو جمع کیا جائے۔ تو ایک اچھا خاصا "ریاضِ سخن" مرتب ہو سکتا ہے۔ مگر نہ اتنا موقع ہے نہ گنجایش اور غالباً ضرورت بھی نہیں۔ پھر بھی اس نوع کلام کا تھوڑا سا حصّہ درج ذیل کیا جاتا ہے:-

مولانا صبغۃ اللہ صاحب شہید انصاری فرنگی محلی:-

گزشت دورِ سرور و نشاطِ شعر و سخن
چو جانِ خویش بہ جاں آفریں سپرد ریاضؔ
کشید جام فنیٰ کل من علیہا فان
حیاتِ پیری خود تلخ چوں ثمرِ دریاضؔ
خموش گشت صراحی و سرنگوں ساغر
تمام رونقِ مے خانہ ہائے بردریاضؔ
نہ ماند لذّت شرب مدام و بادۂ ناب
شہیدؔ جام و سبو نہ کہ "حیف مردریاضؔ"

۱۳۰۵۳

جناب حنیف اعظم گڑھی:۔

وہ مستِ بادۂ عرفاں وہ نغمہ سنجِ بہار

وہ عندلیب غزل خوانِ بوستانِ جہا

چراغِ محفلِ علم و ہنر جناب ریاضؔ

وہ ذی کمال و امامِ سخن ورانِ جہا

کلام وہ کہ فصاحت ہو جس پہ خود صدقے

زبان وہ کہ کریں رشک جس پہ اہلِ جہ

وہ حسنِ معنیِ رنگیں وہ شوخیِ مضموں

خجل ہو دیکھ کے جس کو جمال روئے بتا

وہ جس سے محفل علم و ادب کی تھی رونق

ہوا ہے جا کے وہ زینت فضائے باغِ جنا

سرِ حیات ہو صدقے تو ہے یہ سالِ وفات

"ہزار باغ سخن"۔ "وہ ریاضؔ سحر بیاں"

۱۳۵۳ ۱۹۳۴

مولانا کیفیؔ چڑیا کوٹی:۔

دریغا ہیضہ کردہ جاں سپردہ بیا مرزد خدا را او برحمت

سخن دان و سخن فہم و سخن سنج سخن را بود ازو صد گونہ عزت

نہ مُرد اُو، مُرد نظم شعر گوئی نہ شد اُو، شُد کمال حسنِ فطرت

مسیحی سال رحلت گفت کیفیؔ

ریاضؔ با وفا شُد سوئے جنت!

۱۹۳۴

خان بہادر حاجی غلام محمد خاںؔ رئیس دادوں (علی گڑھ) ریاضؔ کی وفات کے وقت مدینہ منورہ میں تھے۔ وہاں انھوں نے حضرت مرحوم کے لیے ختمِ کلام مجید کرایا اور وہیں یہ قطعہ تاریخ کہا:-

کیوں یہ ماتم جہاں میں بے حد ہو غمِ مرگِ ریاض احمد ہو
ہو نہ ہو یہ جنت الفردوس مدفنِ پاک آلِ احمد ہو
روح افزا غلام حافظ کی جلوہ گاہِ ریاض احمد ہو

لکھ دو تاریخ ان کے مرقد پر
لالہ زارِ ریاض احمد ہو

۱۳ ھ ۵۳

حاجی اصطفا خاں مالک کارخانہ "اصغر علی محمد علی تاجرِ عطر" لکھنؤ:-

حیف اب لطفِ مے کشی نہ رہا ہو گئی ہو خزاں بہارِ ریاضؔ
۱۹ ۶ ۳۴
چرخ ہی نے اٹھایا آخرکار نہ اٹھا اُف زمیں سے بارِ ریاضؔ
۱۹ ۶ ۳۴
نکلے بے ساختہ نہ کیوں کر آہ کہ خزاں دیدہ ہو بہارِ ریاضؔ
۱۹ ۶ ۳۴

اصطفا اب فلک کو چین آیا
آہ جب بن گیا مزارِ ریاضؔ

۱۳ ھ ۵۳

سید عنایت علی صاحب بُرہان پوری :-

رفت سُوئے عدم ریاض احمد

۱۹ ۶ ۳۴

تا کجا ہجر، تا کُجا فریاد

۵۳ ھ

جناب طالب رئیس و آنزیری مجسٹریٹ گورکھ پور :-

"حافظ ہند گئے خلد کو انا ﷲ"

۱۹ ۶ ۳۴

جناب عبدالشاہد خاں شروانی :-

"چراغِ ادب ہند کا گُل ہوا

۱۳ ھ ۵۳

ڈاکٹر نادم سیتا پوری :-

"بہار بزم ادب حضرت لسان الملک"

۱۹ ۶ ۳۴

---

(۲۴) یادگار

ریاض خاکِ درِ مے کدہ تھا جیتے جی
فنا کے بعد اسے خلد آشیاں دیکھا!

مسلمان قوم میں جب کوئی بڑا آدمی اس دُنیا سے اُٹھتا ہے تو سینہ کوبی اور نوحہ خوانی کا جہاں تک تعلق ہے، حق ادا

کر دیا جاتا ہو۔ لیکن اس سلسلے میں کسی ٹھوس اور تعمیری کام کی توقع رکھنا از قبیلِ ناممکنات ہو۔

جس قوم نے اپنے سیاسی لیڈروں اجمل خاں اور علی برادران جیسے زعیموں کی یادگار نہیں قائم کی وہ علم و ادب کے تاجداروں کی یادگار کیا قائم کرے گی۔ میر جیسے شہنشاہِ سخن کا مزار سنتے ہیں کہ لکھنؤ میں ہو۔ کہاں ہو یہ بڑے بڑے ماہرینِ آثارِ قدیمہ کو بھی نہیں معلوم۔ غالب کی قبر تو دہلی میں موجود ہو لیکن:

بر مزارِ ما غریباں۔ نے چراغے نے گلے
نے پرِ پروانہ سوزد نے صدائے بُلبُلے

کی شکوہ سنج۔ مومن کے متعلق دہلی کے مشہور واعظ مولانا احمد سعید صاحب کا بیان ہو:۔

"مرزا غالب کے متعلق مشہور ہو کہ وہ اپنا تمام دیوان مومن خاں کے ایک شعر پر قربان کرنے کو آمادہ تھے۔ اس میں شک نہیں کہ مومن خاں بڑے قابل آدمی تھے۔ بے مثل شاعر تھے اور علمِ نجوم و جفر میں تو ان کا کوئی جواب ہی نہیں تھا۔ اگر تم دہلی آؤ تو میں تمھیں دکھاؤں، وہ محل کلاں میں رہتے تھے۔ میرے مکان سے بہت قریب جگہ ہو۔ اگرچہ آج کل وہاں اُپلوں کی منڈی ہو، روز صبح کو اُپلے بیچے جاتے ہیں"۔ (الجمعیۃ ۹ اگست ۳۴ء)

جب میر، غالب اور مومن کا یہ حال ہو تو ریاض کی اگر کوئی مادی یادگار نہ قائم ہوئی تو مقامِ حیرت نہیں۔

ریاض کی وفات کے بعد ان کی "یادگار" کا مسئلہ اُٹھا

تھا۔ متعدد اخبارات نے تائیدی مقالات بھی لکھّے تھے۔ لیکن عملاً اس سلسلے میں کچھ نہ ہوسکا۔ ریاضؔ جب خود اپنی مجسّم اور زندہ یادگار رہتے ہوئے تھے۔ اس وقت جب ان کی قوم نے ان کی قدر نہ کی تو پسِ مُردن اگر سرد مہری کا مظاہرہ ہوا تو تعجّب کی کیا بات ہے؟

لکھنؤ کے روزنامہ "حقیقت" نے ریاضؔ کی وفات کے تقریباً ڈیڑھ مہینے بعد ۱۵ اگست ۳۴ء کے اداریے میں لکھا تھا:۔

"مسلمانوں میں جب کوئی بڑا شخص مرتا ہے تو عموماً اس کی یادگار قائم کرنے کی تحریک کی جاتی ہے۔ مگر دیکھا تو یہ جاتا ہے کہ اس قسم کی کوئی تحریک کبھی شرمندۂ عمل نہیں ہوتی۔ تھوڑے دنوں تو بڑی گرما گرمی رہتی ہے اس کے بعد سنّاٹا ہو جاتا ہے اور پھر مرنے والے بزرگ کو اِس طرح فراموش کر دیا جاتا ہے کہ گویا اس کی یادگار قائم کرنے کی تحریک ہی نہیں ہوئی تھی۔ حضرت ریاضؔ خیرآبادی مرحوم کی یادگار قائم کرنے کی تجویز کا بھی یہی حشر ہوتا معلوم ہوتا ہے!"

چناں چہ یہی ہوا!

قوم کا کیا ذکر، اس معاملے میں ان لوگوں نے جو ان کے جاں نثار تھے، عقیدت کیش تھے، ان سے ربط اور تعلق رکھتے تھے، پورے سکوت سے کام لیا، جب وہی لوگ مردِ میدان بن کر آگے نہ بڑھے تو قوم سے کیا شکایت ہوسکتی ہے!

حِصّہ سوم

خصوصیّات وممیّزات

(۱) رِیاض کی نثر نگاری

رِیاض جس طرح ایک بلند پایہ شاعر تھے اسی طرح ایک عالی مرتبہ انشا پرداز بھی، نثر نویسی اور شعر گوئی کا کمال ایک شخصیت میں کم جمع ہوتا ہے۔ ایک بہترین شاعر انشا پردازی کے میدان میں دو قدم بھی نہیں چل سکتا۔ ایک کام یاب نثر نویس شعر و شاعری کے راستے پر اگر گام زن بھی ہوتا ہے تو گرتا پڑتا۔ رتن ناتھ سرشار اور عبدالحلیم شرر کتنے غضب کے انشا پرداز تھے لیکن تخلّص کے سوا ان کی شاعری کی یادگار اور کیا ہے ؟ حکیم ضامن علی جلال اور نوّاب مرزا داغ کس پائے کے شاعر تھے۔ لیکن نثر کی دنیا میں انھیں کون جانتا ہے ؟

لیکن رِیاض اس کلّیے سے مستثنیٰ تھے۔ جس طرح ان کی شاعری زبان و بیان، شوخی و شرارت، طرزِ ادا اور ندرتِ خیال کا بہترین نمونہ تھی ؛ اسی طرح ان کی انشا پردازی، ان کی شوخ نگاری، ان کی ٹھوس اور مدلّل تحریر بھی اپنا جواب

نہیں رکھتی تھی۔ انھوں نے جب شاعری کے میدان میں قدم رکھا تو پیش رووں کو پسِ رو کر دیا۔ اسی طرح جب انھوں نے ناوِل نگاری، صحافت اور انشا پردازی کی طرف توجّہ کی تو نہ صرف یہ کہ بڑے بڑوں سے ہیٹے نہیں رہے بلکہ بُہتوں سے آگے نکل گئے۔

ریاؔض کی انشا پردازی کا ایک خاص وصف یہ تھا کہ وہ بہ یک وقت ایک شگفتہ قلم انشا پرداز، ایک ماہرِ سیاست صحافی اور ایک بلند مرتبت "منشی" تھے۔ حالاں کہ یہ ہر سہ خصائص بھی ایک شخص میں مشکل سے جمع ہوتے ہیں۔ شرؔر بہت بڑے ناول نویس تھے۔ لیکن مولانا محمد علی کے ہمارؔد میں وہ ذرا بھی نہ چل سکے۔ سیّد جالؔب کتنے کام یاب صحافی تھے لیکن واقعہ نگاری اور داستان گوئی میں وہ شرؔر کی گرد کو بھی نہیں پہنچتے۔ ایم۔ مہدی حسن افادی الاقتصادی کتنے اچھے منشی تھے۔ لیکن نہ ناول نویس تھے نہ "صحافت رقم!" اب ریاؔض کو دیکھیے تو وہ سب کچھ تھے۔ صحافی اتنے بہتر کہ ریاض الاخبار کے ڈنکے بجا دیے۔ ناول نویس اتنے کام یاب کہ حرم سرا کے اوراق آج تک "سجدۂ صاحب نظراں" بنے ہوئے ہیں۔ "منشی"، اتنے مسلّم کہ اچّھے اچّھے نقّاد ان کی بزرگی کا لوہا مانتے چلے آئے ہیں۔

ریاؔض کی شاعری اگر ان سے کسی طرح چھین لی جاتی تو وہ ایک کام یاب صحافی کی حیثیت سے، اگر انھیں صحافت کی دُنیا سے جلا وطن کر دیا جاتا تو وہ ایک کام یاب ناوِل نویس

کی حیثیت سے، اگر یہ قلم بھی توڑ دیا جاتا تو وہ ایک سحر بیان انشا پرداز کی حیثیت سے زندہ رہتے، کام کرتے اور کبھی نہ مرتے۔ ان کی یہ حیثیتیں اگر سلب کر لی جائیں تو ان کی شاعری انھیں کبھی نہ مرنے دیتی۔ انھوں نے جس موضوع پر قلم اٹھایا اس پر چھا گئے۔ انھوں نے جس شاہ راہِ حیات پر گام فرسائی کی سب سے آگے نکل گئے۔ ان کی ذہانت اور خداداد طبیعت کا یہ کتنا دل چسپ انداز تھا،

واہ کیا رنگ ہے کیا خوب طبیعت ہے ریاضؔ
ہو زمیں کوئی تمھیں پھولتے پھلتے دیکھا!

یہ "زمین" اور "پھولنے پھلنے" کا تعلق صرف شاعری سے نہیں تھا، گل افشانیِ گفتار اور سحر انگیزیِ تحریر ہر دو شعبوں سے تھا۔

ہم ریاضؔ کی نثر نویسی کو چند شعبوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ اور ان پر الگ الگ گفتگو کریں گے۔

صحافت!

شاعری ریاضؔ کی طبیعت کا جزوِ اعظم تھی، لیکن نثر نویسی اور انشا پردازی سے بھی انھیں لگاؤ تھا۔ عنفوانِ شباب ہی سے طبیعت اس طرف مائل تھی بلکہ کہنا چاہیے انھوں نے اپنی زندگی کا مقصد ہی یہ بنا لیا تھا کہ ایک اخبار نویس کی حیثیت سے زندگی بسر کریں۔ انھوں نے شاعری کو ذریعۂ معاش نہ کبھی

بنانا چاہا نہ بنایا۔ ملازمت سے بھی ہمیشہ نفور رہے۔ باپ ایک اعلا سرکاری عہدے پر فائز تھے اسی لیے انھیں فوراً سب انسپکٹر بننے میں دیر نہ لگی لیکن بہت جلد مستعفی ہو گئے اور وہ مشغلہ شروع کر دیا۔ جو انھیں سب سے زیادہ محبوب تھا، یعنی صحافت اور انشا پردازی۔

ریاض الاخبار

جیسا کہ عام خیال ہو ریاض الاخبار پہلے پہل گورکھ پور سے نہیں نکلا بلکہ خیرآباد سے شائع ہوا تھا۔ سنہ ۱۸۷۲ء میں انھوں نے "لمعۂ رخشاں" کے تاریخی نام سے خیرآباد میں ایک مطبع قائم کیا اور ریاض الاخبار جاری کر دیا۔ گورکھ پور تو ۸، ۹ سال کے بعد سنہ ۱۸۸۱ء میں گئے۔ پھر جب وہاں کا مستقل قیام اختیار کر لیا تو ریاض الاخبار وہیں سے نکلنے لگا۔

ریاض الاخبار کا مقابلہ آج کی صحافت سے نہیں کیا جا سکتا۔ اس کو اسی معیار پر دیکھنا چاہیے جو اُن کے زمانے میں رائج تھا۔ اس زمانے کے اخبارات خبریں کم دیتے تھے۔ مقالات، نصائح، ہدایات پر زیادہ توجہ کرتے تھے۔ قصّہ کہانیوں کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔ مقامی حالات اور ملکی سیاسیات پر بہت کم اظہارِ خیال کیا جاتا ہو اور جب یہ جُرأت کی جاتی تھی تو اس کا سختی سے خیال رکھا جاتا تھا کہ نیازمندانہ حدود سے تجاوز نہ ہونے پائے۔ لیکن ریاض الاخبار نے ایک ایک

کر کے ان بندھنوں کو توڑا اور اپنی آزاد خیالی، بے باک گوئی اور بے لاگ نکتہ چینی سے ایک نیا معیار قائم کر دیا۔

ریاض الاخبار اگرچہ ہفتے وار اخبار تھا۔ (شاید کچھ عرصے تک ہفتے میں دوبار بھی نکلا!) پھر بھی اس میں خبروں پر خاص توجہ کی جاتی تھی۔ مقامی حالات اور ملکی سیاسیات پر ریاضؔ کا قلم تیغ جوہر دار کی طرح چلتا تھا۔ وہ نہ حکام سے دبتے تھے نہ امرائے عالی مقام سے، وہ اپنے سامنے ایک اصول رکھتے تھے اور اسی کے ماتحت ان کی نکتہ چینی کا شبدیز ہوا سے باتیں کرتا رہتا تھا۔

گورکھ پور میں جب ریاضؔ نے اقامت اختیار کی اور ریاض الاخبار بھی وہاں سے جاری کیا، اس وقت کی فضا کیا تھی اور ماحول کیا تھا، مقابلہ کن سے تھا اور معرکے کیسے درپیش تھے؟ اسے مولوی سبحان اللہ خاں کی زبان سے سنیے:۔

"منشی ریاض احمد کے ایک عزیز نظام احمد گورکھ پور تشریف لائے۔ باپ سے کچھ روپیہ مار لاتے تھے۔ دونوں نے مل کر ریاض الاخبار جاری کیا۔ گورکھ پور میں ریاض الاخبار، لکھنؤ میں اودھ پنچ اور اودھ اخبار اور دل گداز۔ کان پور میں زمانہ، آگرہ، مراد آباد اور کہاں کہاں انھی ریاض احمد کے ہم عمر لوگوں نے اخبارات جاری نہیں کیے تھے؟ جن میں ریاض الاخبار کا مرتبہ اپنے لٹریچر کے اعتبار سے کسی سے دوسرے نمبر پر نہ تھا۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار مصنف فسانۂ آزاد۔ نثار حسین (پیام یار کے مالک)

سجاد حسین (اودھ پنچ کے اڈیٹر) مولوی عبدالحلیم شرر، سید ناصر علی دہلوی (مدیر صلائے عام) اور معلوم نہیں کتنے یادگار اور ٹھوس لکھنے والے اس وقت کی فضا میں گونج رہے تھے. جب ریاض احمد کا لٹریچر (ریاض الاخبار) اپنی بہاریں دکھا رہا تھا!"

گویا ریاض نے جب صحافت کے میدان میں قدم رکھا تو میدان خالی نہیں ملا۔ بڑے بڑے گھاگھ اور ماڈھ پہلے سے موجود تھے۔ مقابلہ سخت تھا کش مکش پوری تھی پھر بھی وہ میدان میں اُترے اور نہ صرف کام یاب رہے بلکہ بُہتوں سے، جو ان سے کہیں آگے تھے آگے نکل گئے۔

اس کی ایک وجہ مولوی سبحان اللہ خاں کے الفاظ میں یہ بھی تھی:-

"جو خصوصیت ریاض کی انشا پردازی میں تھی وہ یہ تھی کہ کبھی کسی پر ذاتی حملہ انھوں نے نہیں کیا، نہ کبھی عامیانہ اُردو لکھی اور ادبیت کے ایسے پہلو نمایاں کیے کہ لوگ باوجود اخبار کے ساتویں دن نکلنے کے ان کے مضامین پڑھنے کے لیے ایسے بے تاب ہوتے تھے جیسی آج کل روزانہ خبروں کے لیے بے تابی ہوتی ہے!"

ریاض کی وفات پر انھیں خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے مولانا ظفر الملک صاحب علوی اڈیٹر الناظر نے تحریر فرمایا تھا:-

"مرحوم اس دور کے شاعرِ اعظم ہی نہیں بلکہ اخبار نویس اور

انشاپرداز بھی تھے۔ گورکھپور سے برسوں ریاض الاخبار اور فتنہ نکالتے رہے اور "حرم سرا" جیسا قابلِ قدر افسانہ یادگار چھوڑ گئے!"

ریاضؔ کی انشاپردازی اور خوش بیانی دلوں میں گھر کر چکی تھی۔ لوگ ان کے مضامین پڑھنے کے لیے بے تاب رہتے تھے۔ بہ قول مولوی سبحان اللہ صاحب:

"اخبار نکلنے کے زمانے میں ان کی انشاپردازی کا یہ شہرہ تھا کہ لوگ ریاض الاخبار صرف ان کا ایڈیٹوریل پڑھنے کے لیے خریدا کرتے تھے!"

روزانہ تار برقی!

۱۸۷۲ء میں ریاضؔ نے جب "لمعۂ رخشاں" کے نام سے ایک پریس خیرآباد میں قائم کیا اور ریاض الاخبار جاری کیا۔ اسی زمانے کے لگ بھگ انھوں نے جرأتِ رندانہ سے کام لے کر ایک روزانہ اخبار "روزانہ تار برقی" کے نام سے بھی نکالا تھا۔

اس اخبار کے متعلق خود ریاضؔ کا بیان ملاحظہ ہو:۔

"جنگِ روم (ترکی) و روس کے زمانے میں اودھ اخبار لکھنؤ کے سوا کوئی اردو اخبار روزانہ نہ تھا۔ میں نے ایک پرچہ خیرآباد سے موسوم بہ "روزانہ تار برقی" نکالا تھا، جس کی ترتیب اور تار برقی وغیرہ کے تراجم پائنیر اور دیگر انگریزی اخبارات سے محمد نور خاں صاحب رسائی دار (رسالہ دار) و دیگر افسرانِ رسالہ نے انگریزی اور فوجی کلب سے کر دیا تھا اور سیتاپور میں اشاعت اور فروخت کا انتظام مسٹر۔۔۔ ۔۔۔ انسپکٹر لین نے

اپنے ذمے لیا تھا۔ یہ سیتاپور میں جتنے گہرے دوست میرے تھے اتنے ہی دشمن گورکھ پور جاکر بہ زمانۂ سپرنٹنڈنٹی ہوگئے تھے۔ یہ پرچہ کتابی تقطیع کے دو ورق پر چھپتا تھا۔ قیمت ایک پیسے کے دو پرچے مگر سیتاپور اور خیرآباد کے سوا اور مقامات پر ایجنٹ ایک ہی پیسے کو فروخت کرتے تھے۔ زیادہ تر کام کرنے والے احباب تھے۔ بعض کے پاس ریاض الاخبار بھی بلاقیمت جاتا تھا۔

ہر گلی کوچے میں مختلف مقامات پر ذریعۂ پیکٹ کارپردازوں کی معرفت فروخت کے انتظام میں اولیت ریاض الاخبار پریس خیرآباد ہی کو ہے۔ ریاض الاخبار کو ولایتی اور ہندستانی انگریزی اخبارات کے چیدہ اور دل چسپ تراجم جنگ کے متعلق جیسے ملتے تھے، شاید اس وقت کسی دوسرے ہفتے وار اخبار کو نہ ملتے ہوں۔ غازی عثمان پاشا معروف بہ رستم پلونا کی آخری جنگ روس، بلغاریہ، رومانیہ، سرویا سے نار روس کی کمان میں جس تفصیل اور جس شان سے ریاض الاخبار میں چھپی ہے، دیکھنے کے قابل ہے مگر اس وقت کے پرچے اب کہاں؟"

گُل کدۂ ریاضؔ!

ریاضؔ کے ذوقِ کار کو ریاض الاخبار اور روزانہ تار برقی سے تسلی نہیں ہوتی:

کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے!

انھوں نے ۱۸۷۹ء میں خیرآباد سے شعر و سخن کا ایک ماہ نامہ "گل کدہ ریاض" کے نام سے جاری کیا۔ اُردو زبان کا یہ پہلا موقّر اور مستند پرچہ تھا جس میں مشاہیر شعرا اور والیانِ ریاست کی غزلیں طرح پر شائع ہوتی تھیں!

اس زمانے میں شعر و سخن کے جو ماہ نامے (جن کا اصطلاحی نام "گُل دستہ" ہوتا تھا) شائع ہوتے تھے، وہ نثر سے بالکل عاری ہوتے تھے۔ ایک طرح دے دی جاتی تھی اور شعرائے کرام اس پر طبع آزمائی فرماتے تھے۔ ساری غزلیں شائع ہوجاتی تھیں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ ایک طرح چھو چھو مہینے تک چلتی تھی۔

ریاض نے گل کدۂ ریاض نکالا مگر طرزِ عام سے ہٹ کر۔ اسے جس طرح ادبیّت میں شرفِ تقدّم حاصل تھا اسی طرح وہ اپنے انداز میں بھی سب سے نرالا تھا۔

"گُل کدۂ ریاض" کے متعلق ریاض کا بیان یہ ہے:-

"گُل دستوں میں پیامِ یار اور گل چیں نے زیادہ عمر پائی۔ نکلے اچھّے اچھے پرچے۔ خورشید صاحب کا پرچہ بھی، فصیح الملک بھی (جس کا نام غالباً پہلے گُل زارِ خلیل تھا) قنوّج کا پرچہ بھی جس کے مہتمم بھگّو خاں تھے اور باوصفِ اعتباری نام کے مانگتے تھے ہمیشہ پیشگی، سب سے اچّھا دامن گُل چیں تھا جس کے چند پرچے نکلے مگر ہمیشہ کے لیے یادگار، اس کے بند ہوتے ہی مرحوم آقائے سخن وسیم نے یہ کہہ کر:-

گل چینِ بہار تو زداماں گلہ دارد!

گُل چیں نکال دیا۔

اولیّت میں مقبولیت کے ساتھ صرف گل کدۂ ریاض کے سر سہرا رہا۔ ساتھ ہی "غالباً" کہ دُوں تو مضائقہ نہیں، مولانا حسرت موہانی نے اُردوئے معلّٰی نمبر ۱۰ جلد ۱۲، اکتوبر میں "گُل کدۂ ریاض خیرآباد نمبر ۲" عنوان لکھا ہے اس سے پہلے ایک مضمون شوقؔ نیموی مرحوم کے متعلق ہے۔ ساتھ ہی ان کے "اصلاح" نام پرچے کا بھی ذکر ہے۔ بہرحال اصلاح ہو یا کوئی اور پرچہ شرفِ اولیّت گل کدۂ ریاض کو ہے۔ اور پرچے (جن کا ذکر ابھی اُوپر) ہوا بہت بعد کے ہیں۔ فتنوں پر۔ فتنہ گروں پر ترجیح اسی فتنۂ قیامت کو ہے۔

قیامت کی خلش کیوں ہر گھڑی ہے
وہ تُم سے قد میں کم، سِن میں بڑی ہے!

گُل کدۂ ریاض کی خاص خوبی یہ تھی کہ اس میں حتّی الامکان سب شعر منتخب درج کیے جاتے تھے اور اس اصُول کی پابندی اس سختی سے کی جاتی تھی کہ بعض پرچوں میں اسیرؔ سے اُستاد کی غزل کا صرف ایک ہی شعر چھپا ہوا نظر آتا ہے۔ اس وقت تک نمبر کو حِصّہ لکھنے کا رواج تھا مثلاً ۱۸۸۰ء کے اپریل کے پرچے کو "گل کدۂ ریاض حصّۂ چہارم جلد ۲" لکھتے تھے۔

منشی امیر احمد کے متفرق اشعار کا مجموعہ سب سے پہلے

"گوہر انتخاب" موسوم بہ "آب گوہر" کے نام سے بہ طور ضمیمہ اسی گل دستے میں شائع ہوا۔ کچھ دنوں میر تقی میرؔ کے کلیات کا انتخاب بھی اس میں نکلتا رہا۔ رسالۂ "معیار" لکھنؤ نے ایک مقررہ قافیے کے تحت میں کلام شعرا کی اشاعت کا جو طریقہ اختیار کیا اس کی ابتدا بھی "گل کدۂ ریاض" سے ہوتی ہے!

روزانہ تار برقی اور گل کدۂ ریاض سے ریاض کی جولانیِ طبع، بلند حوصلگی اور جرأتِ رندانہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ اُس زمانے میں سارے صوبے میں بلکہ تقریباً ہندستان بھر میں ایک بلند پایہ روزانہ اُردو اخبار "اودھ اخبار" لکھنؤ سے نکل رہا ہے۔ جس کے پاس بہت بڑا پریس ہے۔ وسائل اور ذرائع ہیں، رُپیہ ہے، ساکھ ہے سب کچھ ہے۔ عین اسی زمانے میں انگریزی سے نابلد اور ناواقفِ محض ہونے کے باوجود حضرت ریاضؔ خیرآباد جیسے چھوٹے قصبے سے ایک روزانہ اخبار جاری کر دیتے ہیں اور اس میں ایسی جدّتیں اور شوخیاں بھر دیتے ہیں کہ خلقت ٹوٹ پڑتی ہے۔ ہاتھوں ہاتھ استقبال ہوتا ہے۔ حوصلہ دیکھیے کہ پرچہ صرف مقامی نہیں ہے بلکہ مختلف مقامات پر اس کے ایجنٹ بھی ہیں۔ جدّت ملاحظہ ہو "ایک پیسے میں دو"!

بچپن میں، میں بھائی صاحب سے سُنا کرتا تھا۔ وہ ریاض الاخبار کی کوئی جلد اٹھا کر "ریاض الاخبار ہفتے میں دوبار، پیسے میں تین چار" کا کورس گایا کرتے تھے۔ پھر سمجھ دار ہوا تو خیال ہوا یہ یوں ہی مذاق ہے۔ پھر ریاضؔ کی

آپ بیتی دیکھی اور سُنی تو معلوم ہوا اس قسم کی جدّتیں بھی حضرت ریاضؔ کے خصائص میں داخل تھیں۔ ہندستان بھر میں ایک روزانہ اخبار بھلا "پیسے میں دو" کے حساب سے کاہے کو بکا ہوگا مگر ریاضؔ کی نُدرت آفرینی نے یہ بھی کر دکھایا۔

فِتنہ اور عطرِ فِتنہ!

۱۸۸۱ء میں ریاضؔ خیر آباد سے گورکھ پور گئے اور وہیں کے ہو رہے۔ ریاض الاخبار ابھی وہیں منتقل ہو گیا اور وہ پھلنے پھولنے لگا۔ ریاض الاخبار کے پہلے صفحے پر یہ شعر درج رہتا تھا:

تری اُٹھان ترقی کرے قیامت کی
ترا شباب بڑھے عمرِ جاوداں کی طرح!

جب تک ریاض الاخبار زندہ رہا۔ اسی اٹھان اور اسی شباب کے ساتھ زندہ رہا۔

۱۸۸۳ء میں ریاض الاخبار نے اپنی ادبی جولانیوں کے لیے ایک نیا میدانِ عمل منتخب کیا اور "فتنہ" اور "عطرِ فتنہ" کے نام سے دو ننھے مُنّے اخبار نکال دیے۔

اُردو زبان میں اس وقت صرف ایک اخبار "اودھ پنچ" تھا جو "ظریفانہ" لٹریچر پیش کر رہا تھا۔ اس اخبار نے بڑی شہرت اور بڑا نام حاصل کیا۔ واقعہ یہ ہی کہ منشی سجّاد حسین صاحب بے پناہ لکھنے والے تھے لیکن ان کی ظرافت پھکّڑ بازی کی حد تک پہنچ جاتی تھی جو طبعِ سلیم پر گراں گزرتی تھی۔

ریاض نے فتنہ نکالا اور اس نے ایک بڑی کمی پوری کردی۔
یہ اخبار سنجیدہ شوخی کا بہترین نمونہ تھا۔ نہ پھکڑ بازی، نہ عامیانہ طرزِ گفتگو، نہ سوقیانہ اندازِ نقد، نہ کسی کی دستارِ فضیلت پر رکیک حملے، نہ کسی کی ذاتیات کی نقاب کشائی۔ صرف لطیف طنز، پُرلطف فقرے، برجستہ چٹکیاں۔ بس یہ تھا فتنہ اور عطرِ فتنہ!

اسی خصوصیت کے باعث فتنہ کو بہت جلد قبولِ عام حاصل ہوگیا۔ ہر میز پر، ہر گھر میں، ہر آنکھ کے سامنے "فتنہ" موجود! لیکن یہ ایسا فتنہ تھا جس سے لوگ سراسیمہ اور پریشان نہیں ہوتے تھے۔ محظوظ اور لطف اندوز ہوتے تھے۔ جو لوگوں کے اطمینان اور سکون میں فرق نہیں ڈالتا تھا۔ البتہ انھیں ایک کیف اور سکر سے آشنا کر دیتا تھا۔ لوگ اس دن کا انتظار کرتے تھے۔ جب "فتنہ" کی آمد آمد ہوتی تھی!

مہاراجا سرکشن پرشاد آں جہانی صدرِ اعظم دولتِ آصفیہ حیدرآباد دکن ایک اعلا درجے کے سخن فہم اور سخن سنج ساتھ ہی حد درجہ باذوق اور اُردو زبان سے غیر معمولی شغف رکھنے والی شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے کلامِ ریاضؔ پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ایک جگہ ارشاد فرمایا ہے:-

"ریاضؔ کا کلام ابتدا میں پنڈت رتن ناتھ سرشارؔ (صاحبِ فسانۂ آزاد) کے ذریعے سے مجھ تک پہنچا جو اپنی آخری عمر میں عرصے تک میرے یہاں رہے، اسے تقریباً ۴۵ سال ہوتے۔ سرشارؔ، شاعری میں ریاضؔ کے برادر خواجہ تاشؔ بھی تھے اور

کلام ریاؔض کے دل دادہ بھی۔ ریاؔض کو مجھ سے خاص خلوص تھا۔ کبھی کبھی ان کا خط بھی آتا رہتا تھا۔

ریاض الاخبار بھی عرصے تک میرے پاس آتا رہا جس کو ریاؔض گورکھ پور سے شائع کرتے تھے۔ اس اخبار میں ان کی غزلیں بھی شائع ہوتی تھیں۔ دو رسالے، فتنہ اور عطرِ فتنہ بھی، ریاؔض کے اہتمام سے بہت ہی مختصر تقطیع پر نکلتے تھے۔ ان کے یہ دونوں چھوٹے رسالے مذاقِ سلیم رکھنے والوں میں خاصے مقبول تھے اور ان کے دیکھنے سے ریاؔض کی ذہانت اور خوش مذاقی کا اندازہ ہو سکتا تھا۔ ریاؔض بھی اس ذرا سے فتنہ کی مقبولیت سے واقف تھے۔ چناں چہ کہا ہے:-

فتنہ کو پوچھتا ہے کوئی کس ادا کے ساتھ
چھوٹا سا وہ ریاؔض کا اخبار کیا ہوا؟"

فتنہ جب تک زندہ رہا۔ اپنے حریفوں پر بالا رہا۔ جب ختم ہوا تو بھی اس کی یاد دلوں میں رہ گئی!

صُلحِ کل!

صُلحِ کل ایک روزانہ اخبار تھا جو گورکھ پور سے ریاؔض نے نکالا تھا۔ اس سلسلے میں انھیں غیر معمولی دشواریوں اور تکلیفوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ صلحِ کل کی داستان اختلاف قاضی تلمذ حسین صاحب ایم۔ اے یوں سناتے ہیں:-

"انیسویں صدی کے اواخر بلکہ بیسویں صدی کے اوائل

تک گورکھ پور میں کچھ خوش وقت اصحاب باقی تھے۔ مولوی محیب اللہ مرحوم وکیل ووائس چیرمین میونسپل بورڈ اور بابو موہن سنگھ آں جہانی سکریٹری میونسپل بورڈ ہر بزم کی روح رواں تھے۔ مرحوم مولوی احسان اللہ عباسی مصنّف تاریخِ اسلام وغیرہ کی رائے روشن تمام مہمات امور میں سنّۂ ضروریہ کی طرح لازم تھی۔ منشی چھوٹو لال متوفّی وکیل، اصحاب حل و عقد کے مسلّمہ صدر تھے تبریک کے لیے خان بہادر منشی محمد خلیل مرحوم چیرمین میونسپل بورڈ کی برگزیدہ ہستی سایہ فگن تھی۔ مولوی سبحان اللہ صاحب رئیس کا عنفوان شباب تھا۔ ہر طرح کی مبادرت کے لیے ذات موفور السرور کافی سے زیادہ تھی سب سے بڑھ کر یہ کہ مسٹر سید حبیب اللہ بیرسٹر ایٹ لا گورکھپور میں جائنٹ مجسٹریٹ اور مصالح قومی و ملکی کے لیے وقف تھے۔ جہاں اتنے اصحابِ خبرت و اربابِ فکرت جمع ہوں وہاں کسی اختراعِ دماغی کے بہ روئے کار آنے میں کیا دیر لگتی ہے؟

رزولیوشن پاس ہو گیا کہ ایک کمپنی قائم کی جائے اور ایک روزانہ اخبار نکالا جائے اور منشی سید ریاض احمد صاحب معتمد و موتمن ہوں۔ اگر معاملہ یہیں تک رہتا تو بہ اغلب وجوہ خیریت سے گزر جاتا مگر زمانۂ جدید کی مطابقت اور عاقبت اندیشی کی کسر رہ جاتی لہٰذا قرار پایا کہ کمپنی کی رجسٹری کرا دی جائے۔ رجسٹری ہو گئی کچھ رُپیہ بھی جمع ہو گیا اور اخبار صُلحِ کل کا اجرا عمل میں آ گیا۔

جس شخص نے پولیس کی ملازمت اس طرح کی ہو کہ وردی کبھی نہ پہنی ہو اور ریاض الاخبار کے بقایا کی وصولی کی بہترین تدبیر یہ سمجھتا ہو کہ بقایا نہ وصول ہو گا تو اخبار میں نام شائع کر دیا جائے گا۔ اس پر جب ۲۶ رجسٹروں کی خانہ پُری کا بوجھ پڑ جائے گا۔ تو انجام معلوم؛ ایک پلنگ تھا اور حضرت ریاض تھے۔ اسی پر لکھنا، اسی پر کھانا اور اسی پر سو رہنا، کبھی شب بستر پھیلا لیا، کسی شب یہ بھی نہیں۔ بیمار ہوتے اور سخت بیمار ہوتے۔ ناچار اپنے بھائی سید نیاز احمد صاحب کے پاس فرخ آباد چلے گئے۔ گورکھ پور سے یہ پہلی طولانی غیبت تھی۔ واپسی کے بعد پھر ان کی سابقہ حالت نے عود نہیں کیا!"

بہرحال صلح کل نکلا اور کچھ عرصے تک جاری رہا۔ اس کے اسٹاف میں مشہور صحافی سید جالب صاحب مرحوم (جو بعد میں مولانا محمد علی کے ہمدرد اور مہاراجا محمود آباد کے ہمدم کے ایڈیٹر ہوتے) کچھ عرصے تک کام کرتے رہے۔

ریاض کی صحت اور حالت جب اس بار کے سنبھالنے کی متحمل نہ ہو سکی تو وہ اس سے دست بردار ہو گئے۔ اخبار مولوی سبحان اللہ خاں کی ملکیت میں آگیا اور حکیم برہم مرحوم (جنھوں نے بعد میں مشرق نکالا اور آخر تک اسے کامیابی سے نکالتے رہے!) اس کے معتمد و موتمن قرار پاتے لیکن زیادہ عرصے تک وہ جاری نہ رہ سکا اور بند ہو گیا۔

مہاراجا محمود آباد کا عرصے سے اصرار تھا کہ ریاض لکھنؤ

آجائیں اور اسی شہر کو وہ اپنی ادبی اور صحافی سرگرمیوں کا مرکز بنائیں لیکن ایک عرصے تک وہ اس اصرار کو ٹالتے رہے۔ آخر جب اِصرار حد سے تجاوز کر گیا اور ادھر ریاضؔ کو بھی حالات نے مجبور کر دیا تو ۱۹۰۷ء میں وہ گورکھ پور سے لکھنؤ اُٹھ آئے اور ریاض الاخبار یہاں سے نکالنا شروع کر دیا۔ لکھنؤ آکر انھوں نے کہا تھا:

ریاضؔ تھی جو مقدر میں بازگشتِ شباب
جوان ہونے کو پیری میں لکھنؤ آئے!

لکھنؤ میں کام اچھی طرح چل رہا تھا۔ مہاراجا صاحب مرحوم کی قدر دانی، ریاضؔ کی محنت اور ریاض الاخبار کی خصوصیت نے کام یابی کی ایک نئی شاہ راہ آنکھوں کے سامنے کر دی تھی۔ حالات ہر طرح سے ساز گار تھے، کام یابی قدم چوم رہی، حوصلے شباب پر تھے کہ:

من درچہ خیالیم و فلک درچہ خیال

والا معاملہ پیش آیا۔ ایک خانگی حادثے نے ریاضؔ کے سکون، اطمینان اور حضورِ قلب کو درہم برہم کر دیا۔ مقدمے کی مصروفیتوں نے ریاض الاخبار اور پریس کی طرف سے انھیں غافل کر دیا۔ ان پر یاس اور اِضمحلال کی کیفیت طاری ہو گئی۔ آخر انھوں نے ریاض الاخبار بھی بند کیا اور خیرآباد میں جا کر خانہ نشین ہو گئے۔

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا!

ناوِل نویسی

ریاضؔ نے طبع زاد ناول کوئی نہیں لکھا۔ نیم تاریخی افسانے بھی ان کے قلم سے نہیں نکلے۔ البتہ انگریزی نہ جاننے کے باوجود انھوں نے انگریزی زبان کے تین ناولوں کو اُردو میں منتقل کیا اور اس خوبی سے کہ ان کی رنگینی اور جاذبیت اصل سے بھی کچھ زیادہ بڑھ گئی۔ ان کے دو ناول "حرم سَرا" اور "نظّارہ" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ یہ دونوں رینالڈس کے "لوز آف دی حرم!" اور "مس ایلن پرسی" کا ترجمہ ہیں! ایک تیسرا ناول "تصویر" کے نام سے وہ ترجمہ کر رہے تھے۔ یہ بھی رینالڈ کا ناول تھا اور اس کا نام "برونز اسٹیچو" تھا۔

"تصویر" کے جستہ جستہ حصّے ان کے اخبار میں شائع ہوتے ہیں۔ وہ مکمل نہیں ہوسکا اس لیے کتابی صورت میں نہیں شائع ہوا۔ "نظّارہ" میری نظر سے نہیں گزرا، لیکن عقیل صاحب نے اسے ملاحظہ فرمایا ہے۔ ان کا بیان ہے:-

"نظّارہ میں یہ التزام رکھا تھا کہ پورے ناول میں ایک جگہ بھی کوئی لفظ اضافت کے ساتھ نہیں آیا ہے!"

زبان و بیان کے اعتبار سے اس ناول کی بہت تعریف کی جاتی ہے۔ اب نایاب ہو چکا ہے، نہ گھر پر اس کا کوئی نسخہ ہے، نہ بازاروں میں ملتا ہے۔ شاید کہیں پُرانے کتب خانے میں اس کے کچھ نسخے موجود ہوں۔

حرم سرا کو مَیں نے ایک سے زائد بار پڑھا ہے۔ میرے بچپن میں اس کے مختلف چھپے ہوئے اجزا جو کسی وجہ سے کبھی ردّی کر دیے گئے تھے۔ اِدھر اُدھر بکھرے پڑے رہتے تھے انھی ٹکڑوں کو دیکھ کر مجھے اس کے پڑھنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ لیکن گھر میں بھی اس کا کوئی مکمّل نسخہ نہیں موجود تھا۔ کچھ عرصے کے بعد اس کا دوسرا ایڈیشن چھپا تو بہت سے نسخے گھر میں آ گئے۔ مَیں نے پڑھا اور اس محویت سے پڑھا کہ "ناول پڑھنے" کے جُرم میں کئی دفعہ زجر و توبیخ سے بھی دو چار ہونا پڑا۔ بچپن میں تو مَیں نے اسے اس نقطۂ نظر سے پڑھا تھا کہ ایک دل چسپ کتاب ہے لیکن بڑے ہونے پر جب کچھ کچھ ادبی ذوق پیدا ہوا اور پھر مَیں نے اسے پڑھا تو اس کی ادبی عظمت آنکھوں کے سامنے آئی۔ واقعہ یہ ہے کہ ریاضؔ نے اس خوبی سے اسے اُردو میں منتقل کیا ہے کہ آج اگر رینالڈس زندہ ہوتا تو اس کا اعتراف کرتا کہ نقل اصل سے کس طرح بڑھ جاتی ہے!

ترجمے کا معاملہ بھی بہت دل چسپ ہے۔ عقیل صاحب فرماتے ہیں:۔

"ان دونوں ناولوں کا ترجمہ انگریزی نہ جاننے کے باوجود ایک انگریزی داں دوست کی مدد سے اس طرح کیا کہ وہ سُناتے جاتے تھے اور آپ اس کو اپنی زبان میں اور اپنے انداز میں ڈھالتے جاتے تھے!"

یہ ناول اب بھی کتب فروشوں کے ہاں ڈھونڈنے سے مل جاتا ہو لیکن بہت مشکل سے!

ریاض کے یہ دونوں ناول بہت مقبول ہوتے۔

انیس احمد صاحب عباسی ایڈیٹر "حقیقت" لکھنؤ ارشاد فرماتے ہیں:

"مرحوم کی مشہور تالیف حرم سرا ملک میں بڑی مقبول ہوئی اور متعدد بار طبع ہوئی"!

نواب اختر یار جنگ بہادر کا بیان ہو:-

"ریاض کی نثر بھی ان کی شاعری سے کچھ کم دل کش نہ تھی۔ کئی ناول لکھے اور ریاض الاخبار کے ساتھ شائع کیے۔ "نظارہ"، "حرم سرا"، "تصویر" انھی کے شاخِ قلم کی گُل کاریاں ہیں!"

حرم سرا اور نظارہ کا ترجمہ حضرت ریاض نے ۱۸۹۰ء اور ۱۸۹۱ء میں کیا تھا۔ تصویر کے ترجمے کا زمانہ نہیں معلوم ہو سکا۔ لیکن اس کی باری ان دونوں کتابوں کے بعد آتی ہو۔ قیاس یہی ہو کہ انیسویں صدی کے اواخر ہی میں تصویر کے ترجمے کا کام شروع ہوا اور پھر ادھورا رہ گیا!

یہ ناول لکھ کر ریاض نے ناول نویسوں کی صف میں بھی ایک بلند حیثیت حاصل کرلی۔ حرم سرا اب تقریباً نایاب ہو لیکن لوگوں کی زبانوں پر اس کا ذکر اب تک موجود ہو!

(۲) زبان دانی!

میرے سوا زمانے میں کوئی نہیں ریاضؔ
اہلِ کمال شاعرِ یکتا کہیں جسے!

یہ ضروری نہیں ہو کہ ایک اچھا شاعر اچھا زبان داں بھی ہو۔ ہو سکتا ہو اور ہوتا ہو کہ ایک شاعر کے ہاں خیالات کی فراوانی ہو، جدتِ تشبیہ، ندرتِ استعارہ، پاکیزگیِ بیان، حُسنِ ادا سب کچھ ہو لیکن غلط محاورے بھی ہیں، بے محل الفاظ بھی ہیں، نامسوع ترکیبیں بھی ہیں۔ متروک لفظ بھی ہیں۔ لہٰذا ایک مبصرِ جہاں شاعر کے کلام پر اظہارِ رائے کرتے وقت اس کے خیال اور بیان کی خوبیاں ظاہر کرتا ہو، وہاں اس کی لسانی لغزشوں اور لغت کی کوتاہیوں کا ذکر بھی کرتا ہو۔ لیکن ریاضؔ کا کلام اس عیب سے پاک ہو۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہو کہ وہ ماہرِ زبان بھی ہیں، الفاظ اور محاورات کے محلِ استعمال پر جس صنعت اور کمال کے ساتھ انھیں قابو حاصل ہو، وہ انھی کا حِصّہ ہو۔ انھوں نے ایک مرتبہ ترنگ میں آکر فرمایا تھا:

قدرداں گو ہر سخن کے ریاضؔ
مُنھ مِرا موتیوں سے بھرتے ہیں!

اور یہ واقعہ تھا! ان کا دہن مبارک صدف کے موتیوں سے کبھی نہیں بھرا گیا۔ لیکن معاصرانہ اعتراف کے موتیوں سے ضرور بھرا گیا۔ انسان خواہ کتنا ہی قابل ہو لیکن اس کے

معاصرین اس کے کمال کے اعتراف میں ضرور تامل کریں گے یہ معاصرانہ چشمک کچھ ایسی ہی چیز ہے مگر ہم دیکھتے ہیں ریاضؔ کے معاصرین بھی ان کے اس کمال کے قائل تھے اور اس کا بے تکلف اعلان بھی کرتے تھے۔

ریاضؔ کی بارگاہ میں زبان کی غلطی ناقابلِ معافی خطا تھی۔ وہ ہر خطا بخش سکتے تھے لیکن لغزشِ زبان بخش دیں یہ اِن کے بس میں نہیں تھا۔ وہ سب دشنام سُن سکتے تھے لیکن غلط زبان نہیں سُن سکتے تھے۔ ہم لوگ اخبارات ورسائل میں مضامین لکھتے تھے اور خوش ہوتے تھے، وہ بھی خوش ہوتے تھے اور انعام بھی دیتے تھے۔ ان کا انعام یہی تھا کہ وہ ہماری لغزشوں اور کوتاہیوں پر ہمیں ٹوکتے تھے۔ ہماری غلطیاں ہمیں بتاتے تھے۔ اس سے بڑھ کر اور انعام ہو بھی کیا سکتا تھا؟ نثر ہو یا نظم ان کی شانِ احتساب دادو تحسین کے ساتھ ساتھ برابر قائم رہتی تھی۔ مضمون یا نظم کی تعریف کرتے تھے۔ بعض دفعہ تو یہاں تک مبالغہ کرتے تھے کہ کسی ٹکڑے کے متعلق فرما دیتے تھے "میں بھی اگر چاہوں تو ایسا نہیں لکھ سکتا خوب لکھا ہے!" پھر یہ فضا تیار کر کے غلطیوں کی طرف رہنمائی فرماتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ جی چاہتا تھا ہر مضمون یا نظم ان کی نظر سے ضرور گزر جاتے۔ لکھنے کے شوق کا جب آغاز ہوتا ہے تو طبیعت داد کی شائق رہتی ہے اور حرف زنی کو "بے داد" سمجھتی ہے۔ وہ

داد دینے میں ذرا بھی بُخل نہیں کرتے تھے۔ خوب جی بھر کے داد دیتے تھے۔ اس طرح جب طبیعت خوش کر لیتے تھے تو باتوں باتوں میں ایسے ایسے نکتے بیان کر جاتے تھے کہ طبیعت نہ صرف ہدایت حاصل کرتی تھی بلکہ ان نکتہ سنجیوں کی مشتاق رہتی تھی کہ یہ گنجِ گراں مایہ ان سے لے کر اپنے ساتھیوں اور ہم عمروں پر، اسکول اور بورڈنگ میں اپنی زباں دانی اور مہارت کا سکّہ بٹھایا جائے۔

حضرت نیاز فتح پوری ایڈیٹر نگار تحریر فرماتے ہیں:۔

"کلامِ ریاضؔ کی ایک اور خصوصیت جس میں سوا امیرؔ اور جلالؔ کے ان کے دور کا کوئی شاعر ان کا ہم سر نہیں، اس کا بے عیب ہونا ہے۔ آپ ریاضؔ کا پورا کلیات چھان ڈالیے لیکن آپ کو زبان یا فن کی غلطی مشکل ہی سے کوئی ملے گی۔ اس لیے کلامِ ریاضؔ علاوہ دوسری خوبیوں کے ایک معلّمانہ حیثیت بھی رکھتا ہے اور یہ وہ خصوصیت ہے کہ ناسخؔ ایسا غیر شاعر بھی اس کی بدولت آج اساتذۂ فن میں شمار کیا جاتا ہے!"

پنڈت امرناتھ جھا وائس چانسلر الٰہ آباد یونی ورسٹی رقم طراز ہیں:۔

"ریاضؔ کی شاعری کی خوبیوں پر اختلافِ رائے کی گنجائش ہے۔ لیکن ان کے فنِ شعر گوئی پر صرف ایک فیصلہ صادر کیا جا سکتا ہے وہ یہ کہ ان کا طرزِ ادا حرف گیری سے بلند تھا۔ زبان اور لغات پر ان کی قدرت قابلِ داد تھی اور روزمرہ کی شاعری میں ان کی قابلیت حیرت انگیز وہ محاورات کے بادشاہ تھے۔

ان کی شاعری صرف بچے تلے مُرصّع فقروں اور نازک لفظوں کی محتاج نہ تھی۔ پڑھنے والا بار بار فقروں کے موڑ، شگفتہ ترکیبوں، متحیّر کر دینے والے برمحل کنایوں سے دوچار ہوتا ہے۔ اس خوبی کی نمایندگی کے لیے ریاضؔ سے بہتر شخص کا پانا مشکل ہے، وہ ایک ہی خیال کو بیسیوں طریقوں سے ادا کرتے ہیں، ایک ہی تصویر سیکڑوں بار پیش کرتے ہیں لیکن ہر دفعہ طریقِ بیان میں انوکھاپن ہوتا ہے، ایک قسم کا نیا پن پایا جاتا ہے۔ بحروں کے حُسنِ استعمال میں تو ریاضؔ معجز نمائی کرتے ہیں۔ بحر چھوٹی ہو یا بڑی، اوزان کیسے ہی مشکل ہوں، ریاضؔ اپنی روانی اور سجاوٹ کو برقرار رکھتے ہیں اور کسی طرح کی دشواری میں مبتلا نہیں دکھائی دیتے۔ کیا ان کا یہ غرور قابلِ معافی نہیں ہے:

واہ کیا رنگ ہے کیا خوب طبیعت ہے ریاضؔ
ہو زمیں کوئی تمھیں پھولتے پھلتے دیکھا!

ریاضؔ اپنے روزمرہ میں وہ اثر پیدا کر لیتے ہیں جو دُوسرے لوگ اونچے، غیر مانوس اور شاعرانہ الفاظ کے استعمال سے پیدا کرتے ہیں مثلاً:

خُدا جانے ہوا کیا کوچۂ جاناں میں دل جا کر
مرا بھولا ہوا، بھٹکا ہوا اب تک نہیں آیا!

یا:

مَر کے ہم دادِ وفا دیں تو بھی کچھ پُرسش نہیں
یوں ہی سی ہے حُسن کی سرکار کچھ یوں ہی سی ہے!

یا:

ضعفِ پیری جو بڑھا موت کے پیغام چلے
آگیا وقتِ سفر صبح چلے، شام چلے

ایک جگہ پر کیسی سچّی بات کہی ہے:-

پینے کا یہ اثر ہے وہ کوثر کی ہو نہ ہو
پاکیزہ، شُستہ، صاف ہماری زبان ہے

پاکیزہ، شُستہ اور صاف، یہی تین لفظ پورے طور سے ان کے اندازِ بیان کی خصوصیتوں کو اپنے اندر سموئے ہوتے ہیں۔ بہ قولِ خود:-

روٹھے ہوتے بھی چھیڑ کے سنتے ہیں میرے شعر
میرے کلام میں ہے مزا بول چال کا!"

مجنوں گورکھپوری کا بیان ہے:-

"زبان کی صفائی، محاوروں کا رکھ رکھاؤ، الفاظ کی رعائتیں ریاضؔ کی مستقل خصوصیات میں سے ہیں۔ ثبوت میں ان کا سارا کلام پیش کیا جا سکتا ہے!"

مہاراجا سرکشن پرشاد (یمین السلطنت) کا ارشاد ہے:-

"ریاضؔ بڑے خوش گو اور مشّاق شاعر تھے۔ طبیعت خوب راہ دینے والی پائی تھی!"

مولوی سبحان اللہ خاں کا بیان ہے:

"ریاضؔ مرحوم کی شاعری اور شاعری میں زبان کے متعلق مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ ریاضؔ مرحوم کا پورا دیوان یا کل

کلام دیکھ کر آپ مجبوراً یہ فیصلہ کریں گے کہ کسی ایک شعر میں بھی تنافر کا نام نہیں ہے۔ ان کی شاعری میں لطافت و نزاکت اس درجہ تھی کہ مجھے مجبوراً یہ سوئے ادب کرنا پڑتا ہے کہ ان کے اُستاد منشی امیر احمد مینائی کے کلام میں بھی وہ لطافت ونزاکت اور روانی نہیں ہے یا کم سے کم مقابلۃً نہیں ہے!"

نواب اختیار جنگ بہادر فرماتے ہیں :۔

"ریاضؔ، شررؔ (مولوی عبدالحلیم) اور سرشارؔ (پنڈت رتن ناتھ) ساتھ ہی شاگرد ہوئے تھے اور ان میں باہم ایسی رفاقت تھی کہ اکثر ساتھ ہی رہتے تھے۔ ریاضؔ کی شاعری چوں کہ بلند اور زور کی تھی ان کے یہ دونوں رفیق شاعری میں ان کا ساتھ نہ دے سکے۔ نثر نگاری کی طرف متوجہ ہوگئے اور اس میں دونوں نے بڑا نام پیدا کیا۔

مَیں نے حضرت والد ماجد کو یہ فرماتے ہوئے سُنا کہ ریاضؔ اصلاح کے قدردان ہیں لہٰذا ان کا کلام بہت توجہ سے دیکھنے کو جی چاہتا ہے!"

اُردو کے مشہور لغت نور اللغات میں بھی ریاضؔ کا خاصہ حِصّہ تھا۔ مؤلف نور اللغات مولوی نور الحسن نیّرؔ کو جب کوئی مشکل پیش آتی، کسی لفظ کے صحیح استعمال میں شبہہ ہوتا، کسی محاورے کی سند درکار ہوتی وہ ریاضؔ سے رجوع کرتے۔ ریاضؔ اپنی رائے کے ساتھ سند میں کسی استاد کا کوئی شعر لکھ بھیجتے نہ یاد آتا تو خود ایک شعر کہتے اور روانہ کر دیتے۔ نور اللغات

میں ریاضؔ کے بہت سے اشعار ملیں گے جو منفرد ہیں یعنی وہ کسی غزل کا حصّہ نہیں ہیں۔ خود مولوی نورالحسن نیّرؔ نے بھی ریاضؔ کے تعاون اور اشتراکِ عمل کا اعتراف نوراللغات جلد دوم کے آخری صفحے پر کیا ہے۔ ریاضؔ کی وفات کے بعد لکھنؤ کے روزنامہ "حقیقت" میں نیّرؔ صاحب نے ایک مضمون سپردِ قلم فرمایا تھا۔ اس میں انھوں نے نوراللغات کا ذکر کرتے ہوئے اعتراف فرمایا تھا:

"ہندستان بھر میں جیسی عزّت افزائی جناب ریاضؔ نے فرمائی ایسی کسی نے نہیں کی!"

حضرت نوحؔ ناروی کے شاگرد جناب انصافؔ لکھتے ہیں:-

"منشی رام چندر مےکشؔ سے معلوم ہوا کہ حضرت ریاضؔ دنیا سے اُٹھ گئے۔ سنہ ۲۰ء میں ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا۔ گھنٹوں تبادلۂ خیال رہا۔ مُنھ سے الفاظ کیا نکلتے گویا پھول جھڑتے تھے۔ میری ایک غزل میں "تکبیر اٹھنا" نظم کیا گیا تھا، جسے حضرت سیمابؔ اکبرآبادی نے غلط بتایا تھا۔ میں نے سند میں راقم الدولہ جناب ظہیرؔ دہلوی کا یہ شعر پیش کیا:-

بستروں پر کروٹیں لینے لگے طاعت گزار
سونے والوں کے جگانے کو اٹھی تکبیر صبح!

جناب مےکشؔ لکھنوی نے نیاز نامہ بھیج کر مذکورہ محاورہ اور بعض دوسرے مسائل پر استصواب کیا۔ حضرت نے اس طرح جواب دیا:-

"شور اٹھنا، صدا اُٹھنا، تکبیر اٹھنا صحیح اور فصیح تر ہی۔ رستہ صحیح اور راستہ غلط ہی۔ بلبل مؤنث ہی۔ میدانِ محشر پہلے شعرا باندھتے تھے لیکن میدان زائد ہی محشر بہ معنی جاے حشر، البتہ میدانِ حشر کہنے میں حرج نہیں تیر، تصویر کے ساتھ شمشیر کا قافیہ میں نہیں باندھتا!"

بعض چیزیں ریاضؔ نے اپنے "متروکات" میں داخل کرلی تھیں مثلاً تیر کے ساتھ وہ شمشیر کا قافیہ نہیں باندھتے تھے۔ ایسے مسائل پر اگر استفسار اور استصواب کیا جاتا تھا تو وہ "غلط" نہیں کہ دیتے تھے۔ صرف اپنا مسلک بیان کرکے خاموش ہو جاتے تھے۔ اب مخاطب کو اختیار ہی کہ ان کا مسلک قبول کرے یا اسے رَدّ کردے۔

مثنوی گلزارِ نسیم

سنہ ۱۹۰۵ء بڑا معرکے کا سال گزرا ہی۔ پنڈت دیاشنکر کی مثنوی "گلزارِ نسیم" موضوعِ بحث بنی ہوتی تھی۔ چکبست (پنڈت برج نراین چکبست بی۔ اے۔ ال۔ ال۔ بی ایڈیٹر رسالہ صبحِ امید) نسیمؔ کے پرستاروں میں تھے اور مولانا شررؔ نکتہ چینوں میں۔ چکبستؔ کا خیال یہ تھا کہ مثنوی میر حسن بھی گلزارِ نسیم کے سامنے گرد ہی۔ شررؔ کہتے تھے اس میں کافی غلطیاں ہیں اس لیے اسے غیر معمولی اہمیت نہیں دی جاسکتی! معاملہ بڑھا اور رفتہ رفتہ پورا محاذ قائم ہوگیا۔ ایک طرف شررؔ اور ریاضؔ تھے۔

دوسری طرف سرشار اور سجاد حسین (اڈیٹر اودھ پنچ) تھے معاملے نے طول کھینچا اور یہ دل چسپ ادبی بحث ذاتیات کا اکھاڑا بن گئی۔ سجاد حسین نے تو ایسی ایسی گندگیاں اُچھالی ہیں کہ معاذ اللہ!حقیقت اگرچہ راقم الحروف کی رائے میں حق پر تھے لیکن ان سے بھی ایک بڑی فروگزاشت ہوئی۔ انھوں نے اس قضیے کو "ہندو مسلم" سوال بنا دینا چاہا۔

شرر اور سجاد حسین میں خوب چونچیں چلیں۔ ریاض اگرچہ شرر کے ہم نوا تھے لیکن اس سبھاؤ اور رکھ رکھاؤ سے اظہارِ خیال کر رہے تھے کہ سجاد حسین جیسے مُنھ پھٹ کو بھی ان کے خلاف خامہ فرسائی کا موقع نہیں ملا۔ شرر کی تضحیک کا کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھا لیکن وہ ریاض کا جب ذکر کرتا ہی تو عزت اور احتیاط سے۔

ذیل میں ہم ریاض کے خیالات انھی کے الفاظ میں پیش کرتے ہیں اس سے یہ بھی اندازہ ہو جائے گا کہ ریاض جب کسی مسئلے پر گفتگو کرتے تھے تو کتنی ژرف نگاہی، تحقیق اور سنجیدگی سے گفتگو کرتے تھے۔ مخالف کو ٹوکتے تھے لیکن اس کی پگڑی نہیں اُچھالتے تھے۔ غلطیاں نمایاں کرتے تھے لیکن ان کا ڈھنڈورا نہیں پیٹتے تھے۔ اس مسئلے پر اور طرفین کے زورِ قلم پر بحث کرتے ہوئے ریاض نے لکھا تھا:۔

"آج کل اودھ پنچ میں بحث چھڑی ہی کہ مولوی عبدالحلیم صاحب شرر نے جو اعتراض گلزارِ نسیم پر کیے ہیں، صحیح ہیں یا غلط!

اس ضمن میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بُری نوبت آگئی ہو۔ مولانا شرر کی نسبت بہت سخت سُست الفاظ استعمال ہو رہے ہیں، جن کو پڑھ کر افسوس ہوتا ہو۔ سمجھ میں نہیں آتا ہمارے مکرم و محترم منشی سجاد حسین صاحب کیوں اس قدر خفا ہو گئے ہیں؟ شرر نے اگر گلزار نسیم پر ریویو کیا تو کوئی خطا نہیں کی۔ شرر نے اگر خوشامدانہ ریویو نہیں کیا تو واجب التعزیر نہیں۔ شرر کے ریویو پر اگر ہمارے مکرم و فاضل دوست کو سختی کے ساتھ کچھ لکھنا تھا تو پہلے مسٹر چکبست کی حیرت انگیز دلیری پر کچھ لکھنا چاہیے تھا جنھوں نے آتش، رند، صبا، خواجہ وزیر، ناسخ سب کی تحقیر و توہین کی اور ایک حد تک سب کا درجہ نسیم سے گھٹا دیا۔ جب کہ یہ امر مسلم ہو کہ نسیم کی کوئی بساط اور حقیقت ان شعرا کے سامنے نہ تھی، صرف اپنی قوم کے ایک شاعر کی مداحی کے خیال میں مسٹر چکبست نے تمام لکھنؤ کے نام ور شعرا پر بہت خراب اور کم زور اور بُزدلانہ حملہ کیا ہو۔

جو اعتراضات شرر نے کیے ہیں گو موجودہ زمانے میں حرف حرف ان کا صحیح ہو مگر جس زمانے میں نسیم تھے اس وقت کی زبان اور طرزِ کلام اور تصرفات کو دیکھتے ہوئے ہم نسیم کی کوئی خطا نہیں دیکھتے۔ ہمارے دوستوں کو صرف یہی لکھ دینا چاہیے تھا مگر نسیم کی غلطیوں کا جواب دینا اور غلط الفاظ کو صحیح ثابت کرنا یہ ایک بڑی جرات ہو۔

ہمارے دوست اور عالی دماغ مکرم نے یہ بھی لکھا ہو

کہ ہم نے شررؔ کو دیہاتی لکھا۔ گو ہمارا رُوئے سخن شررؔ کی طرف نہیں تھا مگر یہاں پر ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اگر شررؔ کو ہم دیہاتی لکھیں تو شررؔ کی کوئی توہین نہیں ہے بلکہ فخر ہے کہ ایک دیہات کا باشندہ آج اس قابل ہے جس کی کتابیں نصاب تعلیم میں داخل ہیں اور جس کی لکھنؤ میں سند لی جاتی ہے اور جو تمام ملک میں فخر لکھنو مشہور ہے اور اسی طرح اودھ پنچ کی عزت و وقعت تمام ملک میں ہے حالاں کہ وہ بھی ایک دیہاتی اڈیٹر کے ہاتھ میں ہے۔

کہنے کو جو دل میں آئے کہو مگر جب تھوڑی دیر اس مسئلے پر کوئی غور کرتا ہوگا تو انصاف اس کو سمجھاتا ہوگا کہ بے شک قصباتیوں کی بدولت آج زبان کا عروج ہے۔

شہری ہونے کا خیال تو میرؔ و مرزاؔ تک تھا اور وہ زمانہ بھی اسی کام کا تھا۔ اب اس فضول خیال کو دل سے نکال کر یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ شررؔ نے جو اعتراضات کیے ہیں، صحیح ہیں یا نہیں ؟

ہمارے نزدیک شررؔ کے اعتراض ضرور صحیح ہیں۔ آتشؔ نے لکھا تھا :۔

دردِ درماں سے المضاف ہوا

مگر پھر ان کی تقلید کسی نے نہیں کی۔ اگر کوئی تقلید کرتا تو ٹوکا جاتا۔ نسیمؔ نے اگر تحمل کہا تو غلط کہا، جانؔ صاحب نے لکھا تو غلط لکھا، کوئی لکھتا، یہ لفظ غلط ہی رہتا۔ اس پر اس قدر اصرار کیوں ہے کہ غلط لفظ صحیح مان لیا جائے ؟

اگر ہمارے شاعروں کی شاعری کا موازنہ اسی طرح کرایا گیا تو دنیائے شاعری میں ایک شاعر بھی تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ کون کہہ سکتا ہو کہ لکھنؤ کی لونڈیاں جو غلط لفظ بولتی ہیں، وہ کتابی حیثیت سے بھی صحیح سمجھے جاتے ہیں؟ لکھنؤ میں تو کبوتر کو قبوتر، کاغذ کو قاغذ اور علی بخش کو علی بَخَش کہتے ہیں۔ جناب آتش مرحوم اور جناب جانؔ صاحب کے خطوط اور نواب نوازش علی خاں مرحوم کے گھر کی لونڈی کی دستاویز کا کوئی اثر ان اعتراضات پر نہیں ہو سکتا جو گلزارِ نسیم پر کیے گئے ہیں۔ ہم پھر کہیں گے کہ اس میں قابلِ الزام جو صاحب ہیں، وہ جناب چکبستؔ ہیں۔ جنھوں نے محققانہ دیباچہ نہیں لکھا اور اعلانِ جنگ کر کے مشہور استادوں کی توہین کی اور غلط روایات فرضی طور پر درج کر کے لکھنؤ والوں کا دل دکھایا۔ ایسی حالت میں اگر نسیمؔ صاحب کی فاش غلطیاں دکھائی گئیں اور ثابت کر دیا گیا کہ یہ اس قابل نہ تھے جن کو استادوں کے برابر کرسی دی جائے تو کیا بُری بات جناب شررؔ نے کی؟

رندؔ، صہباؔ، خواجہ وزیرؔ، امانتؔ کے کلام میں کیسے ہی عیوب چکبستؔ صاحب نکالیں مگر عموماً ان لوگوں کی قابلیت اور ان کی زبان اپنے زمانے میں تسلیم کر لی گئی تھی۔ وہ زمانہ تو بہت دور رہا، اس وقت بھی لکھنؤ میں کشمیریوں کی زبان کی سند کوئی نہیں لیتا۔ ہمارے آں جہانی دوست جناب سرشارؔ جنھوں نے اُردو کی دنیا میں اپنے ڈنکے بجوا دیے تھے، اور

جن کو لکھنؤ کی زبان کا دعوا تھا ان کو بھی آخر میں یہ بات معلوم ہوگئی تھی اور اودھ پنچ نے ثابت کر دیا تھا کہ طباعی اور ذہانت اور چیز ہو اور زبان دانی اور شی!

حاصل کلام یہ ہو کہ جناب نسیم کا شمار اُستادوں میں نہ جب تھا نہ اب ہو اور ان کے کلام پر جو اعتراض کیے گئے ہیں، وہ بہت صحیح تھے اس لیے کہ وہ آتش کے شاگردوں میں تھے اور آتش اور ان کے شاگرد ان ترکیبوں اور بندشوں اور اس زبان کو ترک کر چکے تھے جو نسیم نے گلزارِ نسیم میں لکھی ہو "ٹک" اور "مجھ پاس" اور اسی قسم کے دوسرے الفاظ اس وقت کسی کی زبان نہ تھے۔

نسیم نے ایک سخت کام اپنے سر لیا تھا۔ وہ عیوب سے مثنوی کو نہ بچا سکے اور چوں کہ محلات کی زبان اور خواص کی صحبتوں سے دُور تھے اس لیے زبان کی خوبیاں بھی مثنوی میں نہ پیدا کر سکے۔ ہاں شاعرانہ محاسن، استعارات اور تشبیہات خوب صرف کی ہیں۔

نصف صدی گزر گئی، اودھ کے کسی باشندے نے گلزارِ نسیم پر نکتہ چینی نہیں کی۔ محض اس خیال سے کہ جہاں اس میں سیکڑوں عیوب ہیں، سیکڑوں خوبیاں بھی ہیں مگر اب مسٹر چکبست نے خود چھیڑ کی۔

مسٹر چکبست جناب امانت مرحوم کی زبان دانی پر حرف رکھتے ہیں۔ خدا کی شان ہو کہ امانت مرحوم تو زبان سے ناواقف

ٹھیرائے جائیں اور نسیم اہلِ زبان کہے جائیں اور پھر توقع کی جائے کہ نسیم کی ستایش میں آپ کی ہاں میں ہاں ملانے کو اہلِ لکھنؤ زبان کھولیں۔

سچ تو یہ ہے کہ کسی فن کی تنقید کے لیے اس سے واقفیت بھی ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص کہے کہ تاج محل میں یہ نقص رہ گیا تو اس کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ وہ فنِ انجنیری سے واقف ہو۔ مسٹر چکبست کی تعلیم انگریزی قاعدے سے بے شک مکمل ہے مگر ان کو شاعری کے نکات اور اس کے فن سے کیا تعلق؟ اگر کچھ بھی واقفیت ہوتی تو امانت مرحوم کی زبان پر وہ اعتراض نہ کرتے۔"

ریاض کے دوسرے مضمون کا ایک ٹکڑا:۔

"کہا جاتا ہے کہ امانت مرحوم کو رعایتِ لفظی کا جنون تھا مگر یہ نہیں دیکھا جاتا کہ اس وقت سوسائٹی کا رنگِ طبیعت کیا تھا؟ اور یہ کہ رعایتِ لفظی اصنافِ سخن میں داخل ہے یا نہیں؟

"جنون" کی جگہ چکبست صاحب دوسرا لفظ بھی استعمال کرسکتے تھے مگر دلی خیالات پر وہ پردہ نہ ڈال سکے، حالاں کہ اس معاملے میں نسیم بھی امانت سے کچھ پیچھے نہیں ہیں۔

جناب ناسخ مرحوم پر ایک سخت چوٹ قومی تعصب کے پردے میں چکبست نے کی ہے جس کا کسی تذکرے میں ذکر نہیں ہے اور نہ کوئی اور ثبوت! چکبست اپنے مقدمے میں لکھتے ہیں:۔

"مشاعرہ شروع ہونے سے قبل شیخ ناسخ نے
نسیم سے مخاطب ہوکر کہا پنڈت صاحب ایک مصرع
کہا ہے دوسرا مصرع نہیں سوجھتا۔ انھوں نے جواب
دیا فرمائیے۔ ناسخ نے مصرع پڑھا:۔

شیخ نے مسجد بنا مسمار بُت خانہ کیا

ان کے مُنھ سے مصرع نکلتے ہی نسیم نے کہا:۔

تب تو اک صورت بھی تھی اب صاف ویرانہ کیا!

سب بھڑک اُٹھے۔ شیخ ناسخ نے مذہبی چوٹ کی تھی مگر نسیم
نے ٹھنڈا کر دیا"

اس کذب وافترا کے بیان میں چند باتیں قابلِ غور ہیں:۔
(۱) ناسخ کی غیور طبیعت اور شاعری کے دعوے ایسے نہ
تھے کہ وہ نسیم کو قابلِ خطاب سمجھتے اور ان کو اس تعظیم وتکریم کے
ساتھ مخاطب کرتے جو آتش کو بھی کبھی خیال میں نہ لاتے
تھے۔

(۲) ناسخ ایسے غیر مہذب نہ تھے کہ وہ ایک ہندو کو (اور پھر
اپنے محبوب ہندو کو) مخاطب کرکے ایسا دل شکن مصرع پڑھتے۔
(۳) نسیم لاکھ حاضر جواب سہی مگر ناسخ کا دبدبہ اور طنطنہ
ایسا تھا کہ وہ ان کو ناسخ کے سامنے زبان نہ کھولنے دیتا۔
(۴) دراصل نسیم نے کوئی مصرع لگایا نہ ناسخ نے کوئی
مصرع پڑھا۔ نہ اس حکایت کا ذکر کسی اور مقام پر دیکھا گیا۔
یہ صرف غلط قومی جوش کا نتیجہ ہے جس نے بے سروپا قصے گھڑنے

کی چکبست کو جرأت دلوائی ہے اور اس طرح ناسخ کا (بہ زعم خود) مقابلہ چکبست نے نسیم سے کیا ہے۔

نسیم کی طرف داری کرنے والوں کی نظر اس مقدمے پر نہیں پڑی۔ صرف چکبست کے فقروں میں آ گئے۔ نسیم، نسیم، نسیم کہنے لگے!

ریاض کے اس مضمون سے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ وہ کیسی سُلجھی ہوئی طبیعت رکھتے تھے۔ وہ چکبست سے صرف اِس لیے خفا تھے کہ انھوں نے بڑے بڑے شعرا پر نامناسب الفاظ میں نکتہ چینی کی۔ امانت کی رعایتِ لفظی کو "جنون" سے تعبیر کیا۔ حالاں کہ یہ چیز نسیم کے ہاں بھی تھی اور اس ادبی مبحث کو مذہبی اور نزاعی چیز بنا دینے کی کوشش کی۔ ناسخ کی طرف ایسا واقعہ منسوب کیا جس کا وجود نہ کسی تذکرے میں ہے نہ تاریخ میں۔ انھوں نے چکبست کو یا سجاد حسین کو ٹوکا ہے، گالیاں نہیں دی ہیں۔ برعکس اس کے ان حضرات نے شرر مرحوم کو کوئی مہذب اور غیر مہذب گالی ایسی نہیں ہے جو نہ دی ہو۔ سارا فساد چکبست کے مقدمے سے اُٹھا جس میں انھوں نے نسیم کو غلط طریقے سے بڑھایا اور اُن شعرا کی توہین کی۔ جو ایک عرصۂ دراز سے مقبولِ انام چلے آ رہے تھے۔ چکبست کا اصول یہ ہے کہ نسیم کی خطا بھی صواب ہے۔ ریاض کا مشرب یہ ہے کہ غلطی اگر آتش سے ہو، امانت سے ہو، امیر سے ہو، کسی سے ہو، قابلِ تسلیم نہیں! وہ بہ ہر حال غلطی ہے اور اس سے اجتناب واجب ہے!

---

(۳) شاعرانہ ماحول

ایک جھونکے نے اُلٹ دی طرب انگیز بساط
اے ریاضؔ آج سے دُنیا کی ہوا اور ہوتی!

قبل اس کے کہ ریاضؔ کے رنگِ شاعری پر گفتگو کی جائے، ضروری ہو کہ ہم ایک نظر ریاضؔ کے شاعرانہ ماحول پر بھی ڈال لیں کہ بغیر اس کے کسی صحیح نتیجے تک پہنچنا اور کوئی صحیح رائے قائم کرنا ممکن نہیں۔ اس کے بعد ہی ہم صحیح طور پر معلوم کر سکیں گے کہ ریاضؔ نے اپنے لیے کون سی شاہ راہ منتخب کی۔

ریاضؔ نے جب آنکھیں کھولیں تو لکھنؤ مٹ چکا تھا، اودھ کی حکومت سِسکیاں لے لے کر آخری ہچکی لے رہی تھی مسلمانوں کے دبدبے اور طنطنے، جاہ و حکومت، شان و شکوہ کا چراغ ٹمٹما رہا تھا، بلکہ یوں کہنا چاہیے، ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ ریاضؔ نے اپنے عنفوانِ شباب میں شاہانِ اودھ کی رنگ آرائیاں اور مجلس طرازیاں نہیں دیکھیں۔ لیکن ان کی آنکھوں نے مٹے ہوتے، اُجڑے ہوئے، بجھے ہوتے لکھنؤ کی زیارت ضرور کی۔ حکومت جا چکی تھی، اقتدار و اختیار ختم ہو چکا تھا، دبدبہ شاہی اور شکوہ حکومت کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ لیکن لکھنؤ اپنی تمام رنگینیوں اور دل آویزیوں کے ساتھ موجود تھا، زندہ تھا اور زندہ رہنا چاہتا تھا۔ دہلی اور لکھنؤ میں فرق ہی۔ دہلی نے رو رو کر دم توڑا، اور لکھنؤ ہنستے ہنستے اس دنیا سے رخصت ہوا۔ ریاضؔ کی شاعری

نے اسی ماحول میں پرورش پائی۔ وہ ماحول جو مسّی اور چوٹی، انگیا اور بندقیا، آئینہ اور کنگھی پر مشتمل تھا۔ جہاں آوازِ خلخال، بانگِ درا کا کام کرتی تھی، جہاں "چھم سے چلنا" دعوتِ کیف و نشاط ہوتا تھا۔ جہاں عیشِ امروز کے ہجوم میں فکرِ فردا کا خیال ناقابلِ معافی جُرم تھا۔

حضرت نیاز فتح پوری مدیر "نگار" رقم طراز ہیں:

"ریاض نے اس زمانے میں ہوش سنبھالا جب لکھنؤ کی شاعری شباب پر تھی اور داغ نے بھی دلّی کے رنگِ سخن کو چمکا رکھا تھا۔ ہر صحبت صحبتِ شعر و سخن تھی اور ہر بزم دائرۂ شعر و لگن۔ رام پور میں خلد آشیاں نواب کلب علی خاں کے دربار میں ملک کے تمام اکابر شعرا کا ہجوم تھا۔ ہر محفل لطائفِ ادبیہ اور نکاتِ شعریہ کا مرکز بنی ہوئی تھی اور ریاض بھی ان گلدستوں میں ایک گلِ نودمیدہ کی طرح کہیں نہ کہیں ضرور پائے جاتے تھے۔

آج ریاض کی شاعری ایک جنسِ کاسد ہے اور دنیا اس پر سر دُھنتا کیسا نگاہِ غلط انداز صَرف کرنے کو بھی تیار نہیں، لیکن ادبی اور علمی دنیا میں ہر چیز کی قیمت کا اندازہ اس زمانے کے لحاظ سے کیا جاتا ہے، جب وہ پائی جاتی تھی۔ حال کی چیز کا اندازہ حال کے معیار سے، اور جنسِ ماضی کی قیمت کا اندازہ ماضی کے معیار سے!

پھر مانا کہ آج ریاض کی شاعری بوسیدہ ہے، نقشِ پارینہ

ہے، ایک متروک آرٹ ہے لیکن اب سے نصف صدی پہلے وہ کیا تھا؟ اس کا صحیح اندازہ اس وقت ہو سکتا ہے، جب آپ اپنے کو اسی زمانے کا انسان فرض کریں، اسی وقت کی فضا پیدا کر لیں، اور اسی عہد کے ذوق کو سامنے رکھیں۔

لکھنؤ ـــــ نغمہ و سرور والا لکھنؤ ـــــ مٹنے کے بعد بھی اپنی خاک سے عبیر و گلال اُڑانے والا لکھنؤ ـــــ تاراجِ خزاں ہونے کے باوجود بہار پر چشمک زنی کرنے والا لکھنؤ ـــــ یہ تھا وہ لکھنؤ جہاں ریاضؔ کی شاعری کی ابتدا ہوتی اور یہ تھی وہ فضا جس میں ریاضؔ کی گل و بلبل اور پازیب و ہیکل والی شاعری نے ترقی کی۔

پھر آج جب کہ شاعری نام ہے، صرف سنجیدہ سوختگی کا، متعین برشتگی کا اور کھُل کھیلنے کی حالت میں بھی جراتِ رندانہ کے فقدان کا، امیرؔ و داغؔ، جلالؔ و ریاضؔ کی گنجائش کہاں؟ لیکن ایک زمانہ تھا، جب لکھنؤ سب سے زیادہ زندہ تھا۔ زیادہ پُر رونق تھا۔ جب چوک کی معطر فضا میں تماشائے لبِ بام کی رسم جاری تھی اور شامِ اودھ کے دھندلکے میں نغمہ و سرور کی گونج باقی، یعنی وہ عہد جب شمعِ سخن کے پروانوں کی خاک سرد نہ ہوتی تھی اور لکھنؤ کی فضا پر یہی غبارِ رنگیں چھایا ہوا تھا!

اسیرؔ کا دور

لکھنؤ میں نواب مظفر علی خاں اسیرؔ کا طوطی بول رہا تھا،

یہ خود امیر کبیر تھے۔ مٹ رہے تھے، مٹتے جا رہے تھے، مٹ چکے تھے لیکن ان کی لکھنویت قائم تھی۔ میں نے خود ڈالی گنج میں ان کا فلک شکوہ محل دیکھا ہے۔ ان کے نواسے آرزو صاحب سے ملاقات کا موقع بھی ملا تھا۔ مکان آسمان سے باتیں کرتا تھا لیکن مکین؟ زمانے نے انھیں پستی کی منزل پر پہنچا دیا تھا۔ حقیقت ہے کہ کسی زمانے میں اقلیمِ سخن ان کی تھی، انھی کا سکہ چلتا تھا اور یہی اس کے کشور کشا تسلیم کیے جاتے تھے۔ ملکی تباہی وبربادی سے قطع نظر ذاتی تباہی وبربادی نے بھی اسیر کو اسیرِ طرب رکھا۔ کم از کم ان کے اشعار میں قنوط، مایوسی، افسردگی اور اضمحلال کی وہ افراط نہیں ہے جو میر کے ہاں درد کے کلام میں بلکہ سودا اور مصحفی تک کے رنگِ سخن میں نظر آجاتی ہے۔

عجیب شاعری تھی یہ! نہ دین کی فکر نہ دنیا کا خیال، خیالی اور عملی رنگینیاں زندگی پر اس طرح چھائی ہوتی تھیں کہ وہ زندگی کا جزو بن گئی تھیں۔

اسیر بڑے پُرگو اور زُود گو شاعر بھی تھے۔ زبان ولغت کے امام تھے۔ زباں دانی کا یہ عالم تھا کہ جو لفظ ان کے مُنھ سے نکل گیا سند بن گیا۔ موافق اور مخالف سب ان کے آگے گردن کا جھکانا باعثِ فخر سمجھتے تھے۔

شروع شروع میں ریاض پر غالب کا اور وہ بھی "مشکل پسندی" کا رنگ زیادہ چڑھا ہوا تھا۔ وہ اسیر کے شاگرد ہوتے۔ انھوں نے

اس رنگ کی حوصلہ افزائی نہ کی بلکہ ایک حد تک انھیں مجبور کیا کہ اس رنگ سے درگزر کریں۔ یہ زمانہ اسیر کی پیری کا تھا۔ آفتابِ عمر لبِ بام آچکا تھا۔ شاگردوں پر وہ زیادہ توجہ بھی نہیں صرف کر سکتے تھے۔

امیر کا عروج

اب امیر کا عروج شروع ہوا۔ یہ اسیر کے شاگرد اور ان کی مملکتِ سخن کے "ولی عہد" تھے۔ ان کی طرف رجوع عام بڑھ رہا تھا۔ خود استاد اپنے لیے اور مبتدی شاگردوں کو اس عالم اور پختہ مشق شاگرد کے پاس بھیج دیتے تھے۔ کچھ حوصلہ افزائی کے خیال سے اور کچھ اپنی آسایش کے پیشِ نظر۔

ریاض کا مکتب بھی بدلا اور وہ اسیر کے احاطے سے اُٹھ کر امیر کی مجلس میں پہنچ گئے۔ امیر نے ریاض کو دیکھا اور تاڑ لیا، جوہر قابل ہی، تھوڑی سی توجہ کی جاتے تو چمک اُٹھے گا۔ ریاض نے امیر کو دیکھا اور بھانپ لیا کہ مرشد کامل ہی۔ ریاض اور مشقت سے اگر کام کیا تو اُستاد کی نظرِ کیمیا اثر کچھ سے کچھ بنا دے گی، کہیں سے کہیں پہنچا دے گی۔ دونوں اپنی اپنی جگہ سنبھل بیٹھے۔ ہر ایک نے اپنا اپنا کام شروع کر دیا۔

ریاض نے امیر سے بہت کچھ سیکھا۔ امیر نے دل سے ریاض کو بہت کچھ سکھایا۔ ریاض اپنے ماحول سے رنوگرداں

نہیں ہو سکتے تھے۔ اپنے گرد و پیش کی فضا کا اثر قبول کرنے سے انکار نہیں کر سکتے تھے۔ ان مؤثرات سے اپنا دامن نہیں بچا سکتے تھے. جو ان کی اور صرف ان کی زندگی پر نہیں، سارے لکھنؤ کی زندگی پر چھائے ہوئے تھے۔

ریاض کی شاہ راہ!

ریاض نے کسب و اکتساب کے بعد اپنی ایک نئی شاہ راہ بنائی۔ جس ڈگر پر عام شعرا چل رہے تھے، کچھ دور وہ اس پر چلے اور:

اپنی دنیا الگ بسائیں گے

کہتے ہوئے اس راستے سے ہٹ آئے۔ انھوں نے "لکھنویت" میں غرق ہو کر جو شعر کہے ہیں، وہ بھی ان کی انفرادیت، جدت اور ندرت کے شاہد ہیں۔ لیکن انھوں نے "لکھنویت" سے قطع نظر کر کے جو فکرِ سخن کی ہے، وہ انھی کا حصہ ہے!

انھوں نے اپنے تئیں کسی کا مقلد اور پس رو نہیں بنایا۔ اپنی طبیعت کو آزاد چھوڑ دیا۔ اپنی فکر پر کوئی پابندی نہیں عائد کی، اپنے زورِ طبع کو قیودِ رسمی سے جکڑا نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بالارادہ یا بلا ارادہ ایک نئی شاہ راہ پر گام زن ہو گئے۔ ایسی شاہ راہ جو سب سے جدا بھی ہے اور ممتاز بھی، دل کش بھی اور دل ربا بھی۔

یہی ریاض کا کمال ہے اور اسی کمال نے ریاض کو بامِ عروج پر پہنچا دیا۔

ہم اُڑ کر بھی نہ پہنچیں ہم سے اتنی دُور ہو جانا
مبارک شاخِ گُل کو، شاخِ نخلِ طوٗر ہو جانا

(۴) ریاضؔ کا رنگِ شاعری!

کیا بات ہی ریاضؔ تمھاری زبان کی
رنگینیِ کلام کے قُربان جائیے!

کلامِ ریاضؔ پر سر دُھننے والوں کی کمی نہیں، ان کے کلام کے مدّاح اور معترف حدِّ شمار سے خارج ہیں۔ لیکن ریاضؔ کا رنگِ کلام کیا تھا؟ ان کی خاص ادا کیا تھی؟ ان کا اندازو اسلوب کیا تھا؟ وہ خود جو کچھ تھے، اس کی نمایندگی انھوں نے کہاں تک کی ہی؟ یہ قابلِ غور سوال ہی اور اسی کا ہمیں جواب دینا ہی:

ریاضؔ میں اور دوٗسرے شعرا میں ایک مابہ الامتیاز یہ ہی کہ وہ زندگی کا صِرف ایک ہی رُخ نہیں پیش کرتے بلکہ کئی رُخ پیش کرتے ہیں۔ اسی لیے ان کے رنگِ کلام کے متعیّن کرنے میں دشواری پیش آتی ہی مثلاً امانتؔ کا یا جانؔ صاحب کا کلام دیکھیے، ایک رنگ ہی جو سارے کلام پر چھایا ہوّا ہی۔ داغؔ کا دیوان اُٹھائیے، ایک رنگ ہی جو شروع سے آخر تک نمایاں ہی۔ جلالؔ کو پڑھیے، سارے دیوان میں ان کی خصوصیّت رخشاں اور تاباں نظر آئے گی اس لیے ان حضرات کا رنگِ کلام

متعین کرنے میں دشواری نہیں پیش آتی۔ اب ریاضؔ کے کلام کا مطالعہ فرمایئے۔ جب وہ شوخی اور شرارت پر آتے ہیں تو ان کا رنگ کچھ ہوتا ہے، خمریات کا بیان کرتے ہیں تو دوسرا رنگ ہوتا ہے۔ اور وارداتِ قلب کی ترجمانی کرتے ہیں تو بالکل بدل جاتے ہیں۔ وہی ہنستا ہوا اور مسکراتا ہوا ریاضؔ دِل کو برمانے لگتا ہے۔ اس کی آہ شرربار محفل پر نوحہ و ماتم کی کیفیت طاری کر دیتی ہے۔ لطف یہ کہ یہ کیفیتیں جو ان پر طاری ہوتی ہیں، عارضی اور کسبی نہیں ہوتیں بلکہ آمد اور فیضان سے تعلق رکھتی ہیں اس لیے ان سب میں ریاضؔ کی انفرادیت پوری شان سے قائم رہتی ہے۔

ہنسنے والا ریاضؔ جب ہنستا ہے تو بے خود ہو ہو کر ہنستا ہے۔ اور محفل کو بھی کشت زارِ زعفران بنا دیتا ہے۔ یہی ریاضؔ:

دل جلوں سے دل لگی اچھی نہیں!

کہتا ہوا بزم میں آتا ہے تو اس کی آتش نوائی اور سوختہ سامانی سب کے لیے پیامِ درد ہوتی ہے۔ ایک ہی شخص میں نغمۂ قہقہہ اور آہ و ماتم کا اجتماع کم ہوتا ہے لیکن ریاضؔ میں تھا اسی لیے ہم انھیں وارداتِ قلب کا ترجمان بھی کہہ سکتے ہیں اور لطف و مسرت کا —— مۓ لطف اور بادۂ مسرت کا —— ساقی بھی کہہ سکتے ہیں۔ اپنی ان دونوں خصوصیتوں کو وہ بڑی خوبی سے نباہ لے جاتے ہیں۔

"اظہارِ نیاز"

ریاض کے رنگِ شاعری پر گفتگو کرتے ہوئے جناب نیاز فتح پوری ایک طویل تمہید کے بعد لکھتے ہیں :-

"اس میں کلام نہیں کہ ریاض کی شاعری یک سر رندانہ ہے اور اس مخصوص رنگ کے لیے جس قدر شوخی کی ضرورت ہے، وہ ان میں بہ درجۂ کمال پائی جاتی ہے۔ پھر چوں کہ رندانہ کمال کا لطف خمریات میں زیادہ نمایاں ہوتا ہے اس لیے ریاض اپنے خمریات کے لحاظ سے زیادہ مشہور ہوتے ورنہ حقیقتاً یہ ہے کہ شعر کا جس حد تک تعلق ہے، وہ خمریات و غیر خمریات ہر جگہ کام یاب نظر آتے ہیں اور حُسن و عشق کی کام یاب زندگی اور مادّیاتِ محبّت کی نشاط آفرینیوں میں مشکل سے کوئی دوسرا ان کا ہم سر پیش کیا جا سکتا ہے۔

ریاض کے کلام میں کہیں کہیں ایسے شعر بھی نظر آتے ہیں:-

ہمیں خدا کے سِوا کچھ نظر نہیں آتا
نکل گئے ہیں بہت دُور جستجو سے ہم

کبھی حرفِ محبّت تا بہ لب آیا تھا چپکے سے
اسی نے رفتہ رفتہ طول کھینچا داستاں ہو کر

نہ روکے طُور تو ہم جائیں عرش سے اُونچے
ہماری راہ سے پتّھر ذرا ہٹا دینا!

ہوا ہی جو اس دل میں ہنگامہ آرا
وہی بزم آراستے محشر نہ نکلے!

ہم اُڑکر بھی نہ پہنچیں ہم سے اتنی دُور ہو جانا
مبارک شاخِ گل کو شاخِ نخلِ طور ہو جانا

کلیم آتے تو کھل کے جلوہ دکھایا
ہم آتے تو پردے سے باہر نہ نکلے

لیکن یہ ان کا مخصوص رنگ نہیں ہی — ان کا صحیح رنگ جس میں وہ اپنی جگہ بالکل تنہا نظر آتے ہیں، شوخیِ بیان ہی۔ جس کو علاوہ خمریات کے میں نے تین درجوں میں تقسیم کیا ہی:

(۱) وہ جس میں زیادہ تر اسلوبِ بیان سے شوخی پیدا کی گئی ہی اور ایک حد تک جذبات بھی وابستہ ہیں لیکن وہی جذبات جو عریاں معاملاتِ حُسن و عشق سے متعلق نہیں ہیں مثلاً:-

دُبی زباں سے میرا بھی ذکر کر دینا
کلیمِ طور پر ان سے جو گفتگو آئے

اُترنے والے ابھی تک نہ بام سے اُترے
تڑپنے والے تڑپ کر فلک کو چھو آئے

تم اپنے بام سے فریاد کی اجازت دو
یہاں سے تو نہیں سُنتا ہی آسماں میری

تمھارے کوچے میں کچھ طور والے بیٹھے ہیں
ذرا تم آکے لبِ بام مسکرا دینا!

روشن کیے چراغِ لحد لالہ زار نے
اس مرتبہ تو آگ لگا دی بہار نے

جو ساتھ دے تو یہ دنیا سوا ہی جنت سے
مزے کی چیز الٰہی شباب ہوتا ہی
خراب ہی سہی رہ جائیں دن جوانی کے
سنا تو ہی یہ زمانہ خراب ہوتا ہی

اُٹھا ہوں خوف زدہ میں لحد سے قبل از وقت
کہ سب سے پہلے مری حشر میں پکار نہ ہو!

نزع میں یار سے پیماں وفا کرتے ہیں
اس دغاباز سے ہم آج دغا کرتے ہیں

یہ وہ رنگ ہی جس پر کسی کو اعتراض ہو ہی نہیں سکتا اور جو لکھنؤ دہلی دونوں جگہ شعرا کے درمیان مشترک ہی۔

(۲) وہ جس میں شوخی کے خط و خال زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں اور کہیں کہیں محاکات بھی ہی مثلاً :-

آتے آتے ترے لب تک وہ تبسم بن جائے
اس ادا سے کبھی ہم سے بھی ہو پیماں کوئی

چُپ سے ہیں کچھ مری آغوش میں وہ حشر کے دن
یہ وہی ہیں جنھیں پیمانِ وفا یاد نہیں!

چھلکائیں لاؤ بھر کے گلابی شراب کی
تصویر کھینچیں آج تمھارے شباب کی

چھیڑ کیسی بات کہتے رُوٹھ جاتے ہیں ریاضؔ
اِک حسیں ہر وقت ہو ان کو منانے کے لیے

ان کے آنچل میں ادا بن کر قیامت چُھپ چُکی
وہ مری جانی ہوئی، وہ میری پہچانی ہوئی

ریاضؔ کا یہ رنگ بھی کسی کے نزدیک قابلِ اعتراض و گرفت نہیں ہوسکتا۔ بعض بعض شعر تو اس قیامت کے نظر آتے ہیں کہ اگر وہ یہ رنگ نہ اختیار کرتے تو اُردو شاعری پر ظلم کرنے والے کہلاتے۔

شباب کو شراب کہنا اور صاحبِ شباب کو مینائے شراب سے تعبیر کرنا کوئی نئی بات نہیں لیکن ریاضؔ نے جس انداز

سے شباب کی تصویر یہ کھینچی ہے کہ:

چھلکائیں لاؤ بھر کے گلابی شراب کی

اسلوبِ ادا اور محاکات کی ایسی دل کش مثال ہے کہ ریاضؔ کی قادر الکلامی پر ایمان لانا ہی پڑتا ہے۔

(۳) وہ جس میں شوخی بالکل برافگندہ نقاب ہے یک سر عریاں اور سراپا بے باکی بن کر نمودار ہوتی ہے مثلاً:-

کوئی منھ چوم لے گا اس نہیں پر
شکن رہ جائے گی یونہی جبیں پر

یہ آدھی رات کو ان کا پیام آیا ہے
ہم آج آ نہیں سکتے اب انتظار نہ ہو

آڑی ہیکل کو چوم لے گی
وہ چیز جو کچھ اُٹھی اُٹھی ہے

یا پھر ان سب سے زیادہ قیامت یہ شعر

اِس طرح کہ گھنگھرو کوئی چھاگل کا نہ بولے
جب چھم سے چلیں گود میں چُپکے سے اُٹھا لے

یہ وہ قسم ہے جس پر ہر سنجیدگی پسند شخص کو اعتراض ہو سکتا ہے، لیکن صرف اِس قدر کہ ناواجب شوخی ہے، متبذل کہنے کا حق کسی کو حاصل نہیں ہے۔ حالاں کہ اگر اپنے اُوپر پہلے وہ حال

طاری کر لیا جائے جس کے ماتحت ریاضؔ نے یہ شعر کہے ہیں تو یہ اشعار نہ صرف بہت زیادہ پُرلطف معلوم ہوں گے بلکہ ان کی مقناطیسیت کی بھی داد دینی پڑے گی جو تھوڑی دیر کے لیے ضعیف سے ضعیف انسان کو بھی ایک بار جوان بنا دیتی ہی۔ اور تمام جدید ترین کیمیائی ذرائع سے بھی زیادہ قوی اور زُود اثر ہی۔

جس طرح ریاضؔ کے عام کلام کی شوخی تین درجوں میں تقسیم کی جا سکتی ہی، اسی طرح ان کے خمریات کی بھی تین قسمیں ہو سکتی ہیں:۔

(۱) ایک وہ جس میں انھوں نے بادہ کشی کے مضمون کو نہایت جوش و سرمستی کے ساتھ لیکن بلند خیالات کے ساتھ پیش کیا ہی۔ مثلاً:۔

یہ محشر ہی یہاں اب ہوش میں دیوانہ آتا ہی
خداوندا مِرے لب پر مِرا افسانہ آتا ہی

جہاں ہم خشتِ خم رکھ دیں بِنائے کعبہ پڑتی ہی
جہاں ساغر پٹک دیں چشمۂ زمزم نکلتا ہی

شررِ طور ہی جو موج ہی پیمانے میں
بجلیاں کوندتی ہیں آج تو مےخانے میں

ایک ہی چلو کے ہیں کوثر و تسنیم ریاضؔ
خاک اُڑتی جو لبِ خشک مِرا تر ہوتا

رے واعظ کہاں کا لامکاں عرشِ بریں کیسا
چڑھی ہوتی جو کچھ، تو ہم خدا جانے کہاں ہوتے!

یہ رنگ ریاضؔ کی خمریات کا بے مثل ہو اور اس کی داد میں شاید شیخ وزاہد کو بھی تامّل نہیں ہو سکتا۔

(۲) لیکن خمریات کی وہ دُوسری تقسیم بھی جس کا تعلق حقیقتہً صحن مے خانہ ہی سے ہی، کم پُر لطف نہیں مثلاً:-

فرشتے عرصہ گاہِ حشر میں ہم کو سنبھالے ہیں
ہمیں بھی آج لطف لغزشِ مستانہ آتا ہو

بعد مرنے کے تعلق ہو یہ مے خانے سے
میرے حصّے کی چھلک جاتی ہو پیمانے سے

توبہ سے ہماری بوتل اچھی
جب ٹوٹی ہو جام ہو گئی ہو

اِتنی تو ہو بیان میں واعظ شگفتگی
ہم رندِ سنِ کے قلقلِ مینا کہیں جسے

نا اہل ضرور ہیں وہ مے کش
جن پر یہ حرام ہو گئی ہو

بعد اک عمر کے مے خانے میں آئے ہیں ریاضؔ
آپ بیٹھے ہیں. بچاتے ہوتے دامن کیسا

ڈھلتی ہو ساتھ خضر کے سبزے کے فرش پر
جمتے ہیں وہ بھی آ کے لب جو کبھی کبھی

شراب پیتے ہی مسجد میں ہم کو گرنا تھا
یہ شغل بیٹھ کے اچھا تھا قبلہ رُو کرتے

جام مے توبہ شکن توبہ مری جام شکن
سامنے ڈھیر ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے

---

(۳) تیسری قِسم کی مثالیں جس میں وہ بہت زیادہ کھیل کھیلے ہیں، بہت کم نظر آتی ہیں مثلاً:-

لمبی داڑھی نے آب رُو رکھ لی
قرض پی آئے اک دُکان سے آج

خُم مسجد میں مے ناب بھریں جاڑوں میں
ٹھنڈے پانی سے وضو کر کے ٹھٹھرنے والے

پنڈت امرناتھ جھا وائس چانسلر الہ آباد یونی ورسٹی فرماتے ہیں:-

"چند شعر سُنیے جن میں ریاض بلندیوں پر جاتے ہیں، گہرائیوں میں اُترتے ہیں۔ جہاں وہ غم کا جذبہ پیدا کرتے ہیں اور مصائب کے راستے پر چلتے ہیں:

قفس میں ہم تھے، گھری بادلوں میں بجلی تھی
تڑپ تڑپ کے رہے دونوں آشیاں کے لیے

وہ کون ہے دنیا میں جسے غم نہیں ہوتا
کس گھر میں خوشی ہوتی ہے ماتم نہیں ہوتا

ہم تھک کے گرے، گر کے اُٹھے، اُٹھ کے چلے بھی
تجھ پر اثر اے دوریِ منزل نہیں ہوتا

بھٹکا ہوا خیال ہے عقبیٰ کہیں جسے
بھولا ہوا سا خواب ہے دُنیا کہیں جسے

کتنے کعبے ملے رستے میں کئی طور ملے
ان مقامات سے ہم کو وہ بہت دُور ملے

صیاد گھر ترا مجھے جنّت سہی مگر
جنّت سے بھی سوا مجھے راحت چمن میں تھی

اجل خدا کے لیے رحم کر حسینوں پر
مِلا کے خاک میں حُسن و جمال کیا ہوگا

مَیں کون ہوں کیا ہوں نہیں معلوم کہاں ہوں؟
مجھ سا کوئی بے نام و نشاں ہو نہیں سکتا

کہیں بھی جائیں کہاں آسماں نہیں مِلتا
لحد میں ایک جگہ ہو جہاں نہیں مِلتا

خاک میں ملنا ہو تو کیسا غرور
خاک میں مِلنا ہو تو کیسا گھمنڈ

آئی آنے کو فصلِ گُل سو بار
میرے دل کی کلی کِھلی ہی نہیں

فسردہ دل ہوں مجھے کیا ہو کوئی موسم ہو
بھری بہار میں کیا تھا جو اب خزاں میں نہیں

جن کے دل میں ہو درد دُنیا کا
وہی دنیا میں زندہ رہتے ہیں
جو مٹاتے ہیں خود کو جیتے جی
وہی مَر کر بھی زندہ رہتے ہیں

بڑی کوئی نٹ کھٹ ہی یارب قضا بھی
بچھنے بانکے ترچھے جواں کیسے کیسے!

تجّھا صاحب نے کہا کم ہی خود ریاضؔ کو سامنے لاکر کھڑا کر دیا ہی۔

ریاضؔ کا ایک رنگ نہیں، دو رنگ ہیں۔ ایک شوخی اور شرارت اور دُوسرا درد و اثر! یہ دونوں رنگ دھوپ چھانو کی طرح ریاضؔ کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ کسی کو بھی آپ ان سے الگ نہیں کر سکتے۔ پہلا رنگ وہ ہی جس کا نمونہ نیازؔ نے پیش کیا، دُوسرا رنگ وہ ہی جسے امرناتھ نے بیان کیا!

(۵) ریاضؔ اور متقدّمین شعرا

یادگار اس وقت ہم بھی ہیں زمانے میں ریاضؔ
مانتے ہیں سب ہمیں ہم مانتے ہیں ہیں زہیرؔ کو

ریاضؔ کا مطالعہ بھی بہت وسیع تھا۔ کوئی اخبار، رسالہ، کتاب ان کے سامنے آجاتے، اسے بے پڑھے نہیں چھوڑتے تھے شعرائے متقدّمین کا مطالعہ بھی انھوں نے امعانِ نظر سے کیا تھا۔ کلّیات اور دواوین کا ایک ایک صفحہ انھوں نے دیکھا اور ان کا رطب و یابس سب ان کی نظر میں تھا۔

میرؔ سے عقیدت!

یوں تو ریاضؔ امیرؔ اور اسیرؔ کے شاگرد تھے اور اپنے ان دونوں اُستادوں سے انھیں بڑی گہری عقیدت بھی تھی۔ وہ لکھنؤ میں پھلے پھولے، لکھنؤ کی شاعری ان کا ماحول بنی رہی۔ امانتؔ مرحوم اور جانؔ صاحب کی انھوں نے آنکھیں دیکھیں۔ لکھنوی شعرا ان کے معنوی اسلاف میں داخل ہیں۔ خود بھی وہ لکھنؤ کے رنگ سے خاصے متاثر تھے۔ لیکن بہ ایں ہمہ انھیں میرؔ سے غیر معمولی عقیدت تھی۔ نجی مجلسوں اور دوستوں کی محفلوں میں وہ برابر میرؔ کا ذکر کرتے رہتے تھے۔ ان کی زبان پر یوں تو بہت سے اساتذہ کے اشعار چڑھے ہوئے تھے لیکن سب سے زیادہ اشعار اگر انھیں کثرت کے ساتھ یاد تھے تو وہ میرؔ کے شعر تھے۔

اپنے اشعار میں بھی وہ برابر میرؔ کا کسی نہ کسی نہج اور اسلوب سے ذکر کرتے رہتے تھے۔

اب کہاں شستہ زباں میرؔ کی افسوس ریاضؔ
میرؔ کا رنگِ تغزّل بھی گیا میرؔ کے ساتھ

کچھ کچھ ہی ریاضؔ میرؔ کا رنگ
کچھ شان ہی ہم میں مصحفیؔ کی!

اُٹھتی ہو اب جہاں سے میر کی طرز
کہ ریاض اب جہاں سے اُٹھتا ہو

تم کو خسرو کہتے ہیں ساحر ریاض
تم کہیں خسرو، کہیں تم میر ہو!

آتش سے تعلّق

خواجہ حیدر لکھنوی متخلّص بہ آتش سے ریاض کو بہت وابستگی تھی۔ ان کے کلام کا بھی کافی حِصّہ ریاض کو ازبر تھا۔ زبان وبیان ہر اعتبار سے وہ آتش کی نواسنجی کے قائل تھے۔ وہ آتش کو "غیر لکھنوی لکھنوی شاعر" کہتے تھے۔ فرماتے تھے آتش اگرچہ لکھنوی تھے لیکن ان کا رنگ لکھنوی نہیں تھا۔ ان کے کلام میں ایسے اشعار بہت ہیں جو دل کی ترجمانی کرتے ہیں۔ انسان کے جذبات کو پیش کرتے ہیں۔ جذبات کی گہرائیوں کو نمایاں کرتے ہیں۔

دوسرے شعرا

ناسخ کی زبان کے بہت قائل تھے۔ امیر مینائی کے رنگِ سخن کے بھی بڑے مدّاح تھے، میر درد کا کلام بھی پسند کرتے تھے، غالب سے بھی انھیں خاصا شغف تھا۔ شرُوع

میں تو یہ شغف غلو کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ ریاض نے اپنی شاعری کا آغاز غالب ہی کے نقشِ قدم پر چل کر کیا ہی۔ شروع شروع میں غالب کی مشکل اور دقیق غزلوں پر وہ بڑی محنت سے طبع آزمائی فرمایا کرتے تھے۔

امانت لکھنوی کی زبان کے وہ بہت قائل تھے۔ میر انیس کی بھی ان کی آنکھوں میں بڑی منزلت تھی۔

نئے شعرا میں ہر شاعر کے کلام میں غلطیاں نکالا کرتے تھے۔ بعض دفعہ تو ان کی تنقید اتنی پُر لطف ہو جاتی تھی کہ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے تھے۔ حسرت موہانی کے کسی حد تک قائل تھے۔ یعنی یہ مانتے تھے کہ ان میں تغزل ہی لیکن زبان ان کی بھی اصلاح طلب پاتے تھے۔ فانی کے تغزل کو بھی پسند کرتے تھے لیکن استقامِ لسانی سے انھیں بھرپور پاتے تھے۔ ان کی مشہور غزل:

مآلِ سوزِ غم ہائے نہانی دیکھتے جاؤ
بھڑک اٹھی ہی شمعِ زندگانی دیکھتے جاؤ

بہتوں کی زبان پر تھی۔ شدہ شدہ ان کے سمعِ مبارک تک بھی پہنچی۔ انھوں نے داد تو دی نہیں، لسانی غلطیوں پر ایک مفصل اور سیر حاصل تبصرہ کر ڈالا۔

ان کا سب سے اہم اعتراض یہ تھا کہ " دیکھتے جاؤ" جسے ردیف کے طور پر استعمال کیا گیا ہی اکثر بے موقع اور بے محل ہو کر رہ گیا ہی۔ یعنی اگر " دیکھتے جاؤ" کو حذف کر دیا جائے تب بھی

مفہوم پورا ہو جاتا ہو بلکہ زیادہ واضح ہو جاتا ہو، اسے وہ "حشو" سے تعبیر کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا اکثر اشعار میں "دیکھتے جاؤ" غلط استعمال ہوا ہو۔ یعنی اس کی ضرورت نہیں تھی خواہ مخواہ اسے ٹھونسا گیا ہو۔

داغؔ کی زبان کو تو مانتے تھے۔ ان کی بلند خیالی، حُسنِ بیان اور نُدرتِ تخیّل کے بھی قائل تھے۔ لیکن ان کا خیال تھا کہیں کہیں یہ بھی "ٹھوکر" کھا جاتے ہیں۔ مثال میں جو اشعار سناتے تھے، انھیں سُن کر قائل ہونا پڑتا تھا۔

جوشؔ ملیح آبادی سے ان کے اچھے خاصے مراسم تھے۔ ان کے "جوشِ بیان" کے بھی قائل تھے۔ لیکن اس منزل پر آکر رُک جاتے تھے، اس سے زیادہ نہیں! مہاراجا صاحب محمود آباد ساحرؔ تخلص کرتے تھے۔ ان کی ذہانت کے بھی ریاضؔ بہت زیادہ معترف تھے۔ مہاراجا کے متعدد اشعار انھیں یاد تھے۔ اب یاد نہیں رہے۔ لیکن تھے بہت خوب!

(۶) حلقۂ تلامذہ!

یوں تو مشہورِ زمانہ ہیں بہت میرؔ و امیرؔ
کہیے شاعر ہی ریاضِؔ سخن آرا کیسا!

میرؔ اور امیرؔ کے ماننے والے ہوں، یا آتشؔ اور جلالؔ کے پرستار، ریاضؔ کو سب مانتے تھے۔ ریاضؔ کی سخن آرائی نے سب

کا دل موہ لیا تھا۔ شاعروں میں جو شخص "اُستاد" کے درجے تک پہنچ جاتا ہے، اسے عقیدت مندوں اور قدردانوں کے ساتھ شاگردوں کی ایک "موج در موج فوج ظفر موج" قدرت کی طرف سے ودیعت ہوتی ہے اور اُستاد کا کام یہ ہوتا ہے کچھ اپنی طرف سے کہہ دے اور کچھ اصلاح دے کر کلام کو اونچا کر دے۔ بات بھی معقول ہے:

ہر کجا بود چشمۂ شیریں
مردم و مُرغ و مور گرد آیند

ریاضؔ نے بھی ایک "چشمۂ شیریں" کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ "مردم و مرغ و مور" انھیں بھی گھیرے رہتے تھے۔ ہر ڈاک میں چند خطوط ایسے ضرور آتے تھے جن میں نہایت الحاح وزاری بلکہ خضوع وخشوع کے ساتھ استدعا کی جاتی تھی کہ حضرت ریاضؔ انھیں اپنے زمرۂ تلامذہ میں شریک کر لیں۔ بعض راسخ العقیدہ لوگ ایسے بھی تھے جو خاص اسی مقصد کے ماتحت خیرآباد تک کا "شدِّ رحال" کرتے تھے۔ میری نظر سے بعض خطوط ایسے بھی گزرے ہیں جن میں التجا اور استدعا کے ساتھ ترغیب وتحریص کی چاشنی بھی تھی۔ کبھی کبھی مایوسی کی صورت میں یہی نیاز نامے عتاب ناموں کی صورت بھی اختیار کر لیتے تھے۔ اس قسم کی اُردوے معلّا بھی قابلِ دید ہوتی تھی۔

ریاضؔ نے اپنا ایک اصول یہ بنا لیا تھا کہ وہ کسی کو باقاعدہ اپنا "شاگرد" نہیں بنائیں گے۔ شاگرد بنانے اور اُستاد کہلانے سے انھیں بڑی چڑھ تھی۔ خاندان میں کئی ہونہار اصحاب ایسے

تھے جو ان کی سرپرستی اور رہ نمائی کے متمنّی تھے۔ لیکن انھوں نے انھیں بھی وسیم صاحب کی تحویل میں دے دیا، خود الگ رہے۔

خود حضرت مرحوم کے بھائی سیّد نیاز احمد صاحب مرحوم اور سیّد فیاض احمد صاحب مرحوم خوش گو شاعر تھے۔ ظاہر ہے ان کی اس سے بڑھ کر تمنّا کیا ہو سکتی تھی کہ "بھائی صاحب" انھیں قبول کرلیں اور انھیں اپنے شاگردوں کے حلقے میں شریک کرلیں لیکن انھوں نے اس طرح کا کوئی حلقہ کھولا ہی نہیں تھا۔ اپنے بھائیوں کو بھی انھوں نے شاگرد نہیں بنایا۔ یہ خدمت بھی وسیم صاحب کے سپرد کر دی گئی۔ وسیم صاحب بے چارے کسی کو شاگرد بنانے میں تامّل نہیں کرتے تھے۔ ہر شاگرد کی اتنی عزّت کرتے تھے کہ وہ ان کا اُستاد معلوم ہونے لگتا تھا۔

ہاں ایک بات تھی جس سے ریاضؔ کو انکار نہیں تھا۔ اگر "غیر مشروط" طور پر غزل یا نظم ان کے حوالے کر دی جائے تو مشورۂ سخن دینے میں وہ تامّل نہیں کرتے تھے۔ "غیر مشروط" سے مطلب یہ ہے کہ پابندی نہ لگائی جائے۔ فلاں مشاعرے میں غزل سنانی ہے "فوراً بہ واپسیِ ڈاک ارسال فرمائی جائے!" انھیں یہ موقع ہو کہ جب ان کا جی چاہے، اس پر نظر ڈالیں، اصلاح کریں اور روانہ کر دیں تو ایسے کلام کو بہ تدِ امانت انھیں اپنے پاس رکھنے میں عذر نہیں ہوتا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ ریاضؔ کے حلقۂ تلامذہ کا پتا ڈھونڈھے سے بھی نہیں چل سکتا۔

چند ایسے لوگ تھے جو ریاضؔ کے شرائط پر اپنا کلام انھیں دکھاتے تھے اور ریاضؔ جی لگا کر اسے دیکھتے بھی تھے۔ ایسے لوگ ان کے مشورۂ سخن کے اتنے خوگر اور دل دادہ ہو گئے تھے کہ انتظار کی بڑی سے بڑی مدت وہ گوارا کر لیتے تھے۔ لیکن اپنا کلام کسی اور اُستاد کے پاس بہ غرضِ اصلاح نہیں روانہ کرتے تھے۔ انھیں آپ چاہیں تو ان کا "شاگرد" کہہ سکتے ہیں!

واقفؔ!

سلطان احمد صاحب واقفؔ لبسوانی ایک شریف خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ وہی خاندان جس کے ایک فرد سر عزیز الدین مرحوم اور قاضی خلیل الدین مرحوم بھی تھے۔ واقفؔ صاحب کو ریاضؔ سے دلی تعلق تھا اور ریاضؔ بھی انھیں بہت مانتے تھے۔ صرف یہ ایک ایسے شخص تھے جو لڑ بھڑ کے ریاضؔ کو اصلاحِ سخن پر مجبور کر دیتے تھے اور ریاضؔ ان کے اصرار کی پزیرائی بھی کرتے تھے۔

واقفؔ صاحب اپنا ایک مخصوص رنگ رکھتے ہیں۔ ریاضؔ کی ہدایت اور رہ نمائی نے اس میں اور جلا پیدا کر دی تھی۔

صفدؔر مرزا پوری

یہ تو مجھے نہیں معلوم، صفدؔر مرزا پوری باقاعدہ شاگرد کس کے تھے۔ شعر و سخن کا اچھا مذاق رکھتے تھے۔ ان کی کتاب "مرقعِ ادب" بڑے معرکے کی کتاب ہے۔ اس میں اساتذۂ شعرا کے دل چسپ،

مفید اور کارآمد خطوط درج ہیں۔ شعر بھی اچھے کہتے تھے۔ بالالتزام ریاضؔ سے مشورۂ سخن کرتے رہتے تھے۔ ایسا کم ہوتا تھا کہ کوئی غزل ریاضؔ کو دکھائے بغیر شائع کر دیں۔ غزلوں کے ساتھ ان کے جو نیاز نامے آتے تھے، ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ انھیں ریاضؔ سے کس درجہ عقیدت و محبت ہے!

احسنؔ مارہروی!

احسنؔ مارہروی مشہور اہلِ زبان تھے۔ عرصے تک مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں اُردو کے معلّم بھی رہے۔ داغؔ کے شاگرد تھے اور ایسے شاگرد تھے جس پر اُستاد کو بجا طور پر ناز تھا۔ ایک شعری رسالہ "فصیح الملک" بھی نکالا تھا۔ اپنے زمانے میں یہ بھی بہت مقبول ہوا۔ اس رسالے کی اشاعت سے احسنؔ صاحب کی سخن فہمی اور سخن سنجی کا سکّہ بیٹھ گیا۔

حضرت احسنؔ بھی ریاضؔ صاحب سے مشورۂ سخن کے عادی تھے۔ وہ خود ایک اُستاد تھے اور ان کے بہت سے شاگرد بھی تھے۔ لیکن ریاضؔ کی اصابتِ رائے اور زباں دانی کے وہ اتنے قائل تھے کہ محض ازراہِ احتیاط اشاعت سے قبل اپنا کلام (بالعموم) ریاضؔ کو ضرور دکھا لیتے تھے۔

فضاؔ جالندھری

پروفیسر دل محمد فضاؔ جالندھری کو بھی ریاضؔ سے غیر معمولی

شیفتگی اور عقیدت تھی۔ اکثر اپنا کلام ملاحظے کے لیے بھیجا کرتے تھے اور وہ بڑی توجہ سے ضروری مشورے دیتے تھے۔

اپنی اصلاح کو ریاضؔ کبھی اصلاح سے نہیں تعبیر کرتے تھے۔ ہمیشہ "مشورہ" کہتے تھے۔ انھیں نہ مشورہ دینے میں عار تھا نہ مشورہ قبول کرنے میں۔ خود بھی اگر کسی لفظ کی صحت یا استعمال کے بارے میں کوئی شک ہوتا تو جناب وسیمؔ سے مشورہ ضرور کرتے تھے۔ اس سلسلے میں بحثیں ہوتی تھیں۔ پُرانے اساتذہ کے کلام سے اسی چھان بین اور محنت و عرق ریزی کے ساتھ "نظائر" تلاش کیے جاتے تھے، جس طرح ایک وکیل اپنے مقدمے کو زور دینے کے لیے عدالتِ عالیہ اور پریوی کونسل کے فیصلوں تک کے نظائر تلاش کرتا ہے۔ لُغات کی بھی ورق گردانی ہوتی تھی۔ کئی کئی دن، بلکہ بعض دفعہ کئی کئی ہفتے گرماگرم مباحثے اور سرگرم "ریسرچ" میں صرف ہو جاتے تھے۔ تب کہیں جاکر کوئی رائے آخری اور قطعی طور پر طے پاتی تھی۔

سر علی محمد خاں ساحرؔ مہاراجا محمود آباد کے بھی وہ "مشیرِ سخن" تھے۔ وصلؔ بلگرامی اس کے سختی سے منکر تھے کہ وہ کسی کے شاگرد ہیں۔ انھوں نے ایک غزل کہی تھی جس کا ایک شعر مجھے یاد ہے۔

بہ سوئے خوشۂ عنب نگاہ کس کی جا پڑی
جو دانہ جس جگہ پہ تھا وہیں شراب ہو گیا!

بڑی مرصع غزل ہے لیکن اس کے بنانے سنوارنے میں ریاضؔ کی "مشاطگیِ سخن" کا بڑا حصّہ تھا۔ یہ میرے ساتھ کا واقعہ ہے یاد رہ گیا

لیکن اس سے یہ اندازہ تو بہرحال ہوتا ہے کہ وہ اپنی فکرِ رفیع کو بھی ریاضؔ کے مشوروں کا محتاج سمجھتے تھے۔

مذکورہ اصحاب کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ تھے مقامی بھی اور بیرونی بھی جو بر سرِ ملاقات یا بہ ذریعۂ خط و کتابت جیسا موقع ہو ریاضؔ سے برابر مشورہ لیا کرتے تھے۔

گویا ریاضؔ کی حیثیت اس بڑے وکیل کی تھی جو اپنے "چیمبر" سے باہر نہیں نکلتا۔ عدالت میں نہیں جاتا، اپنے موکّل کے لیے عدالت کی بحثوں میں شریک نہیں ہوتا، لیکن اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے مشورے اور ہدایتیں دیتا رہتا ہے۔ ایسے وکیل اور ریاضؔ میں فرق یہی تھا کہ وہ اپنے مشوروں کی مُنھ مانگی قیمت وصول کر لیتا ہے اور ریاضؔ کے مشورے صلے کی تمنّا اور مزد کی آرزو سے بے نیاز تھے!

(۷) زندگی کے معرکے!

گھر میں دس ہوں تو یہ رونق نہیں ہوتی گھر میں
ایک دیوانے سے آباد ہے صحرا کیسا؟

عہدِ پیری میں ریاضؔ خاموش اور عزلت گزیں ہو گئے تھے۔ ان کا یہ طنزیہ شعر واقعی ان پر صادق آتا تھا:-

دُنیا کی کوئی بات نہیں جانتے ریاضؔ
اِک شخص ہیں ریاضؔ بہت ہی غریب سے

لیکن ان کا دورِ شباب؟ نبرد آزمائیوں اور معرکہ آرائیوں کا نشیمن تھا۔ وہ ہار ماننا، سپر افگندہ ہونا، قدم کا پیچھے ہٹانا جانتے ہی نہ تھے۔ انھوں نے بڑے بڑے معرکے سر کیے، حکومت کا مقابلہ کیا، کلکٹروں سے لڑائی مول لی، دوستوں اور عزیزوں کی مخالفت گوارا کی، مداحوں اور قدردانوں کی دشمنی سہی، لیکن جو راستہ طے کر لیا، اس سے نہ ہٹے۔ جو اصول بنا لیا، اسے نہ توڑا۔ جو راہِ عمل متعین کر لی، اس پر گام فرسا رہے۔ مخالفت کا طوفان، ہنگامہ آرائیوں کی بادِ مخالف، دشمنی اور ضرر رسانی کی تہدید، ان میں سے کسی چیز سے وہ متاثر نہیں ہوتے تھے۔

ایک پُرلطف معرکہ!

مولوی سُبحان اللہ کی روایت ہے:۔

"ریاض گورکھ پور میں سب انسپکٹر ہو گئے تھے۔ ایک سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر ڈیوس گورکھپور میں آتے تو ان کو اپنی پیش کاری میں لے لیا۔ مسٹر ڈیوس دائم الخمر انگریز تھے۔ اپنی کوٹھی میں برآمدے سے لے کر ہر کمرے کے دروازے پر بنیئی پردے ڈالے رہتے تھے۔ خود کمرے سے اونچے پایوں کے نواڑی پلنگ پر بغیر بستر کے بنیان اور دھوتی پہنے ہوئے لیٹے رہتے تھے۔ چاروں طرف برف کی سلیں رکھی ہوئیں، شمع جلتی رہتی۔ لالٹین اور لیمپ کوٹھی کے احاطے میں نہیں آ سکتے تھے۔ ایسے گرم مزاج والے کی پیش کاری ریاض کو کرنی پڑی۔

مسٹر ڈیوس انگریزی کا زبردست انشا پرداز تھا۔ اُردو کے احکام میں بھی ویسا ہی زبردست لٹریچر چاہتا تھا جو اس کو ریاض کی بہ دولت مل گیا۔

مسٹر ڈیوس پر ان کی کوٹھی کے گارد کے کانسٹبل نے دو فیر کیے۔ ضلع کے کلکٹر ملنے آتے، ملنے سے انکار کر دیا۔ لفٹنٹ گورنر اور انسپکٹر جنرل ملنے اور کوٹھی کا معائنہ کرنے آتے، ان سے بھی نہیں ملا۔ اب ضلع کے کلکٹر مع اپنے تمام ڈپٹی کلکٹروں کے اور پولیس سب انسپکٹروں اور انسپکٹروں کے ایک دم ڈیوس کے خلاف ہو گئے۔ اس وقت کا تھراتا ہوا، گرجتا ہوا، گونجتا ہوا اُردو لٹریچر کے ہتھیاروں سے ہر طرح آراستہ ریاض الاخبار کا ایڈیٹوریل رقص کناں، خلوت و جلوت میں ہر ہفتے اپنی جلوہ گری کیا کرتا تھا، جس میں ایک انگریز کی طرف داری اور دوسرے انگریز پر چوٹیں ہوتی تھیں......

مسٹر ڈیوس کی مخالفت کی آگ صرف گورکھ پور کے ضلع میں نہ تھی بلکہ حکومت کے تمام محکموں میں لگی ہوئی تھی۔ سیّد ریاض احمد کا ذوالفقاری ایڈیٹوریل ہر معرکے کو فتح کرتا ہوا چلا آرہا تھا۔ یہ جنگ پورے ایک سال تک لڑی گئی۔ اور آخر کار حکّامِ ضلع اور حکومت نے تھک کر کاغذات داخلِ دفتر کر دیے اور مسٹر ڈیوس کے خلاف ایک لفظ بھی نہ لکھا جا سکا۔ آخر انھیں بریلی بھیجا گیا۔ چھ مہینے تک ان سے کوئی کام نہیں لیا گیا۔ پھر علی گڑھ میں تعینات کیا گیا۔ مسٹر ڈیوس

نے بریلی ہی سے حکومت سے لڑنا شروع کر دیا تھا۔ علی گڑھ میں انھیں پھر ریاض کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ریاض مسٹر ڈیوس کے گورکھ پور چھوڑتے ہی اپنے عہدے سے مستعفی ہو گئے تھے۔ اب وہ علی گڑھ گئے اور چھ مہینے تک ان کا قلم مسٹر ڈیوس کے لیے سپر بنا رہا یہاں تک کہ ڈاکٹروں کے "سرٹیفکیٹ" پر حکومت نے مسٹر ڈیوس کو ولایت بھیج دیا۔

اخباروں سے ریاض الاخبار کا لٹریری مقابلہ اور چیز ہے اور اس طرح کے معرکے ہیں کہ پورا ضلع اپنی اسکیم لے کر کانپ اٹھتا ہو! لکھنے والے کے دماغ کے کس حصے کی داد دی جا سکتی ہے!"

ایک اور معرکہ!

لکھنؤ کے روزنامہ حقیقت کے ایڈیٹر نے ریاض پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ان کی زندگی کے ایک اور اہم معرکہ کا ذکر کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:۔

"۱۸۹۶ء میں اس کے بعد ڈاکٹر ہوئی کلکٹر گورکھ پور سے ان سے اَن بَن ہو گئی تھی اور ڈاکٹر ہوئی صاحب نے ازالہ حیثیت عرفی کا مقدمہ ریاض الاخبار پر چلا دیا جس میں لکھنؤ کے مشہور ناولسٹ عبداللہ حسرتی ایڈیٹر اخبار کو سزا ہو گئی تھی!"

اس واقعے کی بھنک اس سے پہلے بھی دو ایک دفعہ میرے کان میں پڑ چکی ہے۔ ایک اور واقعہ گوشۂ دماغ میں

ریاض الاخبار پریس کی تلاشی کا بھی گھوم رہا ہے کہ پولیس آئی اور اس نے سارے پریس کی تلاشی لی اور چھوٹے چھوٹے پتھر بھی اٹھا کر لے گئی۔ یہ واقعہ بھی غالباً اس واقعے سے متعلق ہے۔ استغاثے کی صورت میں پولیس قابلِ اعتراض لٹریچر کی تلاشی لینے آئی ہوگی۔

بہر حال اس سے زیادہ سعیِ بسیار کے باوجود معلومات مجھے نہیں حاصل ہو سکے۔ نہ ریاض الاخبار کے وہ پرچے دست یاب ہوتے جن میں اس مقدمے کی کارروائی شائع ہوتی ہوگی!

ادبی معرکے!

ریاض نے بڑے بڑے ادبی معرکے بھی سر کیے۔ فصیح الملک کا اس کتاب میں کسی جگہ ذکر ہو چکا ہے۔ اس رسالے میں یا اس رسالے کے کارکنوں کی سرپرستی میں کسی دوسرے رسالے میں امیر پر، ان کی شاعری پر، ان کی زباں دانی پر، ان کی مہارتِ فن پر، ان کی قابلیت اور اہلیت پر بڑے زبردست حملے ہو رہے تھے۔ امیر مینائی مرحوم بڑے ثقہ اور سنجیدہ آدمی تھے، وہ اینٹ کا جواب پتھر سے نہ دینا جانتے تھے، نہ دینا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک اس ایذا اور حرف زنی کا بہترین جواب بھی تھا کہ سکوت اور خاموشی سے کام لیا جائے لیکن ریاض اس کے قائل نہیں تھے۔ ایک عام خیال یہ تھا کہ یہ سب کچھ داغ کے ایما سے ہو رہا ہے۔ ریاض داغ کا احترام کرتے تھے۔ انھوں نے داغ کے خلاف تو کچھ نہیں

لکھا لیکن اپنے جوابی مضامین میں انھوں نے ایک بات کا خاص طور پر التزام رکھا تھا یعنی آمیر پر جو اعتراضات کیے جاتے تھے ان کا جواب وہ داغ کے کلام سے دیتے تھے۔ جس لفظ پر اعتراض ہوا، جو ترکیب محل ایراد قرار دی گئی، جس محاورے پر زبانِ طعن دراز ہوئی، ریاض نے داغ کے کلام سے وہی لفظ، وہی ترکیب، وہی محاورہ پیش کر دیا۔

یہ وہ طرزِ جواب تھا کہ مخالفین کو "لاجواب" ہو جانا پڑا اور یہ سلسلہ وہ زیادہ عرصے تک نہ قائم رکھ سکے۔

ایک زمانے میں "مجددِ السنۂ مشرقیہ" (بہ قول خود) شوکت میرٹھی نے ایک رسالہ "پروانہ" نکالا تھا۔ اس پرچے میں (وہ چوں کہ اپنے تئیں "مجدّد" سمجھتے تھے) اس لیے برابر ہم عصر شعرا پر ہدایت و نصیحت اور اصلاح تک کی بوچھار کیا کرتے تھے۔ انھوں نے ریاض کو بھی اس فہرست میں شامل کر لیا۔ ریاض کب خاموش بیٹھنے والے تھے۔ انھوں نے ایسے دنداں شکن جوابات دیے کہ مجدّد صاحب:

بیا کہ ما سپر انداختیم اگر جنگ است!

کہہ کر خاموش ہو گئے۔

مجدّد صاحب کے زورِ قلم نے آمیر کو چھوڑا تھا نہ داغ کو، جلال پر بھی انھوں نے اپنے عصائے تجدید سے پیہم وار کیے۔ ریاض کے اس شعر پر:

۸ کوئی منھ چوم لے گا اس نہیں پر   شکن رہ جائے گی یونہی جبیں پر

مجدد صاحب نے اصلاح دی:۔

کوئی مُنھ چوم لے گا اس نہیں پر
دھری رہ جائے چیں، طاقِ جبیں پر

ریاض نے ۲۸ جولائی ۱۹۰۶ء کے ریاض الاخبار میں اس اصلاح کا ذکر کرتے ہوئے لکھا:

"کوئی شکریہ ادا کرے یا نہ کرے، ہم دل سے شکر گزار ہیں۔ اپنے عیوب کے قبول کرنے میں تامّل کیا؟ البتہ اصلاحِ عالی سے افتخار حاصل کرنے میں اس لیے پس و پیش ہی کہ مجدّد الوقت کی فکرِ آسماں پیوند نے اس کو اس قدر بلند کر دیا ہی کہ وہ ممدوح کے سوا کسی اور کے مرتبے پر زیب نہیں دیتا۔ ہم عطائے تو بہ لقائے تو کہنے کے خواست گار ہوتے مگر ادب یہ بھی کہنے کی اجازت نہیں دیتا۔ کسی نے کیا خوب کہا ہی:۔

صدقے اپنی درازیِ قد کے
وہ مجھے بے وقوف کہتے ہیں!

ہم بھی اپنے عیب کلام پر ہزار بار صدقے کہ ایسا باکار رفارمر اور ایک ادنا شخص کے عیبِ کلام پر فیاضانہ توجّہ!"

چکبست اور شرر کی لڑائی جو بعد میں سجّاد حسین اور شرر کی جنگ بن گئی، ادبی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گی۔ ریاض نے اس معرکے میں شرکت کی اور اس شان اور آن بان سے کہ سجّاد حسین جیسا کسی کی نہ رکھنے والا آدمی ریاض کا جب ذکر کرتا ہی، ادب و احترام سے!

مولوی سُبحان اللہ خاں کا بیان ہے:-

" ریاضؔ کی انشا پردازی کے چند دور گزرے ایک جب ریاض الاخبار سے اور اودھ پنچ لکھنؤ سے جس کے ایڈیٹر سجّاد حسین صاحب مرحوم تھے، ان سے معرکے رہے، دوسرا طوطیِ ہند میرٹھ سے (یہ بھی " مجدد السنۃ مشرقیہ" شوکت میرٹھی کا پرچہ تھا!) جس کے ایڈیٹر اور لکھنے والے بھی مشہور ادیب تھے۔ ان سے مدت تک معرکے رہے۔ ان دونوں معرکوں نے سیّد ریاض احمد کی انشا پردازی کا سکہ ملک میں بٹھا دیا۔"

صبر آزما معرکہ!

آج سے کوئی ۲۵ برس پہلے ایک اور معرکہ انھیں پیش آیا اور اس میں بھی وہ ثابت قدم رہے۔ یہ معرکہ ادبی نہیں تھا۔ ذاتی اور صفاتی بھی نہیں تھا۔ کسی مخالف سے بھی نہیں درپیش تھا۔ یہ معرکہ تھا وطن میں، دوستوں سے، عزیزوں سے! ان دوستوں سے جو ان کے دست دیارہ تھے، ان عزیزوں سے جنھیں وہ چاہتے تھے، مانتے تھے۔

ریاضؔ کے ایک عزیز ترین دوست کا انتقال ہوا۔ انتقال کے بعد اولاد میں تقسیمِ جائداد کا مسئلہ چھڑا۔ دو فریق ہو گئے۔ ایک فریق کا انھوں نے ساتھ دیا۔ یہ فریق سب سے زیادہ کم زور تھا۔ دوسرا فریق ہر اعتبار سے توانا اور مضبوط۔ معاملہ آپس میں نہیں طے ہوا۔ عدالت تک گیا۔ بات دبی نہیں۔ بڑھی

اور آگ کی طرح پھیلتی چلی گئی۔ ریاض کی زندگی کا یہ آخری، لیکن سب سے زیادہ صبر آزما اور جاں گداز معرکہ تھا۔

سارا خیرآباد ان کا مخالف تھا۔ دوست بھی اور شناسا بھی، رشتے دار بھی اور عزیز بھی، نیاز کیش بھی اور عقیدت مند بھی، سب سے ملنا جلنا، آنا جانا، بیٹھنا اٹھنا بند ہو گیا۔ تعلقاتِ قرابت ختم ہو گئے۔ تقاریب کی شرکت کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ دوست داری اور پرسش نقش موہوم بن گئی۔

کوئی اور ہوتا تو اس کے پائے ثبات میں لغزش آجاتی لیکن ریاض اپنی جگہ پہاڑ کی طرح جمے رہے۔ وہ ناقابلِ تسخیر چٹان کی طرح اپنی جگہ پر قائم تھے۔ مخالفت ۲۴ گھنٹے کی مخالفت، سارے وطن کی مخالفت، پورے محلے کی مخالفت، گھر بھر کی مخالفت، ان کے عزم میں تزلزل نہ پیدا کر سکی۔ ان کے ارادے کو نہ بدل سکی۔ یہ سلسلہ کتنی برس تک قائم رہا اور اس طرح کہ بے ضابطہ طور پر ان کا مکمل "بائیکاٹ" ہو گیا تھا یا دوسرے الفاظ میں انھوں نے خود سب کا "بائیکاٹ" کر دیا تھا۔ وہ وطن میں تھے لیکن سب سے زیادہ "غریب الوطن" تھے۔ وہ گھر میں تھے لیکن اپنے تئیں اجنبی محسوس کرتے تھے۔ چار پانچ سال اسی طرح گزر گئے مگر وہ جو کچھ طے کر چکے تھے اس سے بال برابر بھی نہ ہٹے۔

رفتہ رفتہ معاملہ دبا، پھر ختم ہو گیا۔ ٹوٹے ہوئے تعلقات ازسرِ نو قائم ہو گئے۔ پچھلی تلخیاں اور بدمزگیاں دور ہو گئیں۔ ماضی کا دور ختم ہوا اور خوش گوار حال نے اس کی جگہ لے لی۔

اس معاملے نے تلخ صورت یوں اختیار کی کہ سب ریاض کو چاہتے تھے، سب انھیں مانتے تھے، ہر فریق ان کی عزت کرتا تھا، انھیں اپنا بزرگ سمجھتا تھا، ان کی اخلاقی اعانت کا خواستگار تھا۔ اگر وہ خاموش رہتے یا ملاطفت سے کام لیتے یا غیر جانب دار بنے رہتے تو یہ صورت نہ پیش آتی لیکن وہ فریق بن گئے۔ ان کا دل یہی کہہ رہا تھا کہ جسے بر سرِ حق سمجھ رہا ہوں، اس کا پورا پورا ساتھ دینا چاہیے۔ اپنے دل کی آواز پر انھوں نے لبیک کہا اور اس کی ذرا پروا نہ کی کہ کیا مشکلیں پیش آئیں گی؟ کس طرح کی دشواریوں کا سامنا ہوگا، رستے میں کیسے کیسے پتھر ملیں گے۔ ان کا عزم ان خطرات سے بے پروا تھا، تائید اور مخالفت سے بے نیاز تھا، دشمنی اور دوستی سے ناآشنا تھا، ان کے پیشِ نظر تو صرف یہ تھا کہ جسے وہ برسرِ حق سمجھ رہے ہیں، اس کا ساتھ کیوں نہ دیں؟ اس کی مدد کیوں نہ کریں؟ اس کے لیے ایثار و قربانی کرتے ہوئے کیوں جھجکیں؟ یہی ایک جذبہ تھا جو انھیں کھینچ کر میدان میں لایا اور اس وقت تک انھیں میدان سے ہٹنے نہیں دیا، جب تک جنگ ختم نہیں ہو گئی۔

اس سلسلے میں ریاض نے دن کو دن سمجھا نہ رات کو رات جانا۔ بڑھاپے کے باوجود وہ جوانی سے زیادہ سرگرم کار تھے۔ وکیلوں سے ملنا، انھیں معاملات کا سمجھانا، ان کے سامنے نئے نئے نکتے پیش کرنا، پھر جب مقدمہ شروع ہو تو آخر تک عدالت میں موجود رہنا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس معاملے میں انھوں

نے اپنی شہرت، اپنی شخصیت، اپنی عزت، اپنے وقار ہر چیز کو قربان کر دینے کا تہیا کر لیا تھا۔

اسے ان کی وضع داری کہ لیجیے، اصول پروری کہ لیجیے جو چاہیے نام دیجیے۔ مگر یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہی کہ وہ اپنے ضمیر کی پیروی بے تامل کرتے تھے اور خطرات کا مقابلہ کرنے میں زرا بھی پس وپیش نہیں کرتے تھے۔ وہ اصول اور کام کے آگے کسی خطرے کے قائل ہی نہیں تھے۔ یہی ان کی زندگی کا سب سے زیادہ روشن اور تابناک رُخ تھا۔

(۸) واقعاتی شاعری

ہم نے بھی ریاضؔ آپ کے اشعار سُنے ہیں
یہ لُطفِ بیاں، لُطفِ زباں ہو نہیں سکتا!

ریاضؔ کی زندگی معمورۂ حوادث اور گہوارۂ کیفیات تھی۔ یہ ممکن نہ تھا کہ ان حوادث اور کیفیات کا اثر ان کی شاعری پر نہ پڑتا۔ ان کی نظر سے کچھ واقعات گزرتے تھے اور وہ ان سے متاثر ہوتے تھے۔ ان پر کچھ سوانح بیتے تھے۔ اور وہ ان کا اثر لیتے تھے۔ ان میں سے بعض چیزیں ان کی زندگی تک محدود رہتی اور بعض نغمے یا نالے کی صورت اختیار کر کے شعر کا جامہ پہن لیتی تھیں۔ آپ ان کا سارا دیوان دیکھ جائیے۔ اس طرح کی بہت سی چیزیں ملیں گی لیکن

اگر ایک آن جان کی حیثیت سے آپ یوں ہی سرسری گزر جائیں گے تو ان کے نغمے یا نالے سے پورے طور پر لطف اندوز نہ ہوسکیں گے۔ لہٰذا ذیل میں اگر ان کے کلام کا کچھ ایسا حصّہ پیش کیا جائے جو واقعات، کیفیّات، سوانح اور حوادث پر مشتمل ہو اور اس کی ضروری تشریح بھی کر دی جائے تاکہ اس فضا اور ماحول کے سمجھنے میں آسانی ہو، جو ان پر اس وقت طاری تھی تو مضائقہ نہ ہوگا۔

اس موضوع کو اگر طول دیا جائے تو دفتر کا دفتر تیار ہوسکتا ہے۔

سفینہ چاہیے اس بحرِ بے کراں کے لیے

پھر بھی کچھ صفحات اس موضوع کے لیے وقف کیے جاتے ہیں۔

ایک دل دوز مرثیہ!

بڑھاپے میں ریاضؔ کو کئی صدموں سے دوچار ہونا پڑا۔

سب سے پہلا صدمہ تو انھیں اپنے لے پالک بیٹے "الطاف احمد" کا ہوا۔ تقریباً ساٹھ برس کی عمر تک وہ لاولد رہے۔ جب بالکل مایوس ہوگئے تو ان کی اہلیہ نے اس لڑکے کو گود لے لیا۔ ریاضؔ اسے اولاد سے بڑھ کر چاہتے تھے۔ اس کی کوئی ضد ایسی نہیں تھی جسے وہ پورا نہ کرتے ہوں۔ ریاضؔ اس لڑکے کے باپ بھی تھے اور ماں بھی۔

بعد میں جب انھوں نے آخری شادی کی تو خدا نے ان کا دامنِ امید اولاد سے بھر دیا لیکن اب بھی وہ الطاف احمد

کو اسی طرح چاہتے تھے۔ وہ اسے یہ محسوس نہیں ہونے دیتے تھے کہ وہ متبنّا ہی۔ کم از کم اس کے سامنے اولاد کا اتنا مان نہیں رکھتے تھے جس قدر اس کا رکھتے تھے۔

ایک مرتبہ وہ لکھنؤ گئے ہوئے تھے۔ الطاف احمد چند اور لڑکوں کے ساتھ تالاب پر گئے۔ وہاں نہانے لگے۔ پیرنا اچھا جانتے تھے، نہاتے نہاتے دُور نکل گئے، گرداب میں پھنسے اور غرق ہو گئے۔ اس حادثے کا ریاض کو اتنا صدمہ ہوا کہ وہ پانچ برس اور بوڑھے ہو گئے۔ والدہ خیرآباد میں نہیں تھیں۔ انھیں ایک خط میں انھوں نے لکھا "الطاف کے حادثے نے میری کمر توڑ دی۔ اب زندگی میرے لیے بے کیف ہی۔ مَیں خودکشی کر لیتا لیکن قمر اور انجم (حضرت کے بچّے) کا خیال مجھے روک لیتا ہی" انھوں نے اشعار کی صورت میں بھی اپنے دردِ دل کا اظہار کیا ہی۔ فارسی میں انھوں نے ایک مرثیہ لکھا۔ اس طویل مرثیے کے چند دل گداز اشعار سنیے:۔

جانِ پدر نہ دیدہ از ما گریستن
چوں موجِ جُو تپیدن و دریا گریستن
قہر است در فراق تو ہر جا گریستن
حشر است بر مزارِ تو تنہا گریستن
این است بس دو کار مرا در غمِ فراق
نگریستن بسوئے فلک یا گریستن
بزمے نہ صحبتے من و دیوانگیِ من   تنہا تپیدنے گہ تنہا گریستن

صبح است ہم سیاہ بہ چشمِ سپید ما
بے نور گشت دیدہ ام شب ہا گریستن
باید مرا بہ یادِ تو ای تہ نشین آب
دریا گریستن لب دریا گریستن
کارِ من از دو دیدہ بہ پایاں نمی رسد
خواہم ز درد از ہمہ اعضا گریستن
او رفت و یادِ او نہ رود از دلم ریاضؔ
بادا نصیب زیستنم با گریستن

ایک اور سانحہ

حضرت ریاضؔ کی بھتیجی، سیّد نیاز احمد صاحب کی چھوٹی صاحب زادی، صوری اور معنوی خوبیوں کا مجموعہ پابندِ صوم و صلاۃ، تعلیم یافتہ، سلیقہ شعار، ماں باپ کی خادمہ، شوہر کی رفیقۂ زندگی، بڑی بہن کی سچی ہم درد اور دم ساز، بعض ایسے صدمے پڑے کہ دق میں مبتلا ہو گئیں۔ آگرہ میں وفات پائی۔

یہ حادثہ ہمارے خاندان کے لیے بڑا سخت تھا۔ سب ہی اس غم سے نڈھال تھے۔ ریاضؔ کا نالۂ موزوں اس طرح ظاہر ہوا:۔

گئی قبر میں آج دخترِ نیازؔ
گلے اٹھ کر اس سے قیامت ملے

قیامت ہو یا رب جوانی کی موت
بُرے وقت یہ داغِ فرقت ملے
یہ ہو چاند پر ڈالنا خاک کا
ارے خاک میں ایسی صورت ملے
لحد میں چھپی چاند سی شکل ہائے
کلیجے میں رکھ لوں جو تُربت ملے

کچھ روز بعد غم زدہ ماں اور سوگوار باپ کو تسلّی دیتے۔ مع اپنے چھوٹے بھائی فیّاض احمد صاحب رازؔ کے جو مرحومہ کے خسر بھی تھے، آگرہ تشریف لے گئے۔ تربت پر گئے۔ فاتحہ پڑھی اور یہ کہتے ہوئے واپس آئے:۔

آنکھوں سے لگا آئے لحد، آگرہ ہو آئے
حسرت نہ رہی رونے کی تقدیر کو رو آئے
مٹّی میں ملانے تجھے بھوپال سے لائے
اب کس سے کہے کوئی کہاں ہم کسے کھو آئے
ہم کر گئے ہیں قبر میں اشکِ سرِ بالیں
ہم خوش ہیں کہ موتی ترے زلفوں میں پرو آئے
آنکھوں سے لگانے گئے کیوں دامنِ تُربت
یوں پھوٹ کے روئے کفن اشکوں سے بھگو آئے
اب دل ہو ریاضؔ اور نہ وہ دل کی تمنّا
منجدھار میں ہم کشتیِ امید ڈبو آئے

دل کے آنسو

حافظ نظام احمد صاحب خیرآباد کے ایک بڑے رئیس تھے۔ حضرت ریاضؔ اور وہ بچپن کے یار تھے۔ ان کی صاحب زادی کنیز فاطمہ کو وہ اپنی اولاد کی طرح چاہتے تھے۔ وہ ایک بڑے گھرانے کی خاتون تھیں، ناز و نعم میں ان کی پرورش ہوئی۔ جتنی زیادہ وہ خوب صورت تھیں، اس سے کہیں زیادہ خوب سیرت تھیں۔ لیکن ان کی زندگی بعض وجوہ کے سبب تمام تر المیہ تھی۔ جس صبر، خاموشی اور حوصلے سے انھوں نے اپنی ناخوش گوار زندگی تیر کی، وہ انھی کا حصّہ تھا۔ بہترین ادبی ذوق رکھتی تھیں۔ وفات سے پیش تر والدہ کے ایک خط کے جواب میں انھوں نے صرف ایک شعر لکھ کر بھیجا تھا:-

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے!

یہ شعر ایک مستقل داستانِ الم ہے جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ ان کی زندگی ایک کامل نمونہ تھی۔ صنف نازک کے ایثار کا! تیاگ کا! ترک کا!

خیرآباد میں طاعون پھیلا، اس میں مبتلا ہوئیں اور چند ہی روز میں اس زندگی کی کلفتوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوٹ گئیں۔

ریاضؔ نے ان تاریخِ وفات کہی:-

خُدا کا نور تھی وہ چاند سی شکل
چُھپی وہ خاکِ مرقد میں عجب ہے

ریاضؔ افسوس وہ گھر میں نہیں ہے
وہی گھر ہے وہی سامان سب ہے

سرِ مدفن لکھو یہ سالِ تاریخ
کنیزِ فاطمہ تُربت میں اب ہے
۱۳ ھ ۴۲

نوحۂ مُضطرؔ

حضرت مضطرؔ خیر آبادی کے نامِ نامی سے بچّہ بچّہ واقف ہے۔ ان کا شعر:۔

اسیرِ پنجۂ عہدِ شباب کرکے مجھے
کہاں گیا مِرا بچپن خراب کرکے مجھے

تو زبان زدِ خاص و عام ہو چکا ہے۔

بڑے علمی گھرانے کے فرد تھے۔ مولانا فضل امام اور مولانا فضلِ حق خیر آبادی جناب مضطرؔ کے اسلاف میں تھے۔ مضطرؔ صاحب کی تعلیم اور تربیت تمام تر ان کی والدہ کی رہینِ منّت تھی، جو خود بھی فارسی اور عربی میں مہارتِ تامہ رکھتی تھیں۔ وہ ریاضؔ کے ہم وطن بھی تھے۔ دوست بھی اور کسی دُور کے عزیز بھی۔ مختلف ریاستوں میں اعلا مناصب پر فائز رہے۔ ان کے انتقال پر ریاضؔ کا تاثر اس طرح صفحۂ قرطاس پر نمایاں ہوا:۔

روئیں کیا بسمل و کوثر کی طرح مضطر کو
ایک دن سب کو پہنچنا ہے اسی منزل پر
کبھی شہرت نہیں مٹنے کی اجل لاکھ مٹائے
حاصلِ عمر فنا کیجیے اس حاصل پر
زُود گو، فکر رسا، نغز بیاں، رنگیں طبع
رنگ کی طرح وہ چھاتے ہوتے ہر محفل پر
ہائے وہ نور کی آواز گلے پر قابو
بجلیاں آپ گراتے تھے ہمیشہ دل پر
خواب میں بسملِ مرحوم سے پوچھی تاریخ
آ گیا "مضطر مرحوم" لب بسمل پر

غمِ امیر

ریاض کو اپنے استاد حضرت امیر مینائی مغفور کی وفات کا بڑا صدمہ ہوا۔ امیر صرف ایک نغز گو شاعر ہی نہیں تھے بلکہ وہ ایک عابد شب زندہ دار، ایک عالمِ دین دار اور ایک انسان کامل العیار بھی تھے۔ ریاض نے ان کی وفات پر ایک طویل مرثیہ لکھا، چند شعر ذیل میں درج ہیں:۔

یہ آج ٹوٹ پڑا مجھ پہ آسماں کیسا
کہ دیکھنے میں پرانا نہ تھا یہ چرخِ کہن
شکست چرخ کی آواز ہے کہ رعد کا شور
چمک ہے درد کی یا صاعقہ ہے شعلہ فگن

نہیں ہیں تارے دہکتے ہوئے ہیں انگارے
یہ کیا ہوا طبقِ چرخ بن گیا گلخن
یہ چُپ جہانِ سخن ہو کہ جیسے جان نہیں
امیر جانِ سخن تھا امیر جانِ سخن
تڑپ رہا ہوں کہ قبرِ امیر تک پہنچوں
دکن سے دُور ہوں میں اور مجھ سے دُور دکن
رہے یہ سال سرِ قبر بے دیارِ امیر
فقیر کوچۂ محبوب[1]، امیر ملکِ سخن

۱۰ ھ ۱۳

داغِ دل

نواب مرزا خاں داغ دہلوی سے ریاض کی اکثر چشمکیں رہیں، مقابلے ہوئے، ایراد و اعتراض تک کی نوبت آئی۔ پُرانے زمانے کے لوگ اختلافات میں بھی حد سے تجاوز نہیں کرتے تھے۔ داغ کے حادثۂ وفات پر ریاض کی آنکھیں اس طرح اشک بار ہوتیں جس طرح ایک عزیز کا داغ آنکھوں کو پُرنم کر دیتا ہو۔ ریاض کہتے ہیں:-

ہو قیامت داغ کا مرنا ریاض
شورِ ماتم آج ہر محفل میں ہو
اُٹھ گیا شاہنشہ ملکِ سخن
خامشی بزمِ شعر عادل میں ہو

---

[1] "محبوب" سے مراد اعلاحضرت میر محبوب علی خاں مرحوم تاج دارِ دکن کی ذاتِ گرامی ہو!

ای لحد تو، چاند پر ڈالے گی خاک

داغ آغوشِ مہِ کامل میں ہو

کیا چھپاتے سے ترے چھپ جائے داغ

وہ نہاں تجھ میں عیاں ہر دل میں ہو

کہہ رہا ہو مصرعۂ سالِ وفات

ای لحد" اب داغ لاکھوں دل میں ہو!"

داغ کے لفظ کو کس کس طرح نباہا ہو لیکن کسی جگہ یہ نہیں معلوم ہوتا، تکلّف سے کام لیا ہو، رعایت لفظی کی یہ کتنی کام یاب مثال ہو!

دادِ فصاحت

معاصرانہ رشک و رقابت کا جذبہ ریاض میں تھا ہی نہیں۔ وہ اپنے معاصرین کو جی کھول کر داد دیتے تھے۔ ان کی تعریف و توصیف میں وضع احتیاط سے کام نہیں لیتے تھے۔

داسوخت والے امانت لکھنوی کو کون نہیں جانتا۔ ان کے صاحب زادے فصاحت لکھنوی پختہ کلام شاعر تھے۔ جس باپ کے بیٹے تھے اس کا رنگ بھی ان میں جھلکتا تھا۔ ریاض نے ان کے دیوان کے لیے ایک قطعۂ تاریخ کہا۔ چند اشعار ذیل میں درج کرتا ہوں۔ غور طلب بات یہ ہو کہ تعریف "شاعرانہ" نہیں ہو بلکہ جو رنگ فصاحت صاحب کا تھا اسی رنگ میں ریاض نے "دادِ فصاحت" دی ہو:-

مجموعۂ کلامِ فصاحت چھپا یہ خوب

لعل و گہر سے بڑھ کے کہیں آب و تاب ہیں

حرفوں نے لی جگہ ورق آفتاب پر
پتھر نے لعل اُگل کے جڑے آفتاب میں
نقطے بنے ہیں تاروں کی آنکھوں کی پتلیاں
سطریں ہیں کہکشاں نگہ انتخاب میں
رنگینیِ کلام کے قربان جائیے
تہنا ری میں ہی یہ رنگ نہ یہ خونِ ناب میں
پیدا کیا ہی رنگ مرے خط جام سے
ڈوبا ہر ایک شعر ہی میری شراب میں
وہ لی، ہوا جو تیز مئے پر تگیز سے
وہ کیف جو کسی کے دہن کے لعاب میں

آخری شعر کا دوسرا مصرعہ پڑھیے۔ کیا لکھنؤ کے رنگ میں اس سے زیادہ اچھوتی بات، اس سے زیادہ دل کش انداز میں کہی جا سکتی تھی؟

سخن گسترانہ بات!

ریاض پردے کے سخت حامی تھے۔ زرا سی بے پردگی بھی وہ گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ عورتوں اور مردوں کے غیر محدود اختلاط کو بھی وہ ناپسند کرتے تھے۔ ان کے دیکھتے دیکھتے زمانے نے کروٹ لی اور کچھ سے کچھ ہو گیا۔ ایک زمانہ انھوں نے وہ دیکھا تھا جب ہماری خواتین کی جھلک پسِ چلمن بھی نہیں دیکھی جا سکتی تھی۔ پھر ایک زمانہ انھوں نے وہ بھی دیکھا جب "کوایجوکیشن" (مخلوط تعلیم) رائج ہوئی۔ مردوں اور عورتوں کا اختلاط بڑھا، بے پردگی اور بے حجابی عام ہوئی، انھوں

نے جس ماحول میں پرورش پائی تھی، جس فضا میں زندگی بسر کی تھی، جن وضع داریوں کو دیکھا اور نباہا تھا، اب وہ یک سر بدل رہی تھیں۔ یہ سب دیکھ کر وہ خاموش نہیں رہے، ان کی زبانِ شعر پر واردات دل میں کبھی کبھی آجاتے تھے۔ فرماتے ہیں:۔

ہر اک محفل میں اب پہلو بہ پہلو بی بیاں ہوں گی
حجاب اُٹھ جائے گا ہر کام میں یہ درمیاں ہوں گی
"ہمیں میداں ہمیں گو" یہ کہیں گی مردِ میداں سے
سبک ہو کر نگاہوں میں رواں ہوں گی دواں ہوں گی
جو آئے گا جگہ دیں گی اسے یہ چشم و ابرو پر
کوئی جب میہماں ہوگا یہ اس کی میزباں ہوں گی
میاں سایہ بنے ہوں ساتھ پابندی نہیں اس کی
کبھی خود میزباں ہوں گی کبھی خود میہماں ہوں گی
یہی چھائی رہیں گی محفلوں میں رات ہو دن ہو
نصیبِ دوستاں ہوں گی، نصیبِ دشمناں ہوں گی
نمایش حُسنِ خوباں کی ہے شوقِ خود نمائی ہے
نمایاں داغ بن کر ان کی اب گُل کاریاں ہوں گی

آخری مصرعے کی نزاکتِ خیال دیکھیے "گُل کاریاں" "داغ" بن کر نمایاں ہوں گی! سبحان اللہ

ذیل میں اسی موضوع پر ان کی ایک اور نظم جو آج سے تقریباً چالیس سال پہلے کہی گئی تھی، درج کی جاتی ہے۔ یاد رہے یہ نظم ایک خاص زنانہ جلسے کو پیشِ نظر رکھ کر

کہی گئی تھی :-

انگلش مخدرات سے بڑھتا ہی اختلاط
کُھل کھیلنے کو ہی نگہِ شرم گیں گہاں

یہ حُسن، یہ خیال، یہ پاکیزہ صحبتیں
اس طرح کے ندیم کہاں ہم نشیں کہاں

وہ باتیں نرم نرم وہ آواز کی مٹھاس
سننے کو ملتے یوں سخنِ دل نشیں کہاں

ان کے قدم کے فیض نے رنگیں بنا دیا
تھی سُرخ سُرخ لالہ وگل سے زمیں کہاں

گلشن میں ہم ہزار بلند آشیاں سہی
پھر ہم کہاں عنادلِ طوبا نشیں کہاں

ہم چاہتے تو ہیں کہ کریں لامکاں کی سیر
ملتا ہی پانو رکھنے کو عرشِ بریں کہاں

کل ہو گا ذکر، حُسن کا، صورت کا، رنگ کا
جائے گی مُنھ چُھپانے کو قومِ حزیں کہاں

جس پر تمھیں ہی ناز وہ دُنیا و دیں ہی اور
جس پر ہمیں ہی ناز وہ دنیا و دیں کہاں

وہ نکلیں ان سے پہلے نکل جاتے دم ریاضؔ
آنکھوں میں آتی ہی نگہِ واپسیں کہاں ؟

اپنی بہو بیٹیوں کے باہر نکلنے سے پہلے دم نکلنے کی تمنا کرتے ہیں۔ آخری مصرعے میں کہتے ہیں "نگہِ واپسیں" واپس

کب آتی ہے؟ آزادی کی ہوا ایسی ہی ہوتی ہے۔ پردہ گیا، سب کچھ گیا، عزت بھی اور ناموس بھی۔

شاعر کی دُور بینی دیکھیے۔ آج سے نصف صدی پیش تر اس کے تخیل نے جو خواب دیکھا تھا، وہ واقعہ بن کر نمودار ہوا یا نہیں؟

عالمِ آشوب!

ریاضؔ کا اصل موضوع تو تغزل تھا یا خمریات لیکن کبھی کبھی وہ قومیات اور سیاسیات پر بھی خامہ فرسائی کر لیا کرتے تھے۔ جس طرح وہ اپنے خاص رنگ میں منفرد تھے، اسی طرح اس رنگ میں بھی وہ سب سے الگ نظر آتے ہیں۔

گزشتہ جنگِ عظیم کے بعد انھوں نے چھوٹی بحر میں ایک طویل نظم طنزیہ رنگ میں "عالمِ آشوب"، کہی تھی۔ جستہ جستہ اشعار ملاحظہ ہوں:-

لے گا ابھی کروٹیں زمانہ
رات آگئی، شام ہو گئی ہے

مشکل کاموں کی سربراہی
سرکار کے نام ہو گئی ہے

کیا جلد ہوتے ایک دو تین
ٹرکی نیلام ہو گئی ہے

ہر بات ان اتحادیوں کی الفت کا پیام ہو گئی ہے

معشوق کا عہد، وعدے ان کے
کیا طرزِ کلام ہو گئی ہی
پیچیدگی و دروغ بافی
کچھ حُسنِ کلام ہو گئی ہی
کیوں صلح کا رنگ "خوں چکاں" ہی
جب جنگ تمام ہو گئی ہی
ہو گی وہ عدو کی صبح امّید
جس صبح کی شام ہو گئی ہی
کہتے ہیں کہ سعی ولسن[1] و جارج[2]
بے نیلِ مرام ہو گئی ہی
دُنیا دُنیا رہی نہ افسوس
عبرت کا مقام ہو گئی ہی
ہی دوُر بہت دُعا سے تاثیر
وہ عرش مقام ہو گئی ہی
ہو گی کبھی صبح، شام کی بھی
جب صبح کی شام ہو گئی ہی
آثار ہیں صبح کے نمایاں
اب رات تمام ہو گئی ہی!

ہر ہر شعر طنزِ لطیف کا کیسا اچھوتا اور دل آویز شاہ کار ہی!

[1] صدر ولسن ۔ جمہوریۂ امریکہ کے صدر
[2] لائڈ جارج ۔ برطانیۂ عظمیٰ کا وزیرِ اعظم

پرچمِ خلافت!

خلافت کی تحریک ہندستان کے کس شہر، کس قریے اور کس دیہات میں پورے زور شور، پوری سرفروشی اور جاں نثاری کی شان کے ساتھ نمودار نہ ہوئی؟ خیرآباد ایک چھوٹا سا قدیم قصبہ ہی۔ یہاں بھی جھنڈے نکلتے تھے، جلوس نکلتے تھے، جلسے ہوتے تھے، مظاہرے کیے جاتے تھے، بدیشی کپڑوں کی ہولیاں جلتی تھیں، ترکِ خطاب اور اعزاز کی نمائش ہوتی تھی۔ کیا نہیں ہوتا تھا!

ایک بار ہمارے قصبے میں بھی پرچمِ خلافت ایک بڑے جلوس کے ساتھ لہراتا ہوا گشت کے لیے نکالا گیا۔ اس جلوس کے ہم راہ عام و خاص، غریب اور امیر، رئیس اور مزدور، زمیں دار اور کسان سب ہی شریک تھے۔ پہلو بہ پہلو!

اس موقع کے لیے ریاضؔ نے خاص طور پر "ترانۂ خلافت" لکھا۔ جو علم بردارانِ خلافت قومی رجز کے طور پر جلوس کے ساتھ ساتھ پڑھتے جا رہے تھے۔ خود ریاضؔ بھی ضعیفی اور کم زوری کے باوجود کئی میل تک اس جلوس کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔

ذیل میں اس نظم کے چند اشعار درج کیے جاتے ہیں:۔

ہلال آج چمکا وہ بالائے پرچم
صلیب اس کے آگے بنی دستِ ماتم

صلیب اس کے آگے ہوئی اس طرح خم
عدو کے لیے طوقِ گردن کہیں ہم
نیا طوق پڑتے ہی گیسا جُھکا سر
ہتوا آج نیچا بڑے بول کا سر

ذرا صلیب کا تصوّر کیجیے پھر "دست ماتم" کی تشبیہ پر غور فرمائیے۔

ہوئی صلح ٹرکی مگر فاتحانہ
ادا فاتحانہ اثر فاتحانہ
قدم تھے سرِ رہ گزر فاتحانہ
چلے جس طرف تھی نظر فاتحانہ

مہینوں چھنی خوب برطانیہ سے
بگڑ کر بنی خوب برطانیہ سے

اشارہ ہے لوزان کانفرنس کی طرف!

عراق و حجاز و فلسطین و شام آج
ہیں محکوم اغیار ان کے ہیں سرتاج
نہ پاسِ زباں ہے نہ کچھ بات کی لاج
ہمیں بھی اُنھیں بھی ملے کیوں نہ سوراج

پریشان کرنا پریشان ہونا
مناسب ہے کچھ تو پشیمان ہونا

چلے گا نہ اب کام عیّاریوں سے
نہ غدّارِ مکّہ[1] کی غدّاریوں سے

---

[1] حسین. شریف مکّہ!

نہ زر پاشیوں سے نہ زرباریوں سے
حذر چاہیے ہی ریاکاریوں سے

عراق و عرب کی بھی ہو" واگزاری!"
ذرا ان میں موصل کی ہی چوٹ بھاری!

"واگزاری" کے لفظ پر غور فرمایئے کتنی لطیف (موصل سے بھی زیادہ) چوٹ ہی!

ایک دوست کی یاد

سرعزیزالدین مرحوم کے چھوٹے بھائی خان بہادر خلیل الدین او۔بی۔ای وزیرِ ریاست بجاور سے ریاضؔ کے بڑے گہرے، بے تکلفانہ اور مخلصانہ مراسم تھے۔ یوں تو دونوں بھائیوں (سرعزیزالدین اور قاضی خلیل الدین) سے ان کی خوب بنتی تھی۔ دونوں انھیں اپنا بڑا اور بزرگ سمجھتے تھے۔ لیکن قاضی خلیل الدین سے جو تعلّقات تھے، ان میں بے تکلّفی اور ہم مذاقی کے عناصر بھی شامل تھے۔

انھی خان بہادر صاحب کے انتقال پر ریاضؔ نے ایک قطعۂ تاریخ کہا جو اپنے درد و اثر اور سوز و گداز کے لحاظ سے ایک خاص چیز ہی۔ چند شعر:-

تمھارے مرنے سے اب لُطفِ زندگی نہ رہا
نظر میں یاروں کی دنیا ہوئی سیاہ خلیل
دمِ اخیر بھی لکھوا کے خط مجھے بھیجا یہ میرے ساتھ رہا وضع کا نباہ خلیل

دُعائیں خلق سے لیں تو صلہ حکومت سے
تمھارے دم سے کھلا تھا درِ رفاہ خلیل

نہ تم ملو گے، نہ تُم سا ملے گا دُنیا میں
چراغ لے کے جو ڈھونڈیں گے مہر و ماہ خلیل

چمن میں پھولوں نے ہنسنا تمھی سے سیکھا تھا
تمھی سے سیکھا تھا مینا نے قاہ قاہ خلیل

رہیں وہ حوروں کے جھمگٹ میں لالہ و گل میں
جناں میں جا کے مزے لوٹیں یا الٰہ خلیل

تُمھارے اشکوں نے دھوئے تمھارے عصیاں بھی
تُمھاری فردِ عمل میں نہیں گناہ خلیل

ریاضؔ تھی غمِ فرقت میں فکرِ سالِ وفات
صدا یہ کانوں میں آئی "خلیل آہ خلیل!"

۱۳۴۶ھ

بیل کی سرگزشت

واقعاتی نظمیں ریاضؔ بہت کم کہتے تھے، لیکن جب کہتے تھے تو خوب کہتے تھے۔ ایک ایک شعر زبان و بیان کے اعتبار سے ایک خاص معیار کا نمونہ ہوتا تھا۔ ایسے مواقع پر ان کا مؤقلم عکاسی اور نقاشی کے ایسے جوہر دکھاتا تھا کہ حقائق کی تصویر کھنچ جاتی تھی۔

سر عزیز الدین احمد وزیرِ اعظم ریاست دتیا کے ایما سے

انھوں نے ایک نظم "بیل کی سرگزشت" کہی تھی اسی نظم کے مجنوں گورکھپوری کا بیان ہے:-

" ان گورکھپوری ملاقاتوں میں سب سے زیادہ پُرکیف ملاقات وہ تھی جو ایک بار پروفیسر فراؔق کے مکان پر ہوئی۔ ریاؔض تمام دن وہیں رہے اور دن کا کھانا بھی وہیں کھایا۔ ریاؔض کو اپنے اشعار تو یاد نہیں رہتے تھے۔ حضرت وسیؔم اور ہم لوگوں کی مدد سے کچھ اشعار سُنائے۔ اسی سلسلے میں ایک نظم بھی جس کا عنوان "بیل" تھا ہم لوگوں کو سُنائی۔

حیرت تھی کہ جو شخص غزل گوئی اور وہ بھی اسی شوخ اور شریر غزل گوئی کے لیے بنا ہو وہ ایسی مسلسل نظم کہنے کی بھی اُستادانہ مہارت رکھتا ہے!"

نظم خاصی طویل ہے لیکن اس کا خلاصہ شاید بے موقع نہ ہو:-

بیل بن کر کس مصیبت میں پھنسے ہم بے زباں
سرگزشت اپنی بیاں کس سے کریں ہم جان ہار
جھگڑے کیسے کیسے کھینچے ہم نے دَل دَل کے پھنسے
بوجھ ہم نے یوں اٹھایا جس طرح عصیاں کا بار
موسم گرما میں دن کی دھوپ کیسی سخت و تیز
موسم سرما میں شب کی اوس کیسی ناگوار
خون سوکھے دیکھ کر، کھانے کو ایسی خشک گھاس
جس کو پی کر خون پانی ہو، وہ آبِ ناگوار

آندھی آئے پانی برسے ہم کو چلنا رات دن
ساتھ دے تو اس طرح دے گردشِ لیل ونہارؔ
ہائے وہ سوجے ہوئے پھولے ہوئے کاندھے کا زخم
بوجھ بھاری، سخت منزل، اونچی نیچی رہ گزار
بے سکت، پالنگ، لاغر، ناتواں، زار ونحیف
بھوکے پیاسے، زخم خوردہ، سینہ ریش ودل فگار
باندھ کر بیچ ہی کھلاتے کون بوڑھے بیل کو
کون پالے ہم کو اس حالت میں ای پروردگار
وقت نازک، عمر آخر، جان دو بھر، حال غیر
سر پر اب قصاب پہنچے لے کے چھریاں آب دار
کھال باقی رہ گئی تھی اس کے نقارے منڈھے
شامتِ اعمال سے پڑتی ہو اب اس پر بھی مار
ایک ناکردہ گنہ کا حال یہ ہو ای ریاضؔ
وہ بھی اک بے عقل، بے بس، بے زباں، بے اختیار
دیکھیے ہوتا ہو کیا ہم سے گنہ گاروں کا حشر
دیکھیے پاتے ہیں کیا پاداش ہم سے زشت کار

اِشارے

ریاضؔ کے کلام میں ایسے اشعار کافی ہیں جو درد وحسرت، یاس وغم اور سوز وگداز کی تصویر ہیں۔ کچھ اشعار ایسے بھی ہیں جو اپنے اندر کوئی خاص تلمیح رکھتے ہیں، یا ان کی زندگی

کے کسی واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ایسے اشعار کی توضیح وتشریح ضروری نہیں۔ چند اشعار درج کیے جاتے ہیں اور وہ خود ان تاثرات اور حالات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ بعض واقعات ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی تشریح ضروری نہیں ہوتی۔ اشارہ کافی ہوتا ہے:

شریکِ درد تو کیا باعثِ اذیت ہیں
وہ لوگ جن سے روابط تھے جسم وجاں کی طرح
یہ کس کے سایۂ دیوار نے مجھے پیسا
یہ کون ٹوٹ پڑا مجھ پہ آسماں کی طرح
ریاضؔ موت ہے اس سے ہمیں منظور
زمیں ستائے نہ مرنے پہ آسماں کی طرح

حرص پیری میں سیہ کاری کی
ہائے مجھ پیر سیہ کار کی حرص
دل میں ہر دم اسے بڑھتے دیکھا
ہائے ری لذّتِ آزار کی حرص

تھکا لے اور دوْرِ آسماں تک
پھر آخر گردشِ قسمت کہاں تک
مجھے پینا پڑے آخر وہ آنسو
جو بھر جاتے زمیں سے آسماں تک

خدایا میرے سجدے دُور ہی سے
پہنچ جائیں کسی کے آستاں تک
ریاضؔ آنے میں اُن کے ہو ابھی دیر
چلو ہو آئیں مرگِ ناگہاں تک

آنکھوں میں اشک آئے تو ہنسنے کا لُطف کیا
اِتنا نہ گُدگُداؤ کہ ہم رو دیا کریں
رکھ لیں ہم آپ لاؤ دلِ بے قرار میں
ایسا نہ ہو کہ تیر تمُھارے خطا کریں
ہم لاکھ پارساؤں کے اِک پارسا سہی
موقع سے تم کو پائیں تو بتلاؤ کیا کریں
وہ دن کہاں ریاضؔ وہ راتیں کہاں ریاض
بیٹھے ہوئے کسی کی بلائیں لیا کریں!

وہ ستائیں تو ستانے کا ہو شکوہ دن رات
نہ ستائیں تو گلہ ہو کہ ستاتے بھی نہیں

بہار نام کی ہو کام کی بہار نہیں
یہ دستِ شوق کسی کے گلے کا ہار نہیں
سحر بھی ہوتی ہو چلتے ہیں اے اجل ہم بھی
اب ان کے آنے کا ہم کو بھی انتظار نہیں

یہی چراغِ لحد تھے، یہی تھے قبر کے پھول
اب ان کے نقشِ قدم بھی سرِ مزار نہیں

کل تو روتے تھے اپنے دامن کو
اے جنوں آج آستیں بھی نہیں
آپ جب تک تھے جان تھی اس میں
جائیے اب دلِ حزیں بھی نہیں
جن سے پھیلی تھی چاندنی گھر میں
اے فلک اب وہ مہ جبیں بھی نہیں

آج اس کی وفا کو روتے ہیں
جس کی اِک اِک ادا کو روتے ہیں
خون رُلوا رہی ہے یادِ وفا
اک سراپا وفا کو روتے ہیں
اب یہ اس تک پہنچ نہیں سکتا
نالۂ نارسا کو روتے ہیں
بہ گیا آنکھ سے لہو ہو کر
دلِ درد آشنا کو روتے ہیں
جانے والے کی یہ نشانی ہے
دیکھ کر نقشِ پا کو روتے ہیں
چُپ ہیں یوں جیسے ان میں جان نہیں لبِ معجز نما کو روتے ہیں

اب سوئے آسماں نہیں اُٹھنا
اپنے دستِ دُعا کو روتے ہیں
دے گیا ایسا داغ کون ریاضؔ
ہم غمِ دیرپا کو روتے ہیں

مقبول دعائیں نہیں ہوتیں نہیں ہوتیں
قسمت میں تو سنا ہو ترستے ہیں اثر کو
پتوں میں، نشیمن میں کبھی چھپتے تھے ڈر سے
خوش ہوتے ہیں اب دیکھ کے ہم برق و شرر کو
جب خاک سے بچتے نہیں پروردۂ دامن
کیا لے کے کریں لالہ و گُل، لعل و گہر کو
گریاں ہیں ریاضؔ آپ غمِ مرگ میں کس کے
درپیش یہی راہ ہو ہر فردِ بشر کو

ساقی نامہ شائع شدہ "فتنہ" ۱۸۸۲ء کا ایک ٹکڑا:۔

نہ وہ محشر فروشِ شوخیِ ناز	نہ وہ ہنگامہ ہائے فتنہ طراز
نہ کسی کی وہ چمپئی رنگت	نہ کسی کی وہ چٹکیلی صورت
نہ وہ نازک کمر کا بل کھانا	نہ وہ لغزش نہ وہ سنبھل جانا
نہ چھریرا بدن، نہ بکھرے بال	نہ وہ کافر کی لڑکھڑاتی چال
نہ وہ آنچل کا ڈالنا ہر بار	نہ دوپٹا سنبھالنا ہر بار
نہ وہ شوخی، نہ ہونٹ پر وہ ہنسی	نہ بلا خیز چتونیں تیکھی
نہ وہ جوشِ شباب کی اَن بَن	نہ اداؤں میں اب وہ چنچل پن
نہ وہ نغمہ، نہ جاں فزا آواز	نہ مغنی نہ کوئی نغمہ ساز

(۹) دیوان کا مرحلہ!

ہندوستاں میں دھوم ہے کس کی زبان کی
وہ کون ہے ریاضؔ کو جو جانتا نہیں!

کتنی عجیب بات ہے، ریاضؔ کا دیوان ان کی زندگی میں نہ شائع ہو سکا۔ یہ حسرت لے کر وہ قبر میں گئے۔ حالاں کہ اُن کے دیدہ اور نادیدہ قدردان اگر کوئی آرزو ان سے رکھتے تھے تو بس یہی کہ وہ اپنا دیوان مرتب کر کے جلد از جلد شائع کر دیں۔ ان کی زندگی میں اس دیوان کی اتنی مانگ تھی کہ اگر شائع ہو جاتا تو ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا۔ ایک سے زائد ایڈیشن شائع کرنے کی نوبت آجاتی۔ کئی سو نام ایسے درجِ رجسٹر تھے جن کی طرف سے صلائے عام تھی کہ جب دیوان شائع ہو، بلا استصواب واستفسار فوراً ان کے نام بہ ذریعہ وی۔ پی ارسال کیا جائے۔ ان میں زیادہ تر ایسے لوگ تھے جو معمولی قیمت پر اسے خریدنے پر آمادہ تھے اور ایسے لوگوں کی تعداد بھی کافی تھی جو پچیس رُپے سے لے کر سو رُپے تک فی نسخہ کے آڈر بُک کرا چکے تھے۔

ایک دشواری یہ ہو سکتی تھی کہ مالی دشواریوں کی وجہ سے ریاضؔ طباعت کی ذمے داری اپنے سر لینے کی ہمت نہ کرتے ہوں یہ بات بھی نہیں تھی متعدد ایسے لوگ تھے جو طباعت کے تمام مصارف اپنی جیب سے ادا کرنے کو تیار

تھے۔ ان میں سب سے پہلا نام مہاراجا محمود آباد کا ہی۔ پھر سر شاہ سلیمان کا، ان کے بعد جسٹس اسماعیل (الہ آباد ہائی کورٹ) کا نام آتا ہی۔ یہ سب حضرات نہ صرف طبعِ دیوان کی ذمے داریاں اُٹھانے بلکہ اس کے مصارف بھی اپنی جیب خاص سے ادا کرنے کو تیار تھے۔

پھر بھی ان آسانیوں اور سہولتوں کے باوجود دیوان کیوں نہ شائع ہوا؟ یہ ایک طویل داستان ہی جسے مختصر طور پر یہاں بیان کرتا ہوں:-

دیوان کی گم شدگی

موانع میں ایک بڑا مانع یہ تھا کہ ریاضؔ کی زندگی بھر کی کمائی مکمل دیوان ضائع ہو گیا۔ اس کی تفصیل قاضی تلمذ حسین کی زبان سے سُنیے:-

"حضرت مرحوم جب اپنا سامان لے کر (سنہ ۱۹۰۷ء میں) گورکھ پور سے (لکھنؤ) جا رہے تھے تو راستے میں ان کا ایک بکس چوری ہو گیا۔ دیوان اسی بکس میں تھا۔ منکاپور اور گونڈہ کے درمیان ایسا ہوتا رہتا ہی کہ چور چلتی گاڑی پر چڑھ آتے ہیں اور دروازہ کھول کر بکس گرا دیتے ہیں اور پھر خود بھی کود جاتے ہیں۔ انٹر کلاس میں یہ واردات زیادہ ہوتی ہی۔ حضرت ریاضؔ کا وہ بکس جس میں دیوان تھا، اسی طرح غائب ہوا۔ منشی امیر اللہ تسلیم کے حالات میں حسرت موہانی نے

لکھا تھا کہ منشی صاحب مرحوم نے ایک داستان نظم کی تھی۔ وہ گُم ہو گئی۔ آپ نے کمالِ استقلال سے فرمایا کہ "خیر ایک پیسہ روز کا تیل اور سہی!" ایک داستان میں تو یہ ممکن ہے لیکن دیوانِ غزلیات جو مدت العمر کا سرمایہ ہو وہ پیسے روز کے تیل سے نہیں ہو سکتا!"

اس حادثے نے ریاضؔ کو بہت دل برداشتہ کر دیا تھا۔ وہ دوبارہ تکمیل اور تسوید کی طرف توجہ کرتے تھے مگر طبیعت گھبرا جاتی تھی اور کام ادھورا چھوڑ کر پھر دُوسری طرف متوجہ ہو جاتے تھے۔

فی غزل ایک آنہ!

میرے بچپن کا واقعہ ہے ریاضؔ کو تکمیلِ دیوان کا شوق پیدا ہوّا۔ فکر ہوئی کہ غزلیں جمع ہوں۔ یہ کام وہ خود کر نہیں سکتے تھے۔ مَیں بچپن ہی سے اخبار، رسالے، کتابیں سمجھوں یا نہ سمجھوں، پڑھنے کی کوشش ضرور کرتا تھا۔ انھوں نے میری اس عادت سے فائدہ اٹھایا، بلایا۔ مَیں حاضر ہوّا تو فرمایا ان الماریوں میں گلچیں کے پرچے رکھے ہوئے ہیں۔ پیامِ یار کی جلدیں ہیں، دُوسرے رسالے بھی ہیں، تم ان کی حسبِ عادت ورق گردانی کرتے جاؤ۔ میری جو غزل نظر آئے اس پر پنسل سے نشان لگاؤ اور مجھے لا کر دے دو۔ ہر غزل پر تمھیں ایک آنہ انعام ملے گا۔

مقفل الماریوں کا چارج اور ہر غزل پر ایک آنہ انعام، یہ اتنی بڑی کشش تھی کہ سب کام چھوڑ کر میں اسی میں لگ گیا۔ مجلد پرچے کم تھے۔ بکھرے ہوئے اور متفرق پرچے بہت تھے۔ ان میں بہت بڑی تعداد مکررات کی بھی تھی۔ خاصا محنت کا کام تھا لیکن میں نے اسے بڑی خوشی سے کیا۔ ریاض صاحب کو انعام کا اعلان کرتے وقت یہ خیال شاید نہیں رہا تھا کہ اکنیوں کی تعداد سیکڑوں تک بھی پہنچ سکتی تھی اور میں اسی خیال میں تھا، چند ہی روز کے اندر میں نے صدہا غزلیں ان کے سامنے ڈال دیں۔

اب وہی معاملہ درپیش ہوا جو فردوسی اور محمود غزنوی میں پیش آیا تھا۔ فردوسی کو امید تھی شاہ نامے کے ہر ہر شعر پر اشرفی ملے گی۔ میں فی غزل اکنی کی تاک میں تھا اور وہ اب اکنی کے خیال سے اتر کر پیسے کی حد میں آ گئے تھے اور وہ بھی نقد نہیں وعدۂ فردا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں بد دل ہو گیا اور میں نے ہاتھ کھینچ لیا انھوں نے بھی زیادہ توجہ نہ کی۔

اعلا معیار

دوسرا بہت بڑا مانع ریاض کی نفاست پسندی، اور بلند معیاری کو سمجھیے۔ وہ چاہتے تھے جیسے وہ خود ہیں ــــ شان دار، جیسے ان کے اشعار ہیں ــــ آب دار، ویسا ہی

ان کا دیوان بھی ہو، وہ اپنے دیوان کو گل و گل زار دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کیا بہ اعتبارِ طباعت اور کیا بہ لحاظِ کتابت وہ ایک ایسا نمونہ ہو جس کی دوسرے تقلید کریں، جسے دیکھ کر لوگ عش عش کر اٹھیں، دیوان کی طباعت تو آسان تھی، لیکن ان شرائط کے ساتھ ایک بہت بڑا مرحلہ تھا۔

مجنوں گورکھپوری لکھتے ہیں:-

"۲۶ء سے ۲۷ء کا زمانہ تو لکھنؤ میں اکثر ریاض کی صحبتوں میں گزرتا تھا۔ نظیر آباد میں نگار اور مرقع کا دفتر ایک ہی احاطے میں تھا۔ ایک طرف نیاز صاحب اور دوسری طرف وصل صاحب، میرا لکھنؤ جانا برابر ہوا کرتا تھا اور مہینوں قیام رہتا تھا۔ ریاض دسویں پندرھویں دن اکثر آیا کرتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب وہ سوتے سوتے پھر جاگ اُٹھے تھے اور اپنا مےخانہ (دیوان) تیار کرانے کا سودا پھر ان پر سوار تھا۔ ریاض اور وصل صاحب اس خیالی دیوان کی فکر میں شہر کا چکر لگانے پھرتے تھے اور شام کو ریاض، نیاز صاحب، وصل صاحب، امتیاز صاحب اور میں ایک پنج تن بن کر بیٹھتے تھے اور بڑے انہماک کے ساتھ دیوانِ ریاض کے حلیے، اس کے بناؤ سنگار اور اس کے مستقبل پر بحث ہوتی تھی۔ کچھ دنوں تک تو روز کا یہ دستور تھا مگر بالآخر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اتنا بھی نہیں طے ہو پایا کہ حاشیے پر بیل کس وضع کی ہو؟ اور یہ کوئی پہلا تجربہ نہ تھا

اس سے بیس برس پہلے اسی گورکھ پور میں دیوان ریاضؔ کا جو اہتمام تھا اسے گورکھ پور کا ہر شخص جانتا ہے۔"

قاضی تلمذ حسین صاحب کا بیان ہے:-

"سب سے پہلے دیوان کی طبع کا خیال ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوا۔ حکیم برہم مرحوم کے ہاں مجلسِ شعرا منعقد ہوئی اور یہ رائے قرار پائی کہ سو ایسے اشخاص ہو جائیں جو پندرہ روپے فی جلد دینا منظور کریں۔ چند روز کے اندر بہت سے لوگوں نے نام لکھائے مگر یہ انتظام پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچا کیوں کہ اہم سوال روپے کا نہیں تھا بلکہ اہم سوال یہ تھا کہ حضرت مرحوم دیوان مرتب کر کے دیں۔"

پھر وہی اہتمام!

قاضی تلمذ حسین لکھتے ہیں:-

"۱۹۱۴ء میں پھر اس طرف خیال رجوع ہوا۔ مرحوم مہاراجا محمود آباد کو اصرار تھا کہ دیوان ممدوح کی طرف سے ریاست کے مطبع میں طبع ہو۔ اہلِ گورکھ پور اپنا حق جتاتے تھے۔ لکھنؤ کے تعلق سے خان بہادر احمد حسین کا قدم بھی درمیان میں آگیا تھا۔

ریاست محمود آباد میں طبع دیوان سے حضرت مرحوم گھبراتے تھے۔ اوّل تو حضرت مرحوم کا خیال تھا کہ دیوان بہت ہی اعلا درجے کا طبع ہو اور ریاست کے مطبع میں یہ

زرا دشوار تھا۔ پھر گورکھ پور کا نمبر آیا۔ حضرت مرحوم کو خیال ہوا کہ ایک خاص ایڈیشن بھی ہو اور جو لوگ پچاس روپے دیں، ان کے نام اس میں طبع ہو جائیں اور اس قسم کے تمام نسخوں پر حضرت مرحوم دستخط بھی فرما دیں۔ فہرست کھلی، نام لکھے گئے ہیں نے نو لکھے۔ ارشاد ہوا اتنا اور لکھ دو۔

نرخ بالا کُن کہ ارزانی ہنوز!

یہ بھی لکھ دیا، مگر کام کچھ آگے نہ بڑھا۔ اس مرتبہ سرگرم کار مولوی فاروق صاحب ام۔اس۔سی (علیگ۔) اور سید جمشید علی صاحب رئیس تھے۔ یہ دونوں اصحاب کُل مصارف اپنی جیب سے ادا کرنے پر آمادہ تھے۔ مگر دیوان اب بھی پردۂ خفا سے عرصۂ شہود پر نہیں آیا۔ ان کا رجحان اس طرف تھا کہ دیوان لکھنؤ میں طبع ہو، کیوں کہ خیرآباد سے لکھنؤ جانا قدرے آسان تھا!"

اب بھی جو رکاوٹ پیش آرہی تھی، وہ دیوان کی عدم تکمیل تھی۔ ریاضؔ جیسے لااُبالی شخص کے لیے یہ کام بڑا کٹھن تھا۔ نواب اختر یار جنگ میناؔئی فرماتے ہیں:-

"ریاضؔ کی طبیعت میں رنگینی اور شوخی کے ساتھ لااُبالی پن بھی تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ بڑے مستغنی المزاج تھے۔ اپنے کلام کو جمع کرنے کا خیال کبھی نہیں آیا۔ لوگوں کو بہت سے شعر اور غزلیں کہہ کر دے دینے میں کبھی بخل نہیں کرتے تھے!"

ظاہر ہے جو شخص "شعر اور غزل" کہہ کہہ کر دوسروں کو

دے دے اور جو اتنا مستغنی ہو کہ اپنے کلام کے جمع کرنے کا خیال بھی نہ کرتا ہو اس کے لیے گُم ہوتے دیوان کو ازسرِ نو مرتّب کرنا کتنا دشوار ہو گا۔

نئی کوشش!

دس برس اور گزر گئے، نہ دیوان شائع ہوا نہ اس کی تکمیل ہو سکی۔ ۱۴ء کے بعد جو سکون پیدا ہوا وہ ۲۳ء تک قائم رہا۔ اس کے بعد قاضی تلمّذ حسین کا بیان ہے کہ:۔

"۲۴ء میں مَیں حیدر آباد سے لکھنؤ گیا اور مرحوم حسبِ عادت اپنی شفقتِ بزرگانہ سے تشریف لائے خان بہادر احمد حسین صاحب رضوی کے ہاں گفتگو ہو کر یہ قرار پایا کہ خان بہادر اپنی ذمّے داری پر دیوان طبع کرائیں۔ وہ نہ صرف اخراجات برداشت کرنے بلکہ اہتمام کے لیے بھی آمادہ تھے اور اپنے وسیع اثرات اور تعلّقات کی وجہ سے بہترین انتظام کر سکتے تھے۔ مَیں کامل اطمینان کے ساتھ لکھنؤ سے گورکھپور گیا مگر سال گزر گیا اور عملاً کچھ نہ ہوا۔ دوسرے سال پھر یہی صورت پیش آئی اور پھر یہی قرارداد ہوئی مگر نتیجہ حسبِ بالا۔"

اس دس برس کے طویل عرصے میں نہ دیوان مکمل ہوا نہ خان بہادر صاحب اپنی ذمّے داری پوری کر سکے۔

آٹھ برس کے بعد

اسی خیال آرائی اور تجدیدِ عہد میں آٹھ برس کی مدت اور بیت گئی۔ بہ قول قاضی تلمذ حسین :-

"آخر ۱۹۳۱ء میں خان بہادر مولوی اسماعیل صاحب بیرسٹرایٹ لا (اب جج ہائی کورٹ الہ آباد) اور مولوی رضوان اللہ صاحب نے کمرِ ہمت باندھی اور تہیّہ کر لیا کہ رُپیہ بلا تاخیر نقد جمع ہو جائے۔ حضرت ریاض کے دیوان کے لیے رُپیہ کون نہ دیتا اور پھر ایسے دو اصحاب کی سرگرمی۔

غرض ۲۷ برس کی گفت وشنید اور وعدہ وعید کے بعد ۱۹۳۳ء میں یہ ہوا کہ حضرت مرحوم نے اوائل سنہ میں دیوان کا ابتدائی حِصّہ اور مئی تک بقیہ حصّہ مرتّب کر کے حوالے کر دیا۔ اگر مَیں یہ کہوں تو کچھ بے جا نہ ہو گا کہ جن لوگوں نے اس دیوان کے طبع کی فکر و کاوش میں ایک عمر گزار دی تھی، ان کی جان میں جان آ گئی۔

حضرت مرحوم دیوان دو رنگ میں چھپوانا چاہتے تھے یعنی جدوَل سُرخ ہو اور محض جدوَل نہ ہو بلکہ باریک انگوری بیل ہو، نمونہ طبع ہوا اور حضرت مرحوم نے پسند فرما لیا اور یہ طے ہو گیا کہ کام کا اِجرا ہو جائے۔

دیباچۂ دیوان کے لیے مرحوم کا اِصرار اور سخت اِصرار تھا کہ مَیں لکھوں مگر مجھے عذر تھا۔ مَیں اپنے طور پر ایک دُوسری

ہی تجویز قائم کر چکا تھا۔ خیال یہ تھا کہ ایک "خمریاتِ ثلثہ" ترتیب دوں۔ جس کے اجزا اپی کیورس حافظ اور ریاض ہوں۔ میں اپی کیورس اور حافظ کے نوٹ مرتب کر چکا تھا، صرف یہ انتظار تھا کہ حضرت مرحوم کا دیوان مرتب ہو جائے تو اس میں سے اشعار کا انتخاب کر لوں۔ چوں کہ اس رسالے میں ریاض کے خمریات پر بحث لازمی تھی۔ اس لیے میرا عذر یہ تھا کہ میں ایک ہی بحث کو دو جگہ نہیں لکھ سکتا۔

بہت ردّ و قدح کے بعد یہ طے پایا کہ مولوی فاروق صاحب ام۔اس۔سی ذاتی حالات لکھیں۔ مولوی سید محمد کامل حسین صاحب ام۔اے شاعری پر تبصرہ کریں اور جناب وصل بلگرامی اُردو شعرا کے کلام سے حضرت ریاض کے کلام کا مقابلہ کریں"۔

یہ سارے اہتمام اس لیے ریاض کے پیشِ نظر تھے کہ وہ اپنے دیوان کو بہ ہمہ وجوہ بہتر اور برتر بنانے کی فکر میں تھے۔

آخری روڑا

اب سارے مراحل طے ہو چکے تھے۔ دیوان کی ترتیب اور تسوید کا کام بھی انجام پا چکا تھا اور صاف ہو کر "دیوان کمیٹی" کے پاس گورکھپور پہنچ بھی چکا تھا۔ بہ ظاہر کوئی ایسا مانع نہ تھا کہ دیوان کی طباعت اور اشاعت

میں رُکاوٹ پیدا ہوتی لیکن:

تدبیر کُند بندہ تقدیر کُند خندہ

والا معاملہ پیش آیا۔ قاضی تلمذ حسین فرماتے ہیں:۔

"مولوی رضوان اللہ صاحب کچھ تردّدات میں گرفتار ہو گئے۔ دیوان کی طباعت میں تاخیر پر تاخیر ہوتی چلی گئی تا آں کہ خود حضرت مرحوم چل بسے۔

کاش مولوی سبحان اللہ خاں کے ذہن میں ترمیم کا خیال نہ آیا ہوتا تو حضرت مرحوم کی زندگی میں دیوان اگر مکمل طبع ہو کر شائع نہ ہو جاتا تو اس کا ایک معتد بہ حصّہ ضرور چھپ گیا ہوتا۔ دل کا کچھ بار ہلکا ہو جاتا۔

طبعِ دیوان کی صورتیں جس طرح بنتی اور بگڑتی رہیں، انھیں دیکھتے ہوئے ایک دفعہ حکیم برہم مرحوم نے مجھ سے کہا تھا کہ" دیوان کا چھپنا بھائی صاحب کی قسمت کا نہیں ہے!" یہ قول سچ ہو گیا!"

آخر کار

سنہ ء میں طبعِ دیوان کی تحریک اُٹھی۔ بار بار اُٹھتی اور دبتی رہی۔ ۱۳ء میں، ۲۴ء میں، ۳۱ء میں نئے نئے محرک پیدا ہوئے، نئے نئے قدردان پیدا ہوتے، نئے نئے کارگزار میدان میں آتے۔ لیکن اس طویل عرصے میں اصل کام نہ ہو سکا۔ دیوان بہ دستور پردۂ خفا میں مستور رہا۔

کمیٹیاں بنیں، جلسے ہوئے، تجویزیں پاس ہوئیں، اسکیمیں تیار ہوئیں، سب کچھ ہوا مگر دیوان نہ چھپ سکا۔

آخر تقریباً ۳۲ سال کی سعی و کوشش اور جد و جہد کے بعد ہر کمیٹی اور ہر محرک سے بے نیاز ہوکر ریاضؔ کے عزیز ترین اور محبوب ترین دوست قاضی تلمذ حسین نے یہ کام حیدر آباد میں بیٹھ کر انجام دیا لکھنؤ کو حسرت تھی کہ دیوان وہاں طبع ہو، گورکھ پور کا مطالبہ تھا کہ دیوان وہاں چھپے لیکن ان دونوں سے حیدر آباد بازی لے گیا

دیوان چھپا۔ پردۂ خفا سے عرصۂ شہود پر جلوہ فگن ہوا۔ لیکن یہ کہتا ہوا:

جب اُٹھ گئے بازار سے گاہک تو ہم آئے!
اُس وقت جب نہ ریاضؔ موجود تھے نہ اُن کے قدردان!

(۱۰) شاعری پر ایک سرسری نظر

یہ رنگ یہ شوخی یہ سلاست یہ نفاست
کہتے ہیں ریاضؔ آپ تو اشعار بہت خوب!

ہندستان کے شعرا میں ریاضؔ کا نام شہرتِ عام اور بقائے دوام کی نعمت سے مالا مال ہے۔ گل و بلبل، زُلف و عارض، چشمِ فتّاں اور ابروئے خم دار، تبسم جاں بخش اور قہر جاں سوز، بیماریِ دل اور رنجوریِ جگر کی داستانیں

بیان کرنے والے شعرا کی نہ پہلے کمی تھی، نہ ہی اور نہ شاید ہو گی۔ اسی ہجومِ عام میں کبھی کبھی کوئی ایسا شاعر بھی نظر آجاتا ہے۔ جو فن کا امام، زبان کا ماہر، وارداتِ دل کا ترجمان، حسیاتِ قلب کا پیام بر اور حقائق و معارف کا منّاد و مبلّغ ہوتا ہے۔ ریاضؔ کا شمار اسی آخری قسم سے ہے۔

شاعری کی تمام اصناف میں میرا خیال ہے کہ غزل کی شاعری بہت زیادہ کٹھن ہے۔ یہ موضوع جتنا زیادہ پیش پاافتادہ ہے اسی قدر "سہل ممتنع" بھی ہے۔ غزل عبارت ہے دل کی ترجمانی سے، عشق و محبّت کی صحیح واردات کی تصویر کشی سے حسیات و محاکات سے۔ جو لوگ عشق کی نعمت سے محروم ہیں (اور شاعری کی دولت سے بہرہ ورہیں) لیکن اشعار میں حسرت اور نامرادی کا نقشہ کھینچتے ہیں۔ جو شوقِ حسرت اور حرمانِ سکوں آمیز کی لذّت سے ناآشنا ہیں لیکن اپنے اشعار میں شوق و حرماں کے نقش و نگار بناتے ہیں، وہ بہ حیثیت پیشہ ور شاعر کے یقیناً کام یاب ہیں لیکن بقاے دوام کا خلعت ان کی قامت پر راس نہیں آتا۔

ہر دور میں ایسے شعرا بھی ہوتے ہیں جو اپنے واردات وتاثرات کو شاعری کا جامہ پہنا کر منظرِ عام پر پیش کرتے ہیں۔ ریاضؔ کی زندگی سے جو لوگ واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ ریاضؔ کی زندگی، عشق و محبّت —— کام یاب عشق اور کام یاب محبّت، ساتھ ہی ساتھ ناکامی ونامرادی

—— جاں ستاں ناکامی اور عبرت انگیز نامرادی اور پھر ساتھ ہی ساتھ شگفتہ روئی ۔ خندہ جبینی اور شوخ طبعی کا کیسا متضاد اور کیسا عجیب و غریب مجموعہ تھی ۔ وہ اپنے اشعار میں اپنی زندگی کے ہر دور کی بہترین تشریح پیش کرتے ہیں۔

شوخی!

ریاضؔ کی شاعری کا ایک اہم عنصر ان کی شوخی و شرارت ہے ۔ اس برجستگی ، بے ساختگی اور بے تکلفی سے وہ اپنی شوخیِ طبع کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ بس:

وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی!

شیخ و واعظ ، ناصح اور مُرشد عرصے سے شعرا کے تختہ مشق بنے ہوتے ہیں ۔ ریاضؔ کی زندہ دلی اور چُلبلی طبیعت ان غریبوں کو کیوں چھوڑتی ؟ فرماتے ہیں اور کس خوبی سے فرماتے ہیں:

کیا بڑا تے کی صدا تھی سرِ ناصح کی قسم
کسی مے کش نے سبو کوئی اُچھالا ہوگا

ساغر میں یہ افشردۂ انگور ہے ای شیخ
اس چیز سے حضرت کو بھی انکار نہ ہوگا

اس واسطے کہ آؤ بھگت مے کدے میں ہو
پوچھا جو گھر کسی نے تو کعبہ بتا دیا

بوتل جو اس کے حجرے میں بھنڈے بھری ملی
زاہد بھی آدمی ہے بڑے اعتبار کا

چوری گیا ہے رات کو جو دُکاں سے خُم
نکلا ہے نام زاہدِ شب زندہ دار کا

ہم رِند سمجھتے ہیں اُسے انجمنِ وعظ
جس بزم میں ذکرِ مے و مینا نہیں ہوتا

جناب شیخ نے جب پی تو مُنھ بنا کے کہا
مزا بھی تلخ ہے کُچھ بُو بھی خوش گوار نہیں

نکلی ہیں حشر میں دُنیا کی پُرانی باتیں
ہم تو کیا میرے فرشتوں کو بھی اب یاد نہیں

وہ آ رہا ہے عصا ٹیکتا اُدھر ناصح
بہا دے اتنی کہ ساقی کہیں نہ تھا رہے

وہ بھی بخشے گئے ہم بادہ کشوں کے ہم راہ
آج جنّت میں ہمیں ناصحِ مغفور ملے

اسلام کا مفتی فتوا دیتا ہے کہ شراب حرام ہے۔ ریاضؔ اس فتوے کی روشنی میں ایک نئی بات پیدا کرتے ہیں:۔

جس دن سے حرام ہو گئی ہے

مے خانہ مستام ہو گئی ہے

صیاد کو بد دعا دے کے اپنے دل کو تسلّی دیتے ہیں:۔

صیاد کو جو مجھ پہ یارب ترس نہ آئے

گلشن میں موسمِ گل لاکھوں برس نہ آئے

ریاضؔ درِ توبہ بند ہونے کی خبر سنتے ہیں تو کس اطمینان سے فرماتے ہیں۔

بند ہوتا ہے اب درِ توبہ — درِ مے خانہ واکرے کوئی

گنہ گاروں کی صف میں جب شاعر پابہ جولاں لایا گیا تو اپنی "صفائی" اس طرح دیتا ہے:

اہلِ عصیاں کی کمی حشر میں دیکھی نہ گئی

ایک ہم اور ملے آکے گنہ گاروں میں

چند اشعار اور ملاحظہ ہوں:۔

ہنس ہنس کے عبث آپ مجھے کوس رہے ہیں

رو رو کے مرے واسطے مانگیں گے دعا آپ

خدا کے ہاتھ ہے بکنا نہ بکنا مے کا اے ساقی

برابر مسجدِ جامع کے ہم نے بھی دُکان ڈھا لی

توبہ کرتے ہوئے رہ رہ کے یہ آتا ہی خیال
مُنھ مرا دیکھ کے رہ جائے گا ساغر میرا

یادِ ایّام!

ریاضؔ کا عہدِ شباب عیش و نشاط کی فراغ خاطر اور اطمینان و آسودگی کا عہد تھا۔ پھر دوسرا دور وہ آیا کہ پاکی اور پاکیزگی ان کا طرۂ امتیاز رہا۔ گوشہ نشینی کے اس عالم میں کبھی کبھی انھیں گزرا ہوا زمانہ یاد آجاتا ہی تو مزے لے لے کر درد و حسرت کے ساتھ اس عہدِ زرّیں کو یاد کرتے ہیں،

اب نہ وہ شاہد پرستی ہی نہ ذوقِ مے کشی
مِٹ گئیں وہ صحبتیں وہ مشغلہ جاتا رہا

وہ راتیں یاد آتی ہیں وہ باتیں یاد آتی ہیں
مرا کھل کھیلنا ظالم ترا مجبور ہو جانا

پیری میں وہ شباب کی سج دھج کدھر گئی؟
وہ بانکپن وہ طرّۂ دستار کیا ہوا؟
رنگیں وہ بادہ مے گل رنگ کیا ہوئے
پیشِ نظر جو تھا وہ چمن زار کیا ہوا؟

سن اور تھا دل اور تھا کچھ اور تھا عالم　　اب ہم کو کسی بات کا ارماں نہیں ہوتا

وقت کے ساتھ گئیں وقت کی باتیں بھی ریاضؔ
نہ وہ ہم ہیں نہ وہ دل ہو نہ زمانہ دل کا

وہ نخل، نہ وہ باغ، نہ وہ شاخِ نشیمن
ای اہلِ قفس چھوٹ کے ہم جائیں کدھر اب؟

وہ مزے وصل کے وہ مینہ کا برسنا رم جھم
اُف رہی برسات کی رُت، ہاتے رہی برسات کی رات

وہ دن گئے، گئیں غمِ اُلفت کی لذّتیں
اب تو ہو مبتلائے غمِ روزگار دِل

چُٹکیاں!

زندہ دلی اور خوش طبعی ریاضؔ کا حِصہ تھی۔ شیخ وزاہد اور واعظ و ناصح پر جب وہ چوٹ کرتے ہیں تو چُٹکیاں بھی لیتے ہیں:۔

نہ رہے جبۂ ودستارِ امامت باقی — غم غلط کرنے کا افسوس یہ ساماں نہ رہا

دھوکے سے پلا دی تھی اسے بھی کوئی دو گھونٹ
پہلے سے بہت نرم ہو زاہد کی زباں اب

لگا کے دھوکے سے مُنھ شیخ پھر نہ چھوڑ سکا
پکارتا ہی رہا ئیں ارے شراب ، شراب

آتے ہیں جو مے خانے میں واعظ بہت اچھا
بن کر وہ یہاں آتے ہیں ہشیار بہت خوب

جام چھلکانے لگے بھر کے کوثر کے آپ
حضرتِ واعظ بہت اُچھے گئے ممبر سے آپ

مے خانہ ہمارا کوئی مسجد تو نہیں ہے   تسبیح لیے کون بزرگ آئے اِدھر آج

ابھی تھوڑی سی اس کو اپنی بوتل سے پلائی ہے
ذرا رندو! شباب شیخِ فانی دیکھتے جاؤ

ایک واعظ ہے کہ جس کی دعوتوں کی دھوم ہے
ایک ہم ہیں جس کے گھر کل مے ادھار آنے کو تھی

کبھی کبھی اپنے اوپر بھی چوٹ کر جاتے ہیں:

دنیا کی کوئی بات نہیں جانتے ریاضؔ
اک شخص ہیں ریاضؔ بہت ہی غریب سے

اب پھر اپنے موضوع پر آتے ہیں:

جنابِ شیخ کو ہلکی سی اپنے جام سے دے   مرے سبو کی تو ساقی بڑی کڑی ہوگی

سامنے جامِ مے ہوش رُبا رکھا ہی　　مگر ای شیخ مصلّے سے جُدا رکھا ہی

نزاکتِ خیال

شاعر کی فکرِ بلند نزاکتِ خیال کے بڑے دل فریب مُرقعے پیش کرتی ہی۔ زبان کا لُطف، خیال کی نُدرت، فکر کا انوکھاپن ان سب کو شاعر نگینے کی طرح جڑ دیتا ہی:

وہ جانا مرا رُوٹھ کر مُو کدے سے
صُراحی کا مجھ کو وہ آواز دینا

ای وسعتِ دل تھوڑی جگہ دے کہ بنالوں
بُت خانہ کوئی بُت کدۂ چیں سے بھی اچھا

آئینہ دیکھتے ہی وہ حیران ہو گیا　　دیکھا کسے کہ شمع سے پروانہ ہو گیا

کم بخت نے شراب کا ذکر اس قدر کیا　　واعظ کے مُنھ سے آنے لگی بو شراب کی

وہ کیا شے ہی بتا دے تو مرے ساقی ترے صدقے
کہ جس کے نام سے مُنھ پر ہمارے نور آتا ہی

کبھی آسماں سے کبھی لامکاں سے　　مرے گھر وہ آتی ہی اونچی دُکاں سے

میرے ساقی ترے تبسم سے جام چھلکے، چھلک پڑے خم سے

مقطعے!

اُردو شعرا میں مومن کے مقطعے مشہور ہیں۔ اس باب میں ریاض بھی ایک جداگانہ اور منفرد شان رکھتے ہیں:۔

ریاض خاک درِ میکدہ تھا جیتے جی
فنا کے بعد اسے خلد آشیاں دیکھا

پھرتا تھا اس گلی میں عجب وضع سے ریاض
اک پشت خار ہاتھ میں اور سر گھٹا ہوا

بناتی کیا بری گت میکدے میں بادہ نوشوں نے
ریاض آتے تھے کل جامہ پہن کر پارسائی کا

نہ یاری کعبہ والوں سے نہ کاوش دیر والوں سے
ریاض اللہ والا تھا، بڑا مردِ مسلماں تھا

نمازِ عید ہوئی میکدے میں دھوم سے آج
ریاض بادہ کشوں نے ہمیں امام کیا

ہوتی ہیں وہاں کوہ کن و قیس کی باتیں
مدت سے ریاض آپ کا چرچا نہیں ہوتا

ہیں جو آیا غیر سے ہنس کر کہا اس نے ریاضؔ
ختم ہے جس پر شرافت وہ کمینہ آ گیا

ریاضؔ اُٹھ کر وہاں سے یوں نگہ نیچی کیے آئے
کہ جو دیکھے وہ جانے ہیں بڑے پرہیزگاروں میں

جنھیں لوگ کہتے ہیں دزدِ مے وہ خدا پرست ریاضؔ ہیں
یہ سُنا ہے کل کہ جناب ہی پسِ خُم تھے محو نماز میں

پی کے تم کو وعظ کہتے ہم نے دیکھا ہے ریاضؔ
ہم بلا نوشوں میں تم بھی کتنے عالی ظرف ہو

آگے کچھ بڑھ کر ملے گی مسجدِ جامع ریاضؔ
اک ذرا مُڑ جائیے گا میکدے کے در سے آپ

موقع کے اشعار

ریاضؔ کے دیوان میں ایسے اشعار بھی کافی تعداد میں ملتے ہیں جو موقع کے اشعار کہے جا سکتے ہیں۔ خطوں میں، تقریروں میں ان کا برمحل استعمال بڑی کیفیت پیدا کر سکتا ہے:-

تری نوکِ قلم نے دل میں گہرے زخم ڈالے ہیں
ہزاروں دشنہ و خنجر لیے خط کا جواب آیا

اسی کی جان پر ٹوٹا فلک اتنی بلندی سے
جسے بیٹھا تمھارے سایۂ دیوار میں دیکھا

دونوں جاں دادۂ مذہب ہیں مگر وقت کی بات
کوئی ہندو نہ رہا کوئی مسلماں نہ رہا

فریاد میں کم ہو اثرِ دردِ نہاں اب
ہم آپ بدلنے کو ہیں اندازِ فغاں اب

فریادِ جنوں اور ہے بُلبُل کی فغاں اور
صحرا کی زباں اور ہے گلشن کی زباں اور

بات کیا چاہیے بگڑنے کو   رُوٹھ جانے کے ہیں ہزار طریق

زمانہ بنا دے جنھیں اب وہی ہیں
زمانے کے لائق زمانے کے قابل

تو نے توبہ کی تو ہے لیکن ریاضؔ   بات کا تیری ٹھکانا کچھ نہیں

بے ساختگی!

ریاضؔ کا کلام روانی اور بے ساختگی کے اعتبار سے بھی

"خاصہ" کی چیز ہی!:-

حشر میں تو کدہ والو جو خدا نے چاہا یہی جلسہ یہی ساغر یہی مینا ہوگا

دھوکے میں پڑے کوئی نہ امید وفا پر

ہوگا نہ ہوا ہی وہ دغا باز کسی کا

خانقہ میں جو کبھی طاق سے مینا اُترا

ہم یہ سمجھے کوئی رحمت کا فرشتہ اُترا

یہ دوش ابر پر جاتے ہیں خُم کے خم کہاں ساقی

بتا دے آج شورِ قلقلِ مینا کہاں ہوگا؟

نہ تجھ سے واعظ مجھے تکلف نہ مجھ سے واعظ تجھے تکلف

ہر ایک دعوت میں بے تکلف شراب میری کباب تیرا

کس مزے کی ہوا میں مستی ہی کہیں برسی ہی آسماں سے آج

پینے کا مزا جب ہی کہ خم منھ سے لگا ہو

مجھ رند سے ساقی یہ کہے جائے کہ ہاں اور

مجھے ہی خون کا دعوا مجھے ہی انھی پر داورِ محشر انھی پر

بہار آئی کہ آئی وصل کی شام کھلے غنچے، کھلیں کلیاں، کھلا دل

مالک مرے مَیں نے مے کشی کی لیکن یہ خطا کبھی کبھی کی

دوُر سے دیکھ کے۔ پھرنا وہ مرا اُلٹے پاؤں
اُف وہ بدلے ہوئے تیور ترے دربانوں کے

یہ چھلکتا ہوا کیا جامِ شراب آتا ہی
اہ مَیں قربان مرا عہدِ شباب آتا ہی

آتے مینا سے جام میں جب تک
ہم نے پی لی گھڑے گھڑے خُم سے

دوڑے گی خون بن کے اُترتے ہی حلق سے
جو کالی کالی بوتلوں میں لال لال ہی

جب سُن چکے وہ حال تو یہ کہ کے رہ گئے
او جھوٹے ہی بیان ترا کس قدر غلط

مذہبیت!

اگرچہ ریاض کی شاعری رندی و سرمستی، عیش و نشاط اور

خوش باش دمے کہ زندگانی این ست! . .

کی شاعری ہے لیکن اگر وہ رِند تھے بھی تو رندِ پاک باز، مذہبیت ان کی رگ رگ میں رچی ہوئی تھی۔ یہ شرابِ ناب اور افشردۂ انگور کی حکایاتِ رنگیں بیان کرنے والا شاعر حقیقۃً ایک مردِ صالح، ایک تہجد گزار اور متقی آدمی تھا۔

کبھی کبھی ریاضؔ کی مذہبیت اشعار کی صورت میں نمودار ہوتی ہے:-

مجھے کیا ڈر ہے کہ ہوں گے مرے سرکار شفیع
مجھے کیا ڈر ہے کہ تو بخشنے والا ہوگا

کام تو ہیں کافروں کے نام ہے اسلام کا
اب مسلماں رہ گیا کوئی نہ ایماں رہ گیا

کیا زمانہ ہے کہ دشوار نظر آتا ہے لاکھ دو لاکھ میں بھی صاحبِ ایماں ہونا

آگیا تقدیر سے میری مدینہ آگیا
جس سے بامِ عرش پر پہنچوں وہ زینہ آگیا

ہے عرشِ بریں اور مدینے کی زمیں اور
اللہ یہاں کے ہیں مکاں اور مکیں اور
اُٹھ اُٹھ کے چلے ساتھ کئی طور نشیں اور
جو کعبے کو جاتے ہیں وہ جائیں گے کہیں اور

تو کھول دیں آنکھیں شرفِ سجدۂ در نے
ہیں اپنی نگاہوں میں ریاضؔ آج ہمیں اور

ہم سے سیاہ کاروں کو ہی خوفِ حشر کیا
اُمّت میں ہیں جناب رسالت مآبؐ کی

رعایتِ لفظی

اگلے شعرا رعایتِ لفظی کو بڑا ہُنر سمجھتے تھے۔ مذاق جدید میں یہ ایک غیر پسندیدہ فن ہی۔ واقعہ یہ ہی کہ ہمارے بزرگوں نے رعایتِ لفظی کا جو معیار قائم کیا ہی اور جو نمونہ پیش کیا ہی من حیث الاکثر وہ کچھ زیادہ مرغوب اور دل چسپ ہی بھی نہیں۔ اس صنف کو نباہنا بہت مشکل ہی۔ بڑے بڑے اساتذہ نے اس میدان میں ٹھوکر کھائی ہی۔

ریاضؔ بھی اس میدان میں دوسرے شعرا سے کُچھ آگے نہیں ہیں۔ زیادہ تر اشعار ایسے ہیں جنھیں پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہی کہ یہ آمد نہیں آورد ہی۔ صرف محاورہ، زبان اور صنعت کو نباہنے کے لیے لکھا گیا ہی:-

بطِ مے بھی ساتھ اڑتی جو اڑتے کاگ مے کش
کوئی جوئے پار ہوتی، لب جو شکار ہوتا

شریکِ شکّرلب جو تھا ناصح مجھے قازا سے روغنِ قاز دینا

مرا پانی بھرتا ہے بجلیاں کالی گھٹا والی
جو دیں کانوں کو اپنے زلفوں والی بجلیاں مجھ کو

لیکن کہیں کہیں ایسے اشعار بھی نظر آتے ہیں:
جامِ مے توبہ شکن، توبہ مری جام شکن
سامنے ڈھیر ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے

جذبات و محاکات

پیشہ ور شاعر اور حقیقی شاعر میں مابہ الامتیاز یہی ہے کہ جذبات کی تصویر کشی، وارداتِ دل اور حسیاتِ قلب کا بیان کن الفاظ میں، کس لب و لہجے میں، کس اسلوب اور کس نوعیت سے کرتا ہے؟ جس کے الفاظ بے رُوح ہوں، درد و اثر سے خالی ہوں، کیف اور سوز سے بیگانہ ہوں؛ وہ پیشہ ور شاعر ہے اور جو الفاظ کے ذریعے خیالات کی تصویر کھینچ دیتا ہو، جو حسیات کو جیتا جاگتا مجسمہ بنا کر پیش کرتا ہو، جو واردات کو زندہ اور مرئی صورت میں دکھا دیتا ہو، جس کے الفاظ بولتے ہوئے ہوں؛ وہ حقیقی شاعر ہے۔

آئیے اس معیار پر ریاضؔ کے اشعار پرکھیں — عالمِ نزع طاری ہے، محبوب سامنے بیٹھا ہے، مرنے والا گریۂ حسرت سے دل کی لگی بجھانا چاہتا ہے، لیکن پاسِ وضع کے سبب

بتادو تم ہمیں سب بے داد کرنا سکھا دیں ہم تمھیں فریاد کرنا
قفس کی تیلیاں توڑیں تڑپ کر نہیں آتا انھیں آزاد کرنا

کہتے ہیں خوب رہی ہم نہ ستائیں تم کو
تم جو پا جاؤ ستاؤ ہمیں کیسا کیسا

کیوں اس قدر ہجوم تھا گردِ اس غریب کے
دم توڑتا تھا کوئی تماشہ تو کچھ نہ تھا

سر چڑھا کوئی منھ چڑھا کوئی شانہ گستاخ، آئینہ گستاخ
چھیڑیں دونوں کی ہلکے آنچل سے شوخ کچھ آپ، کچھ صبا گستاخ

آیا تھا روزِ حشر مرے ہونٹ پر گلہ
گردن میں اس نے ڈال دیے مسکرا کے ہاتھ

میں اس نگاہ کے صدقے یہ ہو اثر جس میں
کہ دل میں درد اٹھے بھی تو گدگدی ہو جائے

چلے آتے ہیں خوش خوش کس کے گھر سے
وہ ہنستے کھیلتے بادِ سحر سے

یہ بھی نہیں کر سکتا،
دُکھ جائے گا دل اس لیے جاری ہوئے نہ اشک
دیکھو تو پاس نزع میں کتنا کسی کا تھا
محبت کرنے والا اپنے محبوب کو غیر کے گھر سے آتا ہوا دیکھتا ہے، وہ کس طرح اس منظر کو بیان کرتا ہے۔ ایک مشہور اور زبان زد عام شعر ہے ؎

نہ ہم سمجھے نہ تم آئے کہیں سے پسینہ پونچھیے اپنی جبیں سے

کوئی شبہہ نہیں شعر خوب ہے، لطیف طنز!
پسینہ پونچھیے اپنی جبیں سے!
شعر کی جان ہے۔ ریاضؔ اس منظر کو بیان کرتے ہیں اور تصویر کھینچ دیتے ہیں۔

نکلے تھے مُنھ چھپائے ہوئے گھر سے غیر کے
تصویر بن گئے جو مرا سامنا ہوا

اسی مفہوم کو دوسرے شعر میں اس طرح ادا کیا ہے:۔

غیر کے گھر سے جھجکتے ہوئے تم نکلے تھے
رُکتے دیکھا تمھیں پھر چُھپ کے نکلتے دیکھا

کچھ اور اشعار:۔

شوخی سے ہر شگوفے کے ٹکڑے اُڑا دیے
جس غنچے پر نگاہ پڑی دل بنا دیا

وہ خود چاہتے ہیں کوئی اب ستائے ستانا مزا دے گیا ہے کسی کا

لیا بڑھ کے محشر میں دامن تو بولے
انھیں کیا ہوا ہی یہ کیا ہو رہا ہی

بے طرح ٹوٹتے ہیں دیکھتے ہی دور سے وہ
تم نے اچھا سگِ دربان کو لگا رکھا ہی

نئی ترکیبیں!

پیچیدہ اور مغلق الفاظ، نئی ترکیبیں اور نئے الفاظ ریاضؔ کے ہاں بہت کم ملیں گے، وہ اپنی شاعری میں روز مرہ کی زبان استعمال کرتے ہیں۔ صاف شفاف، رواں اور سبک الفاظ، الفاظ کی نشست اور ترکیبوں کے استعمال سے وہ بڑے بڑے کام نکالتے ہیں۔ ان کے کلام میں نئی ترکیبوں کا ذخیرہ بہت محدود ہی، محدود ہونے کے باوجود اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

مجھے بال و پرِ مایۂ ناز دینا — خدایا پرِ "عرش پرواز" دینا

روزِ ازل تھے ڈھیر ہزاروں لگے ہوئے
چپکے سے چھانٹ لائے دلِ "آرزو پسند"

"حشر آشوب" وہ ہنگامے زمانے میں نہیں
سوئے فتنے ترے کوچے کے جگائیں کیوں کر

ترجیح اٹھیں گے مری آواز سے سب ای صیّاد
دُور رکھنا "قفس افتادہ" عنادل سے مجھے

ابتذال

شوخی اور ابتذال کے ڈانڈے ملے ہوتے ہیں، زرا حدود سے تجاوز ہوا اور شعر اپنی تمام خوبیوں کے باوجود متانت کی بزم اور سنجیدگی کی محفل سے "خارج البلد" ہوا۔

ریاض کے جو اشعار ابتذال کے ماتحت آتے ہیں، وہ اپنی جگہ پر بہترین نفسیاتی تحلیل، واردات اور حُسن و عشق کی عامۃ الورود باتوں کے جیتے جاگتے مرقعے ہیں۔ لیکن چوں کہ شوخی حد سے بڑھ گئی ہی اس لیے سنجیدہ طبائع کا ان پر چونکنا اور ناک بھوں چڑھانا بالکل قدرتی ہی۔ تمثیلاً چند شعر:-

بتائیں کیا تمھیں کیوں کر گلے لگائیں گے
بتائیں کیا تمھیں روزِ وصال کیا ہوگا

چُھپتا نہیں چُھپاتے سے عالم اُبھار کا
آنچل کی تہ سے دیکھو نمودار کیا ہوا

کیا وصل کی شب ہائے بگڑتی ہی بنی بات
کہتا ہوں کچھ اُن سے تو وہ کہتے ہیں بُری بات

اسلوبِ بیان

اشعار کی اثر آفرینی بہت کچھ اسلوبِ بیان کی رہینِ منت ہوتی ہی۔ معمولی سی بات بھی اگر اچھے اسلوب، دل نشین الفاظ اور اثر آفریں انداز میں کہی جاتے تو وہ ایک خاص کیفیت پیدا کر دیتی ہی۔ ریاضؔ اسلوبِ بیان کے بادشاہ ہیں۔ وہ پیش پا افتادہ باتیں بھی کہتے ہیں تو اپنے اسلوبِ بیان سے چار چاند لگا دیتے ہیں:۔

یہ جانتے ہیں کہ دل خاک ہو گیا مٹ کر
نہ آگ دیکھی نہ اُٹھتے ہوتے دھنواں دیکھا

چھپتا ہی مرے ساتھ مرا داغ زمیں میں
اب ڈوب کے یہ چاند نمودار نہ ہوگا

آج شب میں کوئی سو بار تو بجلی چمکی
آج دن میں کوئی سو بار تو صیاد آیا

ننھے سے دل کی چھوٹی سی تُربت بنائی تھی
نقشِ قدم نہ تھا جسے تُم نے مٹا دیا

آتے آتے سرِ مژگاں جو کبھی خشک ہوا
گرتے گرتے وہی آنسو کبھی طوفاں نکلا

شمعِ کعبہ رہے محفوظ الٰہی تا حشر نام روشن ہو اک اُجڑے ہوئے بُت خانے کا

کچھ رنگ ترا حشر میں ہی حد سے سوا زرد
کچھ حد سے سوا آج ہی خونِ شہدا سُرخ

نزع میں یار سے پیمانِ وفا کرتے ہیں
اس دغاباز سے ہم آج دغا کرتے ہیں

عنادل میں، صبا میں چل گئی تھی اُڑا دی بات پھولوں نے ہنسی میں

ہنس کے پوچھا کہ کیا مصیبت ہی سُن کے بولے کہ کیا کرے کوئی

یہ مے کدے کی بھیڑ، یہ انبوہ، یہ ہجوم
ہم تو نکل کے کھوئے گئے خانقاہ سے

تعلّی!

مشرق کے شعرا تعلّی کے موجد اور خودستائی کے امام ہیں۔ ان کی تعلّی میں جو ادّعا ہوتا ہی، وہ ایک پُر لطف سخن گسترانہ دعوے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔
اس موضوع سے متعلّق ریاض کے ہاں اچھے اچھے اشعار

خدمتِ شمع فروزی مرے دم تک تھی ریاضؔ
کیسی تاریک ہی بزم شعرا میرے بعد

میرے بیاں پہ آج ہی طرزِ بیاں کو ناز
میری زباں پہ آج ہی اُردو زباں کو ناز

بہت ہی تم کو اپنے جام پر ناز   ذرا لانا مرا ٹوٹا ہوا دل

پروازِ فکر

علوِ خیال اور پروازِ فکر کے اعتبار سے بھی ریاضؔ پورے شاعر تھے۔ انھوں نے اپنی بلند خیالی اور فکر کی رسائی کے ایسے اچھے اور اچھوتے نمونے پیش کیے ہیں کہ پڑھیے اور سر دُھنیے:

شفقِ سُرخ کی سج دھج یہ کہے دیتی ہی
کہ جوانی میں حسیں یہ فلکِ پیر بھی تھا

یہ کہ رہا ہی ترنّم ہوائی موجوں کا   خموش پھولوں کا حُسنِ بیان نہیں ملتا

خیالِ شب غم سے گھبرا رہے ہیں   ہمیں دن کو تارے نظر آرہے ہیں

غضب حشر کا اب آفتاب ہوتا ہی   نقاب اُٹھتی ہی وہ بے نقاب ہوتا ہی

درد و حسرت

اگرچہ ریاضؔ کی شاعری نے لکھنؤ میں نشو و نما کے مدارج طے کیے۔ جہاں نالہ نغمہ بن جایا کرتا ہے، سوزِ غم، سازِ مسرت کی خوش آہنگیوں میں گُم ہو جایا کرتا ہے، قرب و وصل کی لذت ہجر و فراق کی نعمت چھین لیا کرتی ہے۔ لیکن ریاضؔ اس باب میں ذرا "غیر مقلد" واقع ہوتے ہیں۔ ان کی شاعری کا بڑا حصہ چوں کہ واقعات، مشاہدات اور واردات کی شاعری پر مشتمل ہے اس لیے یہ بالکل قدرتی ہے کہ اگر خوشی کے موقع پر ان کے لب تبسم سے آشنا ہوتے ہیں تو یاس و محرومی گریۂ بے اختیار کی دعوت بھی دے دیتی ہے۔ قرب کی لذت اگر خوش نوائی اور حکایاتِ رنگیں بیان کرنے پر مجبور کرتی ہے تو ہجر و فراق کی صعوبتیں رونے اور رُلانے پر بھی آمادہ کرتی ہیں۔

ریاضؔ کے اشعار میں ایک چیز خاص طور پر قابلِ غور ہے۔ وہ جس تاثر کا اظہار کرتے ہیں، اس کی کیفیت ان پر اس درجہ مستولی ہوتی ہے کہ وہ اس میں ڈوب جاتے ہیں۔ اس طرح کے اشعار عام اس سے کہ مسرت انگیز ہوں یا غم آفریں، اپنا پورا پورا اثر کرتے ہیں:۔

قفس میں رہ کے ستم تیرے دیکھ لیں صیاد
چمن میں رہ کے بہت لطفِ باغ باں دیکھا

ہنگامِ نزع گریہ یہاں بے کسی کا تھا
تم ہنس پڑے یہ کون سا موقع ہنسی کا تھا

حسرت سے کوئی سوئے فلک دیکھتا تھا آج
لب پر گِلہ کسی کا نہ شکوہ کسی کا تھا

کہتے ہیں کہ ہم ہاتھ اُٹھاتے ہیں ستم سے
کیا چرخ بھی اب درپئے آزار نہ ہوگا

ایسے بھی ہیں دُنیا میں جنھیں غم نہیں ہوتا
اِک غم ہے ہمارا جو کبھی کم نہیں ہوتا

پوچھا کسی نے حال تو آنسو ٹپک پڑے
رونا مجھے ہے گریۂ بے اختیار کا

ہنستی ہے تقدیر ہنس لے ان کے ساتھ
دِل مجھے ٹیں اپنے دِل کو رو چکا

نہ وہ عشوہ نہ کرشمہ نہ وہ غمزہ نہ وہ ناز
نہ وہ قاتل ہے نہ قاتل کی ادا میرے بعد

ہم بھی گئے تھے آج مزارِ ریاضؔ پر
پژمُردہ چند پھُول تھے اک اشک بارِ شمع

مجھ سا دُنیا میں ناشکیبا کون؟ مجھ سا دنیا میں ناصبور کہاں؟

اب ہم ہیں اور محویتِ عشق ای جنوں
ہم دم کہاں، ندیم کہاں، ہم نشیں کہاں

کون دل ہی مرے اللہ جو ناشاد نہیں
کون گھر ہی مرے اللہ جو برباد نہیں
ای نسیمِ سحری اس کو لیے جا سوئے بام
نفسِ سرد ہی نالہ نہیں فریاد نہیں

کل ہم گئے تھے دیکھ کے آنسو ٹپک پڑے
بے شمع و گل ریاضؔ کی تربت چمن میں تھی

خمریات

جن لوگوں نے کلامِ ریاضؔ کا مطالعہ کیا ہی، عام طور پر ان کی یہی رائے ہی کہ ریاضؔ ایک مے آشام شاعر تھے۔ جام و بادہ ان کا مشرب، ساغر و مینا ان کا مذہب اور پیمانہ وصہبا ان کا مقصدِ حیات تھا۔ شراب کا ذکر جس تنوع، لُطف اور

کیف سے انھوں نے کیا ہی،کسی نے نہیں کیا۔ عربی زبان میں خمریات کا امام ابونواس تھا اور لاریب کہ عربی زبان اس کا کوئی حریف نہ پیدا کر سکی۔ فارسی زبان میں حافظ کی شراب معرفت اور شراب حقیقی لٹریچر میں ایک گراں بہا اضافہ ہی اور بلاشُبہ فارسی زبان میں حافظ کا کوئی مدمقابل نہ پیدا ہو سکا۔ اُردو زبان میں ریاض نے خمریات کو ایک مستقل حیثیت دی اور بے اندیشۂ تردید کہا جا سکتا ہی کہ اُردو زبان کا کوئی شاعر عام اس سے کہ وہ دہلی سے متعلق ہو یا لکھنؤ سے، میر و سودا کے زمانے کا ہو یا آتش و ناسخ کے دوٗر کا "لہرا کے بل کھا کے" شراب پیتا ہو یا "بر سبیلِ تذکرہ" یہ شاعرانہ کیفیت اپنے اوٗپر طاری کر لیتا ہو، ریاض سے بازی نہ لے جا سکا۔ حالاں کہ ریاض کا دامن بادۂ گل گوں کے داغ سے بالکل صاف ہی۔

شراب کا ذکر وہ بڑی بے ساختگی اور روانی سے کرتے ہیں۔ نئے خیالات، نئے مصطلحات، نیا اندازِ بیان، نیا اسلوبِ ذکر ان کے خمریات کا مابہ الامتیاز ہی۔ وہ کبھی اسے "موکدے والی" کہتے ہیں، کبھی "کالی کالی بوتلوں میں لال لال چیز" سے کام نکالتے ہیں، کبھی اس کا مقام "ظرفِ وضو" میں ہوتا ہی، کبھی "زم زمی" میں، کبھی شیخ کے "حجرے" میں، کبھی "طاقِ مسجد" میں، کبھی اسے "نور" سے تعبیر کرتے ہیں، کبھی "شباب" سے۔

جیسا کہ مَیں ابھی کہہ چُکا ہوٗں، ریاض جس کیفیت کا اظہار کرتے ہیں، پہلے اسے اپنے اوٗپر طاری کر لیتے ہیں۔ خمریات

ہیں ان کی غیر معمولی کام یابی کا راز یہی ہے:۔

مَیں کہیں جاؤں وہ محشر ہو کہ ہو محفلِ وعظ
دوش پر میرے سبو ہاتھ میں مینا ہوگا

ہوگا جنھیں توبہ کا بھروسا مرے مالک
وہ اور ہی ہوں گے یہ گنہ گار نہ ہوگا

ہم گِرے جب لڑکھڑا کر بزم میں سر سبو پر ہاتھ ساغر پر پڑا

دیکھ واعظ مجھ کو میں کیا ہو گیا آدمی تھا، پی، فرشتہ ہو گیا

مے چرانے میں ہمیں ہے یدِ طولٰی کیسا
ہم اُڑا لاتے سبو آج اچھوتا کیسا؟

چلّو ہی بھر سہی ہمیں تسکین اس سے تھی
جب تک سبو میں تھی غمِ فردا تو کچھ نہ تھا

کبھی ممکن نہیں مے خانے کا ویراں ہونا
کبھی ممکن نہیں جنّت کا بیاباں ہونا

چلے نہ کام بھرے خُم اگر نہ ساتھ چلیں
حرم کی راہ میں کوسوں کنؤاں نہیں ملتا

ہم سے مے نوش جو لب کھولتے واعظ کی طرح
صحنِ مسجد میں رواں چشمۂ کوثر ہوتا

دھونا ہو داغ جامۂ احرام صُبح صُبح
حُجرے سے شیخ پانی کی چھاگل اُٹھا تو لا

مُجکو بھی انتظار تھا ابر آئے تو پیوں
ساقی اگر یہ سچ ہو کہ بادل اُٹھا تو لا

مَیں کام لوں گا ابر کا ای رندِتان کر
تو مجُھ فقیرِ مست کا کمل اُٹھا تو لا

مُنھ پونچھ کے کہنا وہ مرا شیخِ حرم سے
ہاں نام سے زم زم کے زرا قبلہ دیں اور

پہنچے کعبے میں ہم شراب فروش   لے کے مشکیزہ بن کے آب فروش

یہ سُرخ سُرخ سی اک شی سیاہ بوتل میں
بغیرِ ابر بھی ہو سبزہ زار کے قابل

کیا کیا خوشامدیں ہیں کہ پی لوں بہار میں
بادل کے ٹکڑے سر پہ مرے چھلے جاتے ہیں

وہ شے آج واعظ کو ہم نے پلا کر
مٹائے خیالاتِ باطل ہزاروں

اُٹھے کبھی گھبرا کے تو مے خانے کو ہو آئے
پی آئے تو پھر بیٹھ رہے یادِ خدا میں

شورِ قلقل میں گُم آوازِ اذاں ہے اے شیخ
یہ بہت خوب کہی مے کدہ آباد نہیں

جی نہ مانا حضرتِ ناصح کو آتا دیکھ کر
کچھ یونہی تھوڑی سی پی لی دل لگی کے واسطے

نامِ توبہ لیتے ہی مجھ پر برس پڑتا ہے یہ
توبہ نشتر ہے رگ ابرِ کرم کے واسطے

آئے مے خانے میں جب مسجدِ جامع سے ریاضؔ
ساتھ ہی آپ کے قبلے سے گھٹا بھی آئی

یہ عالم ہے ریاضؔ اک ایک قطرے کو ترستا ہوں
حرم میں اب خدا جانے بھری بوتل کہاں رکھ دی

اتنی پی ہی کہ بعد توبہ بھی　　بے پیے بے خودی سی رہتی ہی

اچھی پی لی، خراب پی لی　　جیسی پائی شراب پی لی
عادت سی ہی نشہ ہو نہ اب کیف　　پانی نہ پیا شراب پی لی

تیسرے فاقے ہمیں دانۂ انگور ملے
ہم یہ سمجھے کہ بھرے ساغرِ بلّور ملے

نُدرتِ تشبیہ

رسائیِ فکر، بلندیِ خیال اور تیزیِ طبع! یہ تین عناصر ہیں جو شاعر کے کلام کو نادر تشبیہوں سے مزیّن کرتے ہیں۔ اس صنعتِ کلام کو وُہی شاعر نباہ سکتا ہی جو زبان و بیان پر غیر معمولی قُدرت رکھتا ہو، بات میں بات پیدا کر سکتا ہو۔

حضرت مرحوم کے کلام میں ایسے اشعار بڑی تعداد میں ملتے ہیں جو نُدرتِ خیال کا بہترین مُرقّع ہیں:۔

کیا تجھ سے ترے مست نے مانگا مِرے اللہ
ہر موجِ شراب اُٹھ کے بنی ہاتھ دُعا کا

مَیں تو سمجھا پنکھڑی ہی پھُول کی
کِس قدر ہلکا ترا خنجر پڑا

رات سے بن گئی دن رُخ سے اُلٹ دی جو نقاب
کھول دی زُلف جہاں ہو گئی بے رات کی رات

وہ تابشِ دُرِ دنداں وہ جنبشِ لبِ تر
رواں ہو کشتیِ مے کیسی آب گوہر پر

کتنی نازک ہیں چوڑیاں ان کی ایسی تو چینِ آستیں بھی نہیں

کچھ بھی چلے نہ کام بڑھاپے میں ای ریاضؔ
اُٹھ کر یہ موج مے جو ہمارا عصا نہ ہو

نازک کلائیوں میں حنا بستہ مُٹھیاں
شاخوں میں جیسے مُنھ بندھی کلیاں گلاب کی

میں رکھ لوں ریزۂ مینا کو دل میں ارے کس پھول کی یہ پنکھڑی ہو

اُڑتے ہوتے مے خانے چلے آتے ہیں رندو
اُٹھتی ہوتی ساون کی گھٹا اور ہی کچھ ہو

زمینِ مے کدہ عرشِ بریں معلوم ہوتی ہو یہ خشتِ خُم فرشتہ کی جبیں معلوم ہوتی ہو

سنوارے جائیں گے گیسو الٰہی بات بن جائے
دلِ صد چاک میرا ہی جو بن کر شانہ آتا ہی

قسمت مری اکس نور سے روشن ہو مری آنکھ
پُتلی نہیں یہ نقشِ کفِ پاے علیؓ ہی

کہکشاں کو ہی ناز یئں بھی ہوں   کسی مہوش کی خندہ پیشانی

طنزیات!

طنز ـــــ لطیف طنز ـــــ ادب کی جان ہی۔ ریاضؔ کی شاعری کا یہ بھی ایک اہم عنوان ہی:-

ارمان عدو کا تجھے ہوتے ہوئے میرے
ہوتے ہوئے تیرے مجھے ارمان قضا کا

وہ کیوں ٹھہرتے نزع میں بالینِ غیر پر
کوئی معاملہ یہ گھڑی دو گھڑی کا تھا

مری خوشی کی انھیں کس لیے خوشی ہوگی
مِرے ملال کا ان کو ملال کیا ہوگا

دیکھیے گا سنبھل کے آئینہ   سامنا آج ہی مقابل کا

مجھ سے بڑھا ہو مرے قاصد کا شوق نامہ ملا اور ہَوا ہو گیا

بزمِ ساقی میں مرے واسطے مَے تھی اے شیخ
کیا ترے واسطے افشردۂ انگور نہ تھا؟

کچھ حشر لحد پر ابھی برپا نہیں ہوتا
آتے ہو تو ٹھیرو کوئی زندہ نہیں ہوتا

مے خانے میں کیوں یادِ خدا ہوتی ہے اکثر
مسجد میں تو ذکرِ مے و مینا نہیں ہوتا

آنکھ کوثر پر دکھائی شیخ نے کچھ اس طرح
واسطہ رکھتے ہیں گویا ساقیِ کوثر سے آپ

حضرتِ واعظ پسینے میں ہیں تر اس رنگ سے
ڈوب کر نکلے ہیں گویا چشمۂ کوثر سے آپ

جو اُٹھ نہیں سکتے تھے گئے اُٹھ کے لحد میں
بیٹھے رہیں اب گھر میں لیے عذرِ حنا آپ

کہیں ایسا نہ ہو آجائے ترس آپ کو کچھ
آپ سُنیے نہ کسی موردِ آفات کی بات

دمِ وعظ کیسے مزے میں ہیں واعظ
بھرے جام کوثر کے چھلکا رہے ہیں

میرے گھر سے ای شبِ غم تو کہاں
لے کے صورت کالی کالی جائے گی

کیوں معتبر ریاضؔ کو سمجھیں نہ مے فروش
ریشِ دراز و جبہ و دستار دیکھیے

مر کے ہم دادِ وفا دیں تو بھی کچھ پرسش نہیں
یونہی سی ہی حسن کی سرکار کچھ یونہی سی ہی

حقائق ومعارف!

حکیمانہ رنگ میں حقائق ومعارف کی گتھیاں بھی ریاضؔ نے سُلجھائی ہیں، انداز اتنا دل نشیں کہ ہر لفظ اثر بن کر دل میں اُترے، اسلوب اتنا دل کش کہ حقائق عامۃ الورود واقعات معلوم ہوں۔ حقیقت اتنی صاف اور واضح کہ ریب وشک کی گنجائش ہی باقی نہ رہنے پائے:۔

یہی گلشن کی ہوا ہی یہی گلشن کی بہار
کبھی صیاد کبھی ناوکِ صیاد آیا

وہ کون ہی دُنیا میں جسے غم نہیں ہوتا
کس گھر میں خوشی ہوتی ہی ماتم نہیں ہوتا

آزارِ محبت نہیں جاتا نہیں جاتا بیمار محبت کبھی اچھا نہیں ہوتا

اللہ دکھائے نہ بُرا وقت کسی کو کوئی بھی زمانے میں کسی کا نہیں ہوتا

صبحِ پیریِ آنکھ اپنی جب کھُلی تو یوں کھُلی
جیسے کوئی چونک اُٹھے خوابِ پریشاں دیکھ کر

اتنے جھگڑے زندگانی کے لیے زندگانی کا ٹھکانا کچھُ نہیں

رنج کی کٹتی نہیں ہی ایک رات دن گزر جاتے ہیں تنو آرام کے

ناپایدار زندگیِ مُستعار ہی آئے نہ آئے سانس کا کیا اعتبار ہی

جو نہ چھوٹے ہاتھ سے دامن وہ ہو
جو نہ ٹوٹے وہ سہارا چاہیے

سچ یہ ہی کہ زندگانی ہو یا موت ہر چیز بُری ہی مفلسی کی

موت سے بدتر بڑھاپا آئے گا   جان سے پیاری جوانی جائے گی

جس سے ملیے ظاہر و باطن میں فرق   اس زمانے میں کوئی کس سے ملے

بگڑ کر کوئی بنتا ہے کوئی بن کر بگڑتا ہے
یہی دُنیا کا نقشہ ہے اسی کا نام دنیا ہے

زمانے میں بہت اللہ کے بندے ہیں ایسے بھی
کہ جن کے پانو پر تاج سرِ فغفور رہتا ہے

تھے ریاض اس فکر میں یہ بُت انھی کے ہو رہیں
مردِ حق آگاہ بھی کس سعیِ باطل میں رہے

دل پر نقش مہر و وفا دو دن کی تو بات نہیں
کوئی بھی ہو دل میں جگہ ہوتے ہوتے ہوتی ہے

زبان زدِ عام

ریاض کے دیوان میں ایسے اشعار بھی اچھی تعداد میں موجود ہیں جو قبولِ عام کی سند حاصل کر چکے ہیں اور عام طور پر زبانوں پر چڑھے ہوئے ہیں:-

میرے گھر مثلِ تبرک کے یہ ساماں نکلا   آستیں قیس کی فرہاد کا داماں نکلا

دیکھ کر ہنستے ہو تم کیا صورتِ پاکِ ریاضؔ
یہ بڑے پہنچے ہوئے اللہ والے لوگ ہیں

بڑے نیک طینت بڑے صاف باطن
ریاضؔ آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں

کمر سیدھی کرتے ذرا میکدے میں
عصا ٹیکتے کیا ریاضؔ آ رہے ہیں

لکھا کس حُسن سے خط میں کہ ہم تجھ سے کشیدہ ہیں
کششِ حرفوں کی ایسی ہے کہ ہم بھی صاد کرتے ہیں

گلا بیٹھا ہوا خدمت اذاں کی، وہ بھی کعبے میں
بھلے کو ہم دبا لائے تھے ناقوسِ برہمن کو

مری شراب کی کیا قدر جانے تو واعظ
جسے میں پی کے دُعا دوں وہ جنتی ہو جائے

چھانٹا وہ دل کہ جس کی ازل میں نمود تھی
پسلی پھڑک اُٹھی نگہِ انتخاب کی

جہاں ہم خشتِ خُم رکھ دیں بنائے کعبہ پڑتی ہی
جہاں ساغر پٹک دیں چشمۂ زم زم نکلتا ہی

حسینوں کا عالم نیا ہو رہا ہی کہ جس بُت کو دیکھو خُدا ہو رہا ہی

دلِ بیمار کا سنبھلنا کیا دیکھ لو پیار کی نگاہوں سے

صد سالہ دوْر چرخ تھا ساغر کا ایک دوْر
نکلے جو مے کدے سے تو دُنیا بدل گئی

روزمرّہ

وہی اشعار قبول عام اور بقائے دوام کا خلعت حاصل کرتے ہیں جو عام فہم ہوں، صاف اور رواں ہوں سادہ ترکیب، آسان الفاظ اور سبک نشست، الفاظ اس فن کا معیار ہی۔ گنجلک ترکیبیں، پیچیدہ اسلوب بیان، بڑے بڑے اور ناقابلِ فہم الفاظ خواہ غیر معمولی قابلیت کا ثبوت ہوں، مفہوم ومعنی کے اعتبار سے وہ کتنے ہی بلند ہوں لیکن قبولِ عام اور بقائے دوام کے دربار میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں ہی۔

گھر کی زبان —— دہلی اور لکھنؤ کے شریف گھرانوں کی زبان —— استعمال کرنے میں ریاضؔ کو خاص ملکہ حاصل ہی۔ معلوم ہوتا ہی زبان ان کی کنیز، بیان ان کا بندۂ بے دام،

سادگی اور بے تکلفی ان کا شعار خاص ہو:-

روگ تھا آزار تھا اچھا ہوا جاتا رہا

ایسے دل کا رنج کیا، جاتا رہا جاتا رہا

نہ آیا ہمیں عشق کرنا نہ آیا مرے عمر بھر اور مرنا نہ آیا

نمک داں کیے تم نے گو لاکھ خالی نمک تم کو زخموں میں بھرنا نہ آیا

تری تیغ کیا کیا نہاتی لہو میں تری طرح لیکن نکھرنا نہ آیا

کچھ عجب لطف سے مل جل کے رہا ایک سے ایک

غم ترا جان مری رنج ترا دل میرا

اُٹھنے کا اب تو نام بھی لیتا نہیں ہو درد

پہلو میں ہم نے آج یہ کس کو بٹھا لیا

اُتری وہ چینِ جبیں موجِ تبسم بن کر

دیکھو دیکھو وہ ہنسی آتی وہ غصہ اُترا

کھلتا نہیں ہو کچھ مرے دشمن نے کیا کہا

دشمن کی سُن کے اس بتِ پُر فن نے کیا کہا

کیا دی دعا "تجھے آنا ہو پھر نصیب!"

غربت میں مجھ کو لوٹ کے رہزن نے کیا کہا

سنبل نے لیں بلائیں جو دیکھی تمھاری زُلف
دیکھی مِسی جو لب کی تو سوسن نے کیا کہا

وہ کش مکش، وہ بھیڑ، وہ آفت کی دار و گیر
ملنے کا ان سے حشر میں موقع کہاں ملا

اُتاروں حلق سے دو چار شہد و شیر کے گھونٹ
کہے جو شیخ یہ کیا ہی، کہوں جناب شراب

مَیں نے چھیڑا تو کس ادا سے کہا
کُچھ سُنو گے مری زباں سے آج

کوئی مُنھ چوم لے گا اِس نہیں پر
شِکن رہ جائے گی یوں ہی جبیں پر

یوں بھی ہو شغل ہی کہ پییں ہم پلاؤ تُم
یوں بھی ہو شغل ہی کہ پیو تم پلائیں ہم

صورت ایسی کہ دیکھتا ہی رہے   باتیں ایسی سُنا کرے کوئی

مرگیا غیر، مرے سر کی قسم سچ کہیے   ہاں مرے سر کی قسم آپ تو کھاتے ہی نہیں

شیخ صاحب گیا چُرا کر لے چلے رؤمال میں
کچُھ نہ کچُھ حصّہ رہے یاروں کا بھی اس مال میں

آپ کی شکل بھلی آپ کی صوُرت اچھی
آپ کے طور بُرے آپ سے نفرت اچھی

چلی ہو تیغ تو کس ناز سے رُک رُک کے، تھم تھم کے
یہ کچُھ ان سے زیادہ نازنیں معلوم ہوتی ہے

موقع ہو تو مزے کی ہے رندانہ یہ ادا
اے بادہ نوش بانارہ کے چُلّو کبھی کبھی

آپ بیتی!

ذاتی تاثّرات وواقعات کی جھلک بھی نمایاں طور پر ریاضؔ کی شاعری میں نظر آتی ہے۔

اپنی پہلی اہلیہ کے حادثۂ وفات پر کہتے ہیں:۔

دیکھیے جاتے ہیں کب تک گور کے دامن میں ہم
آنکھ کی پُتلی رکھ آتے دیدۂ مدفن میں ہم
حُسن صوُرت حُسنِ سیرت کو ملا کر خاک میں
بہرِ تسکیں خاکِ تُربت لاتے ہیں دامن میں ہم
نرم ونازک خندۂ گل سے تری آواز تھی ڈھونڈتے ہیں نغمہ ہائے بلبلِ گلشن میں ہم

سایۂ خاتونِ جنت میں رہے ان کی کنیز
جان دے کر جائیں گے اب خلد کے گلشن میں ہم
نور بن کر چشمِ تربت میں رہے وہ اور ریاضؔ
داغ بن کر اب رہیں گے لالۂ گلشن میں ہم

اہلیۂ ثانی کی وفات ریاضؔ کے لیے پہلے سے بھی زیادہ اندوہ ناک سانحہ تھا، کہتے ہیں:۔

ملی مٹی میں اور اک چاند سی صورت
بڑا پہلے سے بھی یہ دوسرا داغ
یہ کس کی موت مجھ سے کہہ رہی ہے
نہ دے ایسا کسی کو بھی خدا داغ
بظاہر کچھ نہیں واقع میں یہ ہے
مٹے ہم، مٹ گیا دل، مٹ گیا داغ
انھیں غم نے، انھیں کھایا اجل نے
ریاضؔ اب ہیں، نہ اب ہیں میرزا داغؔ

اسے بھی تعلّی نہ سمجھیے:۔

رہا نہ کوئی بھی یارانِ رِندمشرب میں
بس اک ریاضِ تہجد گزار باقی ہے

کلامِ ریاضؔ کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جسے واردات سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اسے بھی "آپ بیتی" کا ضمیمہ سمجھیے:۔

عشق میں خوب دن گزرتے ہیں
روز جیتے ہیں روز مرتے ہیں

اب ٹھکانا مرا کہیں بھی نہیں چین مر کر تہِ زمیں بھی نہیں

مجکو دیکھا تو ہنس کے کہتے ہیں
اشک اب بے سبب بھی بہتے ہیں

حسیں دل کو تاراج کرتے رہے ہمیشہ اُجڑتی یہ بستی رہی

حضرتِ ناصح جوانی میں مجھے رکھیے معاف
پیر و مُرشد توبہ کرنے کا زمانہ اور ہے

جوانی ہے ارغوانی سے اچھّی مَے ارغوانی جوانی سے اچھّی

ہم جہاں ان کو ملے روتے ملے وہ جہاں ہم کو ملے ہنستے ملے

رُباعیّات

اس صنفِ کلام کی طرف ریاضؔ نے بہت کم توجہ کی، لیکن اگر کبھی ادھر متوجّہ ہوئے تو خوب خوب گُل کاریاں کیں، جو تاریخِ ادب میں نقشِ دوام بن کر باقی رہیں گی۔

سرسیّد کے متعلق کہتے ہیں:-

قدموں سے لگا ہوا ہے زرِ سیّد کے
سرخاب کا کیا لگا ہے پرِ سیّد کے

کیوں کر نہ بڑھے دماغ سرسیّد کا
اک اور لگا ہوا ہو سرسیّد کے

شباب کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:-

دینے کے لیے داغ شباب آتا ہو
ساتھ ابر لیے، یہ آفتاب آتا ہو
گھوڑے کے ہوا سے یہ اُترتا ہی نہیں
جانے کے لیے پا بہ رکاب آتا ہو

رُوداد پیری سُنیے:-

طفلی بھی شباب بھی تھا ایک دم کے لیے
پھل پھول تھے سب خزاں کے عالم کے لیے
پیری میں نہیں ریاضؔ یہ رعشۂ دست
ملتے ہیں اب ہاتھ اپنے ماتم کے لیے

قطعاتِ تاریخ و قصائد!

رُباعی کے لیے شرط ہو کہ مصرعۂ آخر جانِ معنی ہو، قصائد کے لیے شرط ہو مفہوم بلند اور الفاظ پُرزور ہوں، قطعاتِ تاریخ کے لیے شرط ہو کہ مصرعۂ تاریخ برجستہ اور بے تکلف ہو، رُباعیات کا نمونہ آپ ملاحظہ فرما چکے، اب ایک سرسری نظر ریاضؔ کے قطعاتِ تاریخ اور قصائد پر ڈال لیجیے، آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ قصائد اپنے شکوہِ معنی اور شوکتِ الفاظ کے اعتبار سے کس درجہ پُرزور ہیں اور قطعاتِ تاریخ میں برجستگی اور بے تکلفی کس

درجہ عیاں ہے۔

موجودہ نواب صاحب بھوپال کی مدح میں گویا ہوتے ہیں:-

بزم میں موجِ تبسم جام مے کی موج ہے
رزم میں بہرِ عدو چینِ جبیں نوکِ سناں

بزم میں مے کا چھلکتا جام اس کی چشمِ مست
رزم میں بہر عدو ابرو کے بل تیر و کماں

بزم میں تیغ کمر گویا ادائے حسنِ وضع
رزم میں تیغ کمر پر برقِ خاطف کا گماں

ہاں ہزیمت خوردۂ جنگاہ ہے
پیلِ گردوں کا شکستہ دانت ہے یہ کہکشاں

سالِ نو آیا ہے لے کر سی۔ اس۔ آئی کا خطاب
ہو مبارک آپ کو حاجی حمید اللہ خاں

قاضی خلیل الدین صاحب مرحوم وزیرِ اعظم ریاست پنّا کی اہلیہ محترمہ کی تاریخِ وفات نکالی ہے:-

اس سے بہتر اور ہو سکتا نہیں سالِ وفات
گُل ہوئی بادِ اجل سے شمعِ ایوانِ خلیل

۱۳۳۰ ھ

اپنی پہلی اہلیہ کی تاریخِ وفات کہی:-

زوجۂ مرحومۂ ریاضؔ

۱۳۳۱ ھ

اپنے ایک عزیز دوست افراغ صاحب گورکھپوری کی

تاریخِ وفات نکالی:۔

ارماں ہو نیند آتے اسی طرح ہمیں بھی
یوں چین سے سوتے ہیں وہ جنت کی ہوا میں

۱۳ ھ ۴۶

سر سلیمان مرحوم کے والد مولوی محمد عثمان کی تاریخِ وفات:۔
بولی بو گل سے نکل کر یہ سال
گئے جنت میں محمد عثمان

۱۳ ھ ۸۳

اپنی دوسری بیوی کی تاریخ کہی ہے:۔
جان ریاضؔ مُرد

۱۲ ھ ۹۴

ایک دوست کا دیوان شائع ہوا، تاریخ کہی:۔
چُبھتا ہوا پیکاں ہے چبھتا ہوا نشتر بھی

۱۹ ء ۱۱

ریاضؔ کا دیوان گُل ہائے رنگ رنگ کا مجموعہ ہے۔ بحرِ ناپیدا کنار کے چند قطرے اگر سمندر کی وسعت کے ترجمان ہو سکتے ہیں تو یہ چند اشعار جو تبصرہ نگار نے درج کیے ہیں کلامِ ریاضؔ کے تعارف کے لیے کافی ہیں ورنہ انتخاب کرنے بیٹھیے تو

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست!

تمت الکتاب

حیاتِ جاوید

مولانا حالیؔ مرحوم نے اپنی اس قابلِ قدر تصنیف میں سر سید احمد خاں مرحوم کے حالات نہایت شرح و بسط سے لکھے ہیں۔ زبان اور مضمون کے لحاظ سے یہ کتاب اُردوٗ زبان کی بے نظیر تصنیف ہی۔ قیمت مجلّد پانچ رُپے چھو آنے (۵؍۶) بلا جلد پانچ رُپے (۵)

اُمراے ہنود

مرتبہ مولوی محمد سعید احمد صاحب مارہروی۔ اس میں پان سو سے زیادہ اُن ہندوٗ امرا کے حالات درج ہیں جو شاہانِ مغلیہ کے زمانے میں بڑے بڑے مناصب اور عہدوں پر ممتاز و سرفراز تھے۔ قیمت مجلّد تین رُپے آٹھ آنے (۳؍۸) بلا جلد تین رُپے (۳)

ذکرِ میرؔ

اُردوٗ کے خُدائے سخن حضرت میرؔ کی یہ نادرۂ روزگار سوانح عمری جو اُنھی کے پُرسوز و گُداز قلم کی تراوش ہی، جس میں اُنھوں نے اپنی حالاتِ زندگی کی تصویر نہایت دل کش انداز سے کھینچی ہی۔ شروع میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کا مقدمہ قابلِ دید ہی۔ قیمت مجلّد دو رُپے (۲) بلا جلد ایک رُپیہ آٹھ آنے (۱؍۸)